مجالسِ زیدی

مجموعۂ تقاریر

مولانا اظہر حسن زیدی اعلی اللہ مقامہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب	:	مجموعۂ مجالس
تقاریر	:	مولانا سید اظہر حسن زیدی مرحوم
مرتب	:	ملک صفدر حسن ڈوگر
پیش کش	:	علامہ ریاض حسین جعفری فاضلِ قم
پروف ریڈنگ	:	ملک ابرار حسین میثم حیدری، محمد عمران حیدر چودھری
فنی تعاون	:	زہراء بتول جعفری، محدثہ بتول جعفری
اشاعت	:	اگست 2010ء
ہدیہ	:	175 روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ منہاج الصالحین لاہور

الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ فرسٹ فلور

دکان 20 اُردو بازار لاہور

فہرست

مضامین	صفحہ
پیش لفظ	4
انتساب	7
کچھ اس کتاب کے بارے میں	9
منفرد خطیب	11
داستانِ کربلا کے مصور	14
خطیب	16
شخصیت	18
خطیبِ آلِ محمد	23
خطیب اور فنِ خطابت	26
رہِ سخن میں چراغِ آخر	30
زیدی تر افراق ابد تک رلائے گا!	35
دودیدہ ور	43
خلق عظیم	60
ظہورِ حضرت قائم آلِ محمدؐ	67
عظمتِ حسین علیہ السلام	72
حسینیت	77
حسینؑ کا تعارف	88
ورودِ کربلا	84
قلم	106
ذکرِ علی علیہ السلام	117
موت وحیات	126
موت وحیات	133
انسانیت	142
انسان اور انسانیت	157
اضافۂ شکریہ	169
شہادت	191
باب الحوائج	194
ہجرت رسولؐ	206
آلِ ابی طالبؑ	218
شامِ غریباں	242
محسن بیٹے! تم زندہ رہو	259

پیش لفظ

خطیبِ آلِ محمدؐ علامہ الحاج سید اظہر حسن زیدی سے میرا تعلق ۱۹۶۴ء سے ان کے انتقال تک رہا۔ وہ اکثر اتو کے اعوان باٹا پور لاہور میں میرے غریب خانہ کو شرف بخشے۔ وہاں کی مجالس میں تشریف لائے۔

بہت کم لوگ اتنے سیر چشم ہوتے ہیں۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکوہ نہ شکایت۔ ان کے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا۔ میں نے سید محسن نقوی شہید سے کہا کہ زیدی صاحب قبلہ کا تفصیلی انٹرویو کریں۔ ہم نے تفصیلاً ان کے حالاتِ زندگی پہ گفتگو کی جو اس کتاب میں شامل ہے۔

بدیہہ گوئی ان کا معمول تھا۔ ذو معنی جملے ان کی فطرت میں رچ چکے تھے۔ یونیورسٹی کیمپس لاہور میں ریاضی کے طلبہ نے انہیں خطاب کے لیے بلایا۔ مخلوط سامعین تھے۔ اور پھر طلبہ کو خاموشی کی تلقین، یہ مشکل مرحلہ تھا۔

پہلا جملہ فرمانے لگے: عزیزانِ گرامی! میری عرض میں طول نہیں ہوگا۔ پہلے سناٹا چھا گیا پھر داد کا شور۔ پوچھنے لگے: آپ کیا پڑھتے ہیں؟ طلبہ نے کہا کہ علمِ ریاضی۔ حساب بھی کہتے ہیں۔ فرمانے لگے: مجھے بھی آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔ غور سے سنیں بلکہ لکھ کر حل کریں۔

سوال یہ ہے کہ میرے علم میں ایک الٰہی انسان کی ''ضرب'' ہے کائنات کی بندگی پہ تقسیم کر کے بتائیں کہ کیا بچتا ہے؟..... طلبہ جھوم جھوم جا رہے تھے۔

بات سے بات نکالنے میں اتنے ماہر تھے کہ سامعین دنگ رہ جاتے تھے وہ کینٹ

خطاب کے لیے آئے تو ان سے ایک ''بنارس'' نامی شخص ملنے آیا۔

جو بس میں خطاب کے دوران فرمانے لگے: صاحبان! میں گفتگو تو کر رہا ہوں ''واہ'' میں مگر بات ''بنارس'' تک جائے گی۔

زیدی صاحب قبلہ کے بارے علامہ طالب جوہری نے ان کے چہلم پر خراج کے طور پر ایک جملہ فرمایا تھا جس میں انکا مکمل تعارف موجودہ ے انہوں ن ے ک ہا:

''زیدی صاحب قبلہ اپنے اُسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔''

راقم الحروف کی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا نام محسن نقوی شہید نے ''حروفِ معلیٰ'' رکھا۔ اس کے بعد مولانا ملازم حسین اصغر مرحوم کے سرگودھا سے شائع کیا۔ پھر لاہور سے تین ایڈیشن مختلف حضرات نے شائع کیے۔ مولانا ذوالفقار جندی نے اسے اچھے انداز میں شائع کی اور پھر لاہور ہی کے ایک ناشر جو علماء ہی کی صنف کہلاتے ہی۔ خضر عباس سید اور میری کتاب کو اُسی کتابت کے ساتھ شائع کر کے صرف معاشی ضرورت کے تحت انتہائی گھٹیا انداز میں شائع کیا۔ آخری ایڈیشن میرے اپنے ادارے ''شریکۃ الحسین پبلی کیشنز'' نے دیدہ زیب انداز میں شائع کیا۔

اب یہ کتاب علامہ ریاض حسین جعفری ادارہ ''منہاج الصالحین'' کے زیر اہتمام شائع کر رہے ہیں۔ وہ صرف ایک شخص نہیں بلکہ اس شعبے میں مکمل ادارہ ہیں۔ ان کا نام خوبصورت اشاعت میں ایک معیار قرار پا چکا ہے۔

ان کے ہاں آپ کو جانا ہو تو صرف علمی گفتگو ہی ہوگی۔ کتب کے شائع کرنے میں ان کا انتخاب خصوصی ہوتا ہے۔ ہم ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان دونوں بڑے لوگوں کی بیماریاں مجھ جیسے انسان کو لاحق ہیں۔ علامہ جعفری صاحب کے حکم کے تحت صرف علامتی طور پر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی بطفیل محمدؐ و آلِ محمد صحت و سلامتی کے ساتھ علومِ اہل بیتؑ کی مسلسل اشاعت کی مزید توفیقات میں اضافہ فرماتے اور نظر بد سے محفوظ رکھے۔

وہ یقیناً اسے خوبصورت انداز میں شائع کریں گے۔ اس کے آئندہ ایڈیشن میں ''سلونی کے جھرنے'' زیدی صاحب قبلہ کے ذو معنی الفاظ اور چند ایسی تقاریر شامل ہوں گی جواب تک کسی نے شائع نہیں کیں۔

میں اس کتاب کی اشاعت کے لیے مسلسل باز پُرس کرنے والے سید امیر حسن ترمذی (اسلام آباد) کا ممنون ہوں جن سے اس کتاب کا نایاب نسخہ لے کر علامہ ریاض حسین جعفری کو دیا۔ اللہ تعالیٰ میرے محترم سید تبسم شاہ (ایڈیٹر نیوز مارٹ اسلام آباد) کو توفیق عطا کرے کہ ''حروفِ معلیٰ'' کا مقبوضہ نسخہ لوٹانے کی توفیق عطا کرے جس میں ''سلونی کے جھرنے'' کا باب موجود ہے۔

علامہ اعجاز حسین کاظمی اعلیٰ اللہ مقامہ کے بعد سید امیر حسن ترمذی جواب تک ایک ہزار کے لگ بھگ عزاداروں کو زیارت مقدسہ پر اپنے اخراجات خود صَرف کر کے لے گئے ہیں۔ میں جب بھی اپنے آپ سے بھی تک جاتا ہوں اُنہی کے ہاں ہوتا ہوں۔

علامہ ریاض حسین جعفری جگ جگ جیو، خوش رہو اور اللہ تعالیٰ آپ کی یہ امانت اپنی اولاد کے سپرد کرنے کی توفیق عطا کرے۔"

آپ کا کام دیکھ کر رشک آتا ہے اور آپ کا یہ اشاعتی اہتمام دیکھ کر آپ کو دیکھنے کے لیے بھی آسمان تک سر کو اُٹھانا پڑتا ہے۔

آپ نے اتنی محنت کی کہ ایک مثال قرار پائے اور یہ بھی گذارش کر دوں کہ میری ہر کتاب کو شائع کرنے کی آپ کو اجازت ہے اور اس اجازت پر مجھے فخر ہے۔

شاعرِ آلِ عمران
صفدر حسین ڈوگر کربلائی
مسلم ٹاؤن، روالپنڈی
03-07-2010
فون:0333-5727200

انتساب

خطیبِ آلِ محمد مولانا الحاج سید اظہر حسن زیدی اعلیٰ اللہ مقامہ

کے جدامجد حضرت زید شہید

کے نام

جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ..... خطیبِ آلِ محمدؐ ..... اس مصلوب ماحول میں وقت گزار کر اپنے اباء واجداد کے جوار میں تشریف لے گئے۔

میں اس کتاب کا ثواب قبلہ زیدی صاحبؒ کے درجات کی بلندی کے لیے ان کی روح کی نذر کرتا ہوں

معزز قارئین!

کتاب کے مطالعہ سے قبل زیدی صاحبؒ کی روح کے لیے درود پاک تلاوت فرمائیں۔

پابند بیعت ابوذر

شاعر آل عمران

ملک صفدر حسین ڈوگر

مسلم ٹاؤن، راولپنڈی

۹ مارچ ۲۰۰۲ء

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اس کتاب کا مسودہ نامکمل طور پر تین مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ کچھ تقاریر ''حروفِ معلّٰی'' کے نام سے میرے اپنے ادارہ القائم رجسٹرڈ پاکستان کی طرف سے شائع ہوئیں۔ پھر مجموعہ تقاریر کے نام سے سرگودھا سے مولانا ملازم حسین اصغر مرحوم و مغفور نے اسے شائع کیا..... پھر لاہور سے اسی نام سے مولانا ملک ذوالفقار علی نے شائع کیا۔ یہ ساری اشاعتیں ممکن تھیں۔ ادھر میری مسلسل خانہ بدوشی اور نقل مکانی نے مسودہ گم کر دیا۔ اب بڑے تردد سے اسے ڈھونڈھا اور ایک مکمل کتاب کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ نامکمل کتب میں مولانا سید اظہر حسن زیدیؒ کی تقاریر اَدھوری رہیں اور یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے آج تک کبھی کسی ناشر سے کسی بھی مسودے کی ایک پائی بھی عوضانے یا حق زحمت کے طور پر کبھی وصول نہیں کی۔ میں اسے توشہ آخر سمجھتا ہوں اور سمجھتا رہوں گا۔

میری زندگی کے بعد میری ہر کتاب کو شائع کرنے کا حق ہر مومن کو حاصل ہے، جنہوں نے مجھے قلم اور یہ صلاحیتیں عطا کی ہیں وہ مجھے بھرپور اجر سے نواز رہے ہیں اور آخرت میں بھی انہی کی طرف سے اَجر محفوظ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے اسلام آباد سے مجلس القائم اور کاروانِ کربلا کے سالار سید امیر حسن ترمذی کا تردد شامل ہے۔ وہ میری گوناگوں مصروفیات سے آگاہ ہیں اور انہی کی مسلسل باز پرس اور خانوادہ تطہیر کی خصوصی نوازشات سے یہ کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ ان کا اشاعت کے سلسلے میں بھی تعاون رہا۔ ان کے علاوہ اسلام آباد ہی سے سید اشتیاق علی رضوی نے تعاون فرمایا۔ ہر دو حضرات کی توفیقات میں مولاؑ اضافہ فرمائیں۔

حضرت زیدی صاحب قبلہ کی مزید تقاریر بھی میں نے اپنے ذاتی کوششوں سے حاصل کر رکھی ہیں جو جلد ہی آپ کی نذر کی جائیں گی۔

حضرت خطیب آل محمد کی ذات اور شخصیت کے بارے میں لکھنا ایک بہت بڑا مرحلہ ہے جس کے لیے انتہائی مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ان کی گفتگو ،انٹرویوز اور مجالس کے کیسٹ آج بھی محفوظ ہیں۔ زندگی نے مہلت دی تو سب کچھ طبع کرنے کا ارادہ ہے۔ جس انداز میں وہ زندگی گزار کے چل بسے یہ ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ میں اکثر انتہائی اضطراب اور کسمپرسی کے عالم میں انہی کے کردار کو ذہن میں رکھ کر حوصلہ نہیں ہارتا۔ وہ انسان تحمل اور بردباری کا پہاڑ تھا۔ لاہور ہی سے میرے دیرینہ کرم فرما الحاج صفدر علی رانا ہم سب میں سے ان کے زیادہ قریب رہے اور وہ ان کے کرب کے شاہد ہیں۔ ان کے تعاون سے بھی بہت کچھ لکھنے کا ارادہ ہے۔

زیدی صاحب قبلہ زمانے کی بے نیازی پر مقام شکر بجالانے کے عادی تھے۔ نہ گلہ نہ شکوہ نہ شکایت، وہ صبر شکر کرنے والوں میں سے تھے۔ وہ اپنے خاندان کی تطہیر کے افراد کی طرح تنہا تھے اور اس تنہائی کو خود ہی عزت بخش کر مطمئن تھے۔ کافی حد تک ''دودیدہ ور'' میں انہوں نے حماد اہل بیتؑ سید محسن نقوی شہید کو دیئے گئے۔ انٹرویو میں اپنے بارے میں پہلی اور آخری بار بتایا۔ وہ انٹرویو اس کتاب میں شامل ہے آپ ان کے مزاج کے سکون اور اطمینان کو اس انٹرویو میں محسوس کریں گے۔

آئندہ کسی کتاب میں ایک مستقل باب دے کر اسے لکھوں گا۔ ان شاء اللہ

شاعر آل عمران

ملک صفدر حسین ڈوگر

مسلم ٹاؤن، راولپنڈی

۹ مارچ ۲۰۰۲ء

منفرد خطیب

لاہور کے روزمرہ اور شہر کے مذہبی اجتماعی حلقوں میں ''زیدی صاحب'' سے مولانا اظہر حسن صاحب ہی مراد لیے جاتے ہیں۔ یہ کمالِ محبت کی دلیل شہرت کا ثبوت ہے۔ نصف صدی سے وہ پنجاب میں دین کی خدمت کر رہے ہیں اور متحدہ ہندوستان کے ان صاحبان منبر میں شمار ہوتے ہیں جن کی تقریر ہمیشہ لاجواب مانی جاتی ہے۔ پاکستان میں وہ طرز خاص کے موجد اور نفیس ترین انداز کے خطیب ہیں۔ ان کا لہجہ، ان کی آواز، ان کا تخاطب، ان کی زبان کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ وہ اسٹیج پر لفظوں سے جادو کرتے ہیں۔ وہ منبر پر فقروں سے گلدستے پیش کرتے ہیں۔ وہ سبک روی میں گل پاشی اور ٹھہر ٹھہر کر عطر و گلاب کی بارش کرتے ہیں۔ زبان پر انہیں وہ قدرت ہے کہ بڑے بڑے اَدیب دنگ رہ جاتے ہیں۔

بات سے بات نکالتے ہیں تو صاحبان ذوق پھڑک جاتے ہیں اور فقرے پر فقرے کہتے ہیں تو سونے والے جاگ جاتے ہیں۔ مجمع کیسا ہی ہو وہ سننے والوں کو اپنے ساتھ کر لیتے ہیں۔ جوش کو ٹھنڈا کرنا، جمود کو توڑنا، خاموشی کو درود و سلام، داد و نعرے میں بدلنا اور نعروں کو آہوں میں ڈھالنا سب نے دیکھا ہے ان کے یہ کمالاتِ فن۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ کوئی دوسرا خطیب و ادیب، مقرر و ذاکر محنت کوشش کے باوجود اس سادگی سے اس مشکل سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

بلبل بوستان آلِ عبا، شیریں بیاں، سادہ زبان اور رسیلی آواز سے جب گفتگو کرتے ہیں تو دوستوں کا کیا ذکر دشمن بھی گوش برآواز ہو جاتے ہیں۔ جب وہ نکتے، فضائل کے رستے مطالب کے گوشے نکالتے اور مجمع کو لطیف ترین پیرایے میں بات

سمجھاتے ہیں تو جاہل و عالم، زیرک و نکتہ شناس، دانا اور نادان سب کو لطف آتا ہے۔ سب داد دیتے ہیں۔ سب اپنے اپنے ذوق اور رسائی کے مطابق ان کی بات سمجھ جاتے ہیں۔ جیسے غالبؔ کا شعر یا انیسؔ کی بیت ہو۔

خطیبِ آلِ محمدؐ اُردو میں خطبہ پڑھتے ہیں۔ آیت کے ترجمے سے کلام کا آغاز کرتے ہیں۔ اَجنبی محسوس کرتا ہے کہ مولانا عربی نہیں جانتے۔ آہستہ آہستہ جب وہ تفسیر و کلام، مناظرہ و تاریخ کی مشکلات سے گذرنا شروع کرتے ہیں تو بڑے بڑے عالم حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ شخص کس قدر صاحبِ نظر، وسیع المطالعہ اور عالم و قابل ہے۔ انہوں نے شروع شروع میں مدرسہ میں پڑھا ہے اور بنیادی علومِ اِسلامیہ سمجھ کر نکلے۔ حافظہ بلا کا ہے اور اب تک مسائل یاد ہیں۔ لیکن افتادِ طبع کے ہاتھوں اِظہار و مبالغہ سے بچے اور مولانا اظہر حسن صاحب قبلہ سے زیدی صاحب بننے کو ترجیح دی۔ خوش باشی اور بے تکلفی نے انہیں ہر ایک گروہ میں داخل کر دیا۔ ہر طبقے کے افراد انہیں اپنا سمجھتے ہیں اور وہ بھی سب کو اپنا جانتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کی شہرت میں محبوبیت اور ان کی محبوبیت میں شہرت کی آمیزش ہے۔

جناب مولانا اظہر حسن زیدی صاحب ایک خوش حال زمیندار باعزت خاندان سادات کے فرزند ہیں۔ ان کے مزاج میں بے نیازی، ان کے طور طریقوں میں خودداری، ان کے لباس میں نفاست، ان کی معاشرت میں خوش باشی اور ان کے اخلاق میں دل کشی ہے۔ وہ ایک مدت دراز سے مریض ہیں مگر مرض ان کی شگفتگی اور مسکراہٹ کو ختم کرنے سے عاجز آ چکا ہے۔ انہیں ایک حکمران نے کچل دینے کی تدبیر کی۔ جیسے کسی زمانے میں خانخاناں کو ہاتھی کے پیروں تلے ڈلوانے کی سعی کی جاتی تھی۔ آمرانہ نظام اور دین دشمن حکمران کے دور میں علماء نے کہا کہ چاند نہیں ہوا کل عید نہیں ہے اور وقت کے فرماں رواں کے ماتھے پر شکن آ گئی۔ مولانا اظہر حسن زیدی صاحب ظلم کی ٹکر سے چور چور ہو گئے مگر دشمن انہیں مار نہ سکا۔ وہ زندہ ہیں۔ اور زندگی سے برسرِ پیکار ہیں۔

وہ دشمن پر اپنے طنز کے تیر و خنجر سے حملے کرتے ہیں اور دوستوں کو گل کے تحفے اور

بلبل کے چہچہے پیش کرتے رہتے ہیں۔ ایک مدت سے امراض اور ایکسیڈنٹ کی تکلیفوں نے نڈھال کر رکھا ہے۔ سننے کی قوت ختم ہے اور دیر تک بولنے کی عادت بھی نہیں رہی ہے۔ اس کے باوجود جب وہ بالائے منبر آتے اور تقریر شروع کرتے ہیں تو انداز سخن وہی، رنگ بیان وہی، تخاطب کی مقناطیسی کیفیت اور طبیعت کی نکتہ آفرینی وہی ہے۔

خوشی ہے کہ جناب مولانا الحاج سید اظہر حسن زیدی صاحب کی تقریریں ضبط تحریر میں آ چکی ہیں۔ ان کی محبت کے اسیر اور ان کے فن کے قدر دان احباب ان کی مجلسوں کو بڑے بڑے اہتمام سے چھاپ رہے ہیں اور اس قابلِ صد تحسین منصوبے اور عمل پر ان دوستوں کو آفرین دی جا رہی ہے۔ اس مجموعہ تقریر سے اہلِ علم و ادب کو مولانا زیدی صاحب کے فن اور ان کی شخصیت سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مولانا زیدی صاحب زندگی کا مقصد اشاعت فضائل و مصائب اہل بیتؑ بنا چکے ہیں۔ محمدؐ و آل محمدؐ کے پرستاروں نے ان مجلسوں کو فضا سے کتاب اور گوش سے گوش تک منتقل کرنے کا عمل انجام دے کر بڑی خدمتِ دین کی ہے۔

اللہ، جناب زیدی صاحب کو صحت، قوت و توفیق مزید عطا فرمائے اور حضور محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام سے ان کی حمایت دین کی سعی کو سند قبول عطا ہو۔ اور ناشرین کو علم و عمل میں تبلیغِ دین کی توفیق ملے۔

کربلا کے شہید اور امام حسینؑ، حضرت زینب سلام اللہ علیہا اور حضرت عباسؑ کے خدمت گذار اپنی اس کوشش کو بطور شرف و انجامِ فرض مؤمنین کی خدمت میں پیش کرتے اور بہترین دعاؤں کے متمنی ہیں۔

نیاز کیش

(مولانا) سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

۱۵۔ مغل پورہ۔ لاہور

داستانِ کربلا کے مصور

(آغا شورش کاشمیری)

سید اظہر حسن زیدی بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ خدا انہیں تادیر سلامت رکھے شاید اب وہ ذاکری کے چمنستان کا آخری بلبل ہیں۔ وہ الفاظ کی انگوٹھیوں میں مطالب کے نگینے جڑتے ہیں۔ اُن کا اسلوب ادیب کا، لہجہ ذاکر کا، اور اڑان شاعر کی ہے۔ شاعر ہوتے تو میر انیس ہوتے اور انیس خطیب ہوتا تو زیدی ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے جملے گویا سبدِ گفتار میں کلیاں رکھی ہیں۔

انہیں پہلی دفعہ استہالِ محرم کے جلسہ میں سنا تو عجیب عالم تھا۔ شیعہ بھائی تو اَشکبار تھے اور ان کی آہیں عرش کے دل میں کھب رہی تھیں لیکن حنفی العقیدہ بھی آنسوؤں کا جھالہ بنے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اظہر حسن زیدی نے ہمیں تاریخ کی سڑک پر ڈال دیا اور ہم یکا یک کربلا کے رِیگ زار میں پہنچ گئے ہیں اور کربلا نے اپنے لیل ونہار کی نقاب اُلٹ کر شہادت کے لمحوں میں پہنچا دیا ہے۔

وہ سامنے حسینؑ اور اُن کے خیمے ہیں

اِدھر فرات کی نہر اور اس پر عمرو بن سعد کی فوج کا پہرہ ہے۔ اُدھر باطل کا ہاتھ حق کے گریبان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ قاسمؑ وار سہہ رہا ہے۔ اصغرؑ کے ننھے گلے میں تیر پیوست ہیں۔ عباسؑ کا سینہ یزیدی قصابوں کا کندہ ہے۔

ایکا ایکی حسینؑ بڑھتے اور شقی القلب اُنہیں مجروح کر کے زمین پر گرا دیتے ہیں۔ اُن کی گردن کاٹ کے، نیزے کو سجاتے پھر جلوس بنا کر شام کی جانب روانہ ہوتے ہیں اور

وہ خاندانِ رسالت کی کونپلیں قیدی ہو کر بے کجاوہ اونٹوں پر جا رہی ہیں۔

اَظہر حسن زیدی اہلِ بیتؑ کے خطیب ہی نہیں، سانحہ کربلا کے مصور بھی ہیں۔ غالب خلدآشیانی نے اِنہیں سے متعلق کہا تھا ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

خطیب

(مولانا سید اظہر حسن زیدی)

جو مزہ محمد حسین آزاد کی تحریر میں ہے وہی ان کی تقریر میں ہے۔ الفاظ نہیں ہوتے شہد کے قطرے ٹپکاتے اور غنچے چٹخاتے ہیں۔ انہیں سن کر واہ واہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن معاً واہ واہ کا تصور غائب ہو جاتا ہے۔ اور زبان آہ آہ کرنے لگتی ہے۔ رلانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے پھر اپنے ہی دامن گفتار سے اشکبار چہروں کے آنسو پونچھتے اور انہیں قہقہوں کی چٹیک لگا دیتے ہیں۔ الفاظ ان کے ہاں اس طرح صناع ہیں چھوٹے چھوٹے فقرے جیسے بچوں کی معصوم مسکراہٹ ہو۔ ان فقروں میں برنائی اور رعنائی جیسے دو شیزاؤں کو شبِ عروسی کا سامنا ہو۔ تسلسل ایسا جیسے مروارید کی لڑیاں پرو دی گئی ہوں۔ ہر تقریر کہکشاں معلوم ہوتی ہے۔ الفاظ قوس وقزح، مطالب عقد ثریا سامعین کو سوچنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ جس تیزی سے خود بہتے ہیں اسی تیزی سے سامعین کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ وہ دماغوں کو پرشش سکھاتے ہیں۔ پرسش نہیں ان کے ہاں عقیدہ ہے اور اس عقیدہ ہی کے زور پر وہ دلوں کو شکار کرتے شہسوار کی طرح اڑے چلے جاتے ہیں۔

زبان ادیب کی، لہجہ خطیب کا اور اسلوب شاعر کا ہے۔ خطیب آلِ محمدؐ ان کا لقب ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ خطاب انہیں کس نے دیا؟ کب دیا؟ کہاں دیا؟ لیکن جس نے بھی انہیں یہ لقب یا خطاب دیا وہ حق بجانب تھا۔ اپنے کارواں کے وہ ایک ہی حدی خواں ہیں۔ جن کی آواز میں قرون اولیٰ کے حدی خوانوں کا ہمہمہ پایا جاتا ہے۔ ان کی زبان میں اثر بھی ہے اور گداز بھی۔ ان کی لے میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ ان کے زمزموں

میں عشق بھی ہے اور پرواز بھی اور بہ قول شخصے نیاز بھی ہے اور ناز بھی!

ان کی مجلس سن کر احساس ہوتا ہے کہ ہم تیرہ سو برس پیچھے لوٹ گئے ہیں۔ کربلا کے مسافروں کا قافلہ لشکر یزید کے نیزوں کی ''پذیرائی'' کو جا رہا ہے۔ اظہر حسن زیدی اس قافلہ کے حدی خواں ہیں۔ اور اپنی دلگداز لے میں آلاپ رہے ہیں۔

یہ قافلہ اہلِ بیتؑ کا ہے۔ اس قافلہ کے سردار حسینؑ ہیں۔ یہ قافلہ شہادت کی شاہراہ پر ہے۔ ان محملوں میں سیدانیاں بیٹھی ہیں۔ آفتاب نے سوئے ادب کے خوف سے نگاہیں نیچی کر رکھی ہیں۔ لیکن کوفیوں کے نیزے، فرات کے کنارے پر انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ آہ! جملہ کائنات سے زیادہ مقدس خون اور تمام صباؤں کا سرچشمہ خاندانِ نبوت میں اظہر حسن زیدی اس خاندان ہی کا حدی خواں ہیں!

جوانی میں بالا بلند تھے۔ اب کمر گردشِ ایام کے صدموں نے جھکا دی ہے۔ البتہ عمر نے رکاب دے کر تھام رکھا ہے۔ چہرہ پر جھریاں، آنکھوں میں شوخیاں، تمام چہرہ اُردو کے ابتدائی دور کی غزل۔ ناک اسی غزل کا مطلع ثانی، داڑھی کھچڑی، عمر اس کی سرحد پر جہاں نوجوانی صرف خلش کے طور پر رہ جاتی ہے۔ مزاج فقیرانہ، طبیعت شاعرانہ، ذوق عارفانہ، ساٹھ برس کے پیٹے میں ہوں گے لیکن ان کے لیے لیل و نہار کی یہ گردشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ خود لیل و نہار سے کھیلنے کے عادی ہیں۔ اقبالؒ کے اس شعر کی ہو بہو تصویر:

تیری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

آغا شورش کاشمیری

ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور

۸ نومبر ۱۹۶۵ء

شخصیت

انٹرویو: خالد اسحاق

لاہور کی ایک معمولی سرائے کا مسافر
اچانک مقبولِ عوام مقرر و خطیب بن گیا

میں اولادِ نرینہ کی نعمت سے آج تک محروم ہوں۔ گو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو دو نہایت فرمانبردار اور سعادت مند بیٹیاں عطا فرمائی ہیں لیکن لڑکا نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک اپنی زندگی میں کمی محسوس کرتا ہوں۔ اولادِ نرینہ کی تمنا اور خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں نے اپنے بھائی کے بچے کو متبنیٰ بنا لیا اور اس کی پرورش یوں کی جیسے وہ میری اولاد ہو۔ ۲۳ برس کی عمر میں اس لڑکے نے بی اے کا امتحان پاس کر لیا اور اس کو محکمہ کسٹم میں ایک معقول ملازمت مل گئی۔ لیکن ملازمت کے صرف ایک ہفتے کے بعد وہ اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا۔ یہ کہہ کر پاکستان کے مشہور خطیب آل محمدؐ مولانا سید اظہر حسن زیدی خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے پر شدتِ غم کے آثار نمایاں تھے۔

انہوں نے کہا بس اس کے بعد سے میری زندگی بے مزہ ہو گئی اور میں زندہ درگور ہو کر رہ گیا ہوں۔ یہ ایسا واقعہ ہے جس کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اور یہی واقعہ میری زندگی کا سب سے اہم ہے۔

میں ۱۹۱۲ء میں ضلع بجنور کے اک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم

قرآن شریف پڑھنے سے ہوئی۔ آٹھ سال کی عمر میں لکھنا پڑھنا اچھی طرح آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ میر انیس کا اور دبیر کے مرثیے کے پچاسوں بند زبانی یاد تھے!

جب میں کچھ لکھ پڑھ گیا تو اس وقت میری عمر صرف آٹھ برس کی تھی۔ میری غیر معمولی ذہانت اور پڑھنے لکھنے کا شوق دیکھتے ہوئے والد محترم نے مجھے اس زمانے کی زبردست عالم فاضل شخصیت علامہ سید سبط نبی صاحب کے سپرد کر دیا جو یوپی کے مشہور قصبے نوگاواں سادات میں رہتے تھے۔ میں دس سال تک علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہا اور دینی علوم پر جو کچھ حاصل کر سکتا تھا کر لیا۔ علامہ کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر تھی کہ میں اس کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ علامہ نے جس طرح میری تربیت کی یہ اس کا فیض ہے، جو میں کسی قابل ہوں میری تمام زندگی میں علامہ سبط نبی کی شخصیت کا بہت گہرا اثر تھا اور میں ان ہی سے متاثر ہوں۔

علامہ کے کہنے پر ہی میں نے لکھنؤ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے عربی اور فارسی کے تمام امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ ۱۹۱۳ء میں کسی کام سے لاہور آیا ہوا تھا۔ لاہور میں چونکہ اجنبی تھا اس لیے بہت پریشان تھا۔ زبان کی ناواقفیت بھی ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ دوست احباب بھی نہیں تھے۔ ان دنوں میں انارکلی کی ایک سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک دن میں یوں ہی چہل قدمی کے لیے نکل پڑا۔ راستے میں میری نظر ایک اشتہار پر پڑی جس میں لکھا تھا کہ امام بارگاہ خواجگان نارووالی میں معراج النبیؐ کے سلسلہ میں ایک جلسہ ہونے والا ہے۔ مقررین میں مولانا احمد علی کا نام سرفہرست تھا۔

میں بھی اس جلسہ میں پہنچ گیا۔ وہاں بہت سے مقررین تھے۔ جن کو پانچ پانچ منٹ تقریر کے لیے دیئے جا رہے تھے۔ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے منتظمین سے کہا کہ مجھے بھی پانچ منٹ بولنے کے لیے دیئے جائیں۔ یہ خیال مجھے اچانک آیا تھا۔ میں نے تقریر کے لیے تیاری وغیرہ بھی نہیں کی تھی۔ بہرحال منتظمین نے مجھے بھی پانچ منٹ کا

وقت دے دیا۔ زندگی میں پہلی بار ایک بھری مجلس میں تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ پانچ منٹ تک بڑے اعتماد سے تقریر کرتا رہا۔ جب میرا وقت ختم ہوا تو لوگوں نے زبردست اصرار کیا کہ ان کو اور وقت دیا جائے۔ غرض سامعین کے مسلسل اصرار پر مجھ کو پانچ منٹ کر کے پورے بیس منٹ تک تقریر کرنی پڑی۔ یہ تقریر میری پہلی مذہبی تقریر تھی جس کو سامعین نے بہت پسند کیا۔ جلسہ کے بعد منتظمین کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں سرائے میں ٹھہرا ہوں وہ لوگ میرا سامان وہاں سے اپنے یہاں اُٹھالائے۔ لوگوں کی ہمت افزائی سے میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا پھر میں نے وہاں کچھ اور تقریریں کیں۔

چند دنوں کے بعد لاہور سے اپنے وطن واپس چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے ہندوستان کی سیاحت کی۔ چونکہ میں زمیندار گھرانے کا فرد تھا، اس لیے ہمیشہ فارغ البال رہا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے زیارت کربلا معلیٰ کی خواہش نے بے چین کر دیا۔ میں نے زیارت کی غرض سے عراق کا سفر کیا اور تقریباً چھ ماہ تک مقامات مقدسہ کی زیارت کرتا رہا۔ اسی عرصہ میں مجھے عراق کے علماء سے فیض حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں کے علماء بھی مجھے پسند کرنے لگے۔ واپس آ کر میں پھر اپنے محترم استاد و علامہ سبط نبی کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میں نے لاہور کے امام باڑے میں جو تقریر کی تھی اس سے کچھ لوگ بہت متاثر تھے ان لوگوں کو میرا پتہ معلوم نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اخبار میں دوبارہ ملاقات کرنے کی خواہش کا اشتہار دیا۔ جب میں دوبارہ لاہور آیا تو سارا لاہور رنج و غم کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف ایک عجیب اداسی تھی۔ لوگوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ مجھے اسٹیشن پر ہی بتایا گیا کہ شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کا انتقال آج ہوا ہے۔ میرے لیے بھی یہ صدمہ جانکاہ تھا۔ میں بھی اشک بار آنکھوں سے علامہ کے جلوس جنازہ میں شریک ہوا۔ دوسرے دن رئیس الاحرار مولانا ظفر علی خان کی صدارت میں برکت علی ہال میں علامہ اقبالؒ کا تعزیتی جلسہ تھا۔ جہاں مولانا ظفر علی خان نے مجھے علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت

پیش کرنے کا موقع دیا۔ وہاں میں نے اقبالؒ کے موضوع پر بیس منٹ تک تقریر کی۔ یہ میری پبلک تقریر تھی۔ اب مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میں ذکر اور تقریر اچھی طرح کر سکتا ہوں اور اس کو میں نے اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر یہ سلسلہ شروع کر دیا۔

۱۹۳۹ء میں میری شادی پنجاب کے ایک معزز گھرانے میں ہوگئی۔ جس کے بعد میں مستقلاً لاہور آ کر آباد ہو گیا اور آج تک لاہور میں مقیم ہوں۔ تقسیم ملک سے قبل مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بھی پنجاب کے اضلاع میں پاکستان کے قیام کے متعلق تقریریں کیں۔ مرحوم راجہ غضنفر علی خان کو میری تقریریں بہت پسند تھیں۔ وہ عموماً مجھ کو اپنے ساتھ تقریر کرنے کے لے جاتے تھے۔ وہ کہتے ہیں مجموعی طور پر میری زندگی بہت ہی پُر سکون اور خاموش رہی۔ تقریر کے ساتھ علمی مشاغل بھی جاری رہتے ہیں۔

میں نے ایک کتاب ''شہدائے کربلا'' بھی تصنیف کی، اس میں کربلا میں شریک ہونے والے تمام شہداء کی سوانح حیات ہے۔ یہ عوام میں بہت مقبول ہوئی ہے۔ میں اسلام کے تمام فرقوں کو بالکل یکساں خیال کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرا آج تک کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے اخبار ''صدق جدید'' میں میری بہت تعریف فرمائی ہے حالانکہ مولانا سے براہِ راست کبھی نہیں ملا اور نہ وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے ہیں۔

ملک کے بسنے والے مسلمانوں کے تمام فرقوں کے علمائے کرام سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ میں بے شمار ایسے جلسوں میں بھی تقریر کر چکا ہوں جو دوسرے فرقوں کے علماء کرام نے کروائے ہیں۔ اپنی زندگی کے ایک ناگوار واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ گذشتہ دنوں مجھے بھی ملک کے دیگر ممتاز علماء کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ گرفتاری کے بعد مجھے قلات ڈویژن لے جایا جا رہا تھا کہ اچانک اتفاقی طور پر ہماری کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ میں بری طرح زخمی ہوا۔ میری ران کی ہڈیاں دو جگہ سے ٹوٹ گئیں۔ گرفتاری کا پورا زمانہ ہسپتال میں گذرا۔ اس حادثے کا میرے حافظہ پر بہت بُرا اثر پڑا۔ میری

سماعت بے کار ہو گئی۔ بیٹے کی جدائی اور یہ حادثہ دونوں نے مل کر مجھے جسمانی اور روحانی طور پر ناکارہ کر دیا ہے۔ خدا کے فضل سے میرا حافظہ ایسا تھا کہ اگر میں کوئی کتاب ایک مرتبہ غور سے پڑھ لوں تو پھر دوبارہ پڑھنے کی مجھے ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن اب یہ بات نہیں رہی۔

مولانا سید اظہر حسن زیدی ہر سال محفل خراسان کراچی میں ایام عشر میں ذکر فرماتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میری سب سے اچھی تقریر وہ تھی جو میں نے قائداعظم کی پہلی برسی کے موقع پر جٹ لائن کراچی میں کی تھی۔

(ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی
۱۷ اپریل ۱۹۶۸ء

خطیبِ آلِ محمدؐ

یہ خطاب وہ ہے کہ اگر اس کے موصوف کا نام نہ بھی لیا جائے تو سننے والا اس حقیقی ابوالکلام تک پہنچ جاتا ہے۔ جس نے خطیب منبر سلونی صاف وشفاف جھرنوں سے فصاحت و بلاغت کی آبشاریں کوزۂ دل میں سمیٹی اور انہیں مودت کے مقدس کوثر سے صیقل کر کے کچھ اس طرح بشریت وآدمیت کے ذہن وسماعت پر برسایا کہ ناطقہ سرگریبان ہے اسے کیا کہیے۔

گونگی سماعتوں میں بھونچال آ گیا۔ سننے والے سرمستان خم غدیر جھوم اُٹھے۔ سنگریزی اس کی جناب میں کورنش بجالائے۔ برفیلی چٹانیں لودینے لگیں۔ معلم وادیب کی زرخیز سرزمین بجنور باب علم کے وارثوں کی دھرتی نوگاواں جس کے فرق پر لقب ''سادات'' تازہ تراشے ہوئے جھومر کی طرح برس ہابرس سے جگمگا رہا ہے۔ سیادت اور علم کے نجیب الطرفین گوہر آبدار مولانا سید اظہر حسن زیدی اعلی اللہ مقامہ کے باب میں کچھ کہنا حرمت قلم بھی ہے اور آبروئے منصب بھی۔ مگر مشکل اور بہت مشکل ہے۔ پھولوں پر عطر ملنا وہ بھی ہم ایسے چاک گریبانوں کے لیے۔

خلد آشیانی زیدی صاحب قبلہ کلام وتکلم کے ایسے شہنشاہ اور خطیب وخطابت کے ایسے فرمانروا کا نام ہے کہ جس کی حدود سلطنت میں علم، خطابت، فصاحت، بلاغت، لطافت، حسنِ زبان، حسنِ بیان، علم کلام، علم فلسفہ، علم صرف ونحو، فرزان، علم زبان دانی دلوں کو مسخر کرتی ہوئی جادو بیانی شفقت ومہربانی کے آہو کلیلیں بھرتے اور چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ سب اس شہنشاہ خلق ولب کی رعایا نظر آتے ہیں۔ زیدی صاحب خاندان بھر کے پیارے لاڈلے اور مرکز نگاہ یوں بھی تھے کہ بڑی منتوں اور مرادوں سے

یہ گل سدا بہار چمنستان سیادت میں کھلا تھا۔ سنا ہے کہ خاندان والوں نے سونے چاندی میں اس بطل جلیل کو تولا تھا۔ حسن و جاہت کو نظر بد سے بچانے کے لیے والدین نے کان چھدوا کے یاقوت کا خوبصورت بُندا اپنے لال کے گوش میں سجا دیا تھا۔ تب سے خاندان والے پیار سے بھی بندو کہنے لگے۔ ۹ برس کی عمر میں قرآن پاک مکمل بامعنی پڑھ لیا تھا۔ تحقیق و جستجو کا جذبہ ذہین انسانوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

چین سے بیٹھتے ہیں حق کے طلبگار کہیں
کاش مل جائیں انہیں صبح کے آثار

اور یہی حصول علم کی بے چینی اور حق و حقیقت کے ادراک کا پاکیزہ جذبہ زیدی صاحب کو باب العلم نوگاواں سادات کے دانش کدے میں لے آیا اور پھر رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات نے جوہر اصلی دکھانے شروع کیے۔ ۸ برس کی عمر میں پہلی مجلس پڑھنے کے لیے جب بجنور مرکزی امام بارگاہ کے بلند قامت منبر پر یہ بظاہر کمسن اور چھوٹے قامت والا شہزادہ بڑے منجھے ہوئے حلیوں میں زیادہ قد آور اور پُر اعتماد نظر آیا۔ مجتہدین نے چشم بد دور کہا اور علماء نے دعائیں دیں۔ ماں باپ نے بلائیں لیں اور اکابرین قوم اور بزرگانِ خاندان اس ابھرتے ہوئے آفتاب خطابت کی کرنوں کو حسنیت کی ابدی روشنی قرار دیا۔ آل محمد کا خطیب لڑکپن سے جوانی کی حدود میں داخل ہو رہا ہے۔ یا نام خدا عروسِ خطابت کو رعنائی عطا ہو رہی ہے۔

زہے نصیب ہمارا کہ سرزمین مشہد پر چمکنے والا آفتاب مطلع ہندوستان پر چھایا ہوا۔ یہ سحابِ خطابت مترشح تو پورے برصغیر پر ہوا لیکن ٹوٹ ٹوٹ کر کھل کر برسا تو عزاداری کے عظیم مرکز لاہور پر۔ عزادارانِ حسینؑ نے والہانہ انداز میں پذیرائی کی اور اللہ جانے اس جادو بیان خطیب پر اپنی محبتوں کا کیسا جادو کیا کہ زیدی صاحب پھر یہیں کے ہو رہے۔ انہیں ہندوستان کا کچھ بھی تو یاد نہیں۔ بہر حال یہ جملہ معترضہ تھا جس کے پس منظر سے صرف ان کے نسبی اور سبی اعزاء ہی آگاہ ہیں۔ لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے خطابت

کے گوہر ہشت پہلو پر مگر ان کے تبحر علمی کے گواہ، رئیس الحفاظ مولانا حافظ کفایت حسین مرحوم، ثقۃ الاسلام علامہ محمد بشیر انصاری مرحوم، قبلہ وکعبہ مفتی جعفر حسین مرحوم، پروفیسر خواجہ لطیف انصاری مرحوم، علامہ رشید ترابی مرحوم، اور دوسروں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مفکر عصر حضرت مولانا کوثر نیازی، مولانا حامد بدایونی اہل حدیث کے علامہ احسان الٰہی ظہیر شہسوار قلم ونظم ونثر حضرت شورش کشمیری وغیرہ جیسے علم کے کوہ گراں ہیں۔

اکابرینِ ملت جو اُن کے دل دادہ وشیدا تھے ان میں بڑی قدر آور شخصیتیں تھیں اور ہیں۔ نواب مظفر علی قزلباش مرحوم، مجاہد ملت مظفر علی شمسی مرحوم، شائق انبالوی، کرنل عابد حسین، میجر مبارک علی شاہ، ملتان کے گردیزی اور اکابرین خصوصی طور پر حبیب فیملی ان کے معترف ومعتقد احباب میں شمار ہوتے تھے۔ خدا سلامت رکھے میرے سرکار خطیب آلِ محمدؐ کے مقرب خاص نیازمند جناب جعفر علی میر حیات ہیں۔ خدا ان کو طولِ عمر اور صحت و سلامتی عطا کرے۔ ۱۹۵۷ء سے زیدی صاحب کے ساتھی ہمدم اور ہمقدم رہے ہیں۔ واقعاً اگر سرکار خطیب آلِ محمدؐ کے متعلق کسی کو صحیح ادراک کا ذوق وشوق ہے تو اس قحط الرجال کے زمانے میں برادر محترم جعفر علی میر اور بزرگ محقق واہل قلم جناب سید بشیر بخاری صاحب سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم تو سرکارِ زیدی صاحب کے خوشہ چینیوں میں ہیں۔ اس چاہت مآب خطیب کے دربار سے کچھ نہ کچھ مانگنے کی ٹوہ میں لگے رہے ہیں اور میں تو ویسے بھی ان کا مقروض ہوں کہ ان کا ایک جملہ مجھ پر قرض ہے جو میری لاہور آمد کے موقعے پر اب سے دس برس پہلے مجھے لکھ بھیجا تھا۔ مجھے اپنی بارگاہ میں طلب کرنا چاہتے تھے تو یوں طلب کیا:

''عرفان بیٹے! تمہاری لاہور آنے کی خبر نے میرے ساتھ وہی کیا جو بوئے پیراہن یوسفؑ نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔ آجاؤ تو اچھا ہے۔''

میرے لیے کائنات کا عظیم ترین سرمایہ زیدی صاحب کا یہ جملہ ہے۔

(علامہ عرفان حیدر عابدی)

رکن اسلامی نظریاتی کونسل، کراچی)

خطیب اور فنِ خطابت

(سید ضمیر اختر نقوی، کراچی)

ملتِ جعفریہ کے سینکڑوں افراد نے اپنی حیات فن خطابت پر صَرف کی اور نہ معلوم کتنی زحمتوں کے بعد خطیب اور ذاکر کے لقب سے مشہور ہوئے لیکن آج دنیا ان کے نام تک نہیں جانتی، شعراء، مرثیہ گو پر ہزاروں مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں مگر مقررین و ذاکرین ہمیشہ گوشہ گمنامی میں رہے۔ ان پر کوئی تحقیقی کتاب تو مشکل امر تھا آج تک کوئی معلوماتی مضمون بھی کسی نے نہیں لکھا۔ مرثیہ نگاروں کے ہزاروں اشعار لوگوں کو یاد ہیں لیکن مشہور مقررین کے پُر اثر اور شگفتہ جملوں سے علم وادب کے شائقین بھی اب تک بے خبر ہیں۔ خاص طور سے نئی نسل تو قدیم ذاکرین کے نام تک سے واقف نہیں ہے۔ مقررین پر تحقیقی کتاب لکھنا کسی قدر آسان ہے اس لیے کہ اب تک ہر دور میں مقررین کی تعداد شعراء کے مقابلے میں ہمیشہ کم رہی ہے۔ فن خطابت فن شعر سے زیادہ مشکل فن ہے۔ فنِ خطابت ایک ایسا ملکہ فطری ہے جو اپنی تمام تر شان و شوکت کے ساتھ ہر شخص کو قدرت کی طرف سے عطا نہیں ہوا کرتا۔ ایک عالم اور قابل شخص ایک اچھی تقریر کر سکتا ہے لیکن جاذبیت پیدا نہیں کر سکتا۔

پاکستان میں فن خطابت سیکھنے کے لیے کوئی کالج یا سکول یا مدرسہ اب تک نہیں بن سکا اس لیے نئے مقررین کے لیے ضروری ہے کہ وہ قدیم ذاکروں کے اصولِ خطابت کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ مجھے حیرت ہے کہ فن خطابت پر آج تک کسی ادیب یا خطیب نے قلم کیوں نہیں اُٹھایا؟ جب کہ خطابت کے اثرات اور افادیت سے کسی کو انکار نہیں، فن

خطابت نے برصغیر ہندو پاک میں ہماری ثقافت اور ہمارے ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ اُردو زبان کی ترویج اور تہذیبی تطہیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے خطیبوں کے نام گوشۂ گمنامی میں رہے اور آج دنیا انہیں بھول گئی۔ اس کی واحد وجہ صرف یہ ہے کہ خطیبوں کی زندگی ہی تک ان کی تقریروں کی زندگی رہی، اگر ان کی تقریروں کو محفوظ کرلیا جاتا اور ان پر تحقیقی مقالے لکھے جاتے تو شاید دنیائے ادب و مذہب میں مرثیہ نگاری کی طرح یہ بھی ادب کی ایک اہم صنف ہوتی۔ چند خطیبوں کے مسودے اکثر و بیشتر چھپے لیکن انہیں نقد و تبصرہ کی میزان میں کبھی نہ لایا جاسکا کیونکہ عقیدے کا مسئلہ ہمیشہ سامنے آ گیا، جس طرح مرثیہ پر تنقید و تبصرے کی عام اجازت ہے اسی طرح اگر ''فن خطابت'' کو بھی اسی معیار پر رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ادب نثر کی ایک بہترین صنف گوشۂ گمنامی میں پڑی رہے۔

سو سال کے عرصے میں ''فن خطابت'' کا جو ڈھانچہ تیار ہوا ہے اسے چند لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ فن خطابت کے ماہرین اپنی تقریر کا آغاز خطبے سے کرتے ہیں اور خطبے کے خاتمے پر قرآن کی کسی آیت یا ختمی مرتبتؐ کی کسی حدیث کو سرنامۂ کلام بناتے ہیں اور اسی کی روشنی میں مضامین بیان کرتے ہیں۔ ابتداء میں ذکر فضائل اہل بیتؑ اور آخر میں مصائب اہل بیتؑ کا بیان ہوتا ہے۔

ذکرِ حسینؑ کے فیض سے فنِ خطابت نے اپنی ارتقائی منزلیں بتدریج خوبصورتی کے ساتھ طے کی ہیں۔ خطابت کا سب سے بڑا فائدہ ملت جعفریہ کو یہ پہنچا کہ اس ملت کے افراد بچپن ہی سے دوسری اقوام کے مقابلے میں بہت زیادہ معلومات کا ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ کرلیتے ہیں اور اس طرح اپنے دین کے ماضی سے ان کا رشتہ مسلسل ہوتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ملت جعفریہ کے افراد کا ذہن خالص ناقدانہ ہو جاتا ہے اور باطل کی تحریر و تقریر کے فریب میں کسی صورت نہیں آتے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ عقائد اس قدر مستحکم ہو جاتے ہیں کہ ملت جعفریہ کے افراد سے عقائد پر گفتگو کرنا دوسری قوم کے افراد کے لیے

بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ چوتھا فائدہ یہ ہے کہ اُردو بولنے والے ہر قوم کے افراد کے مقابلے میں ملت جعفریہ کے افراد زبان و بیان کے اُصولوں سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ پانچواں فائدہ یہ ہے کہ ادب اور شاعری کا ذوق بھی انہیں ہمیں سے حاصل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ہر دور میں نئے نئے خطیب اپنی خطابت کی تعمیر بھی اپنے بزرگ خطیبوں کی خطابت سے متاثر ہو کر کرتے ہیں۔

میں نے لکھنؤ سے کراچی تک بلا مبالغہ ہزاروں مجلسوں میں شرکت کی اور ہندوستان و پاکستان کے مشہور ذاکروں کی سینکڑوں تقاریر سنی ہیں ان کے شگفتہ طرزِ بیان کی یادوں پر نقش ہوگئی ہے۔ اب میں اپنے پسندیدہ خطیب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہیں:

مولانا سید اظہر حسن زیدی

مولانا اظہر حسن زیدی صاحب کے چار پانچ عشرے سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کے علاوہ چند متفرق مجلسیں بھی سنی ہیں۔ مجھے ان کا بیان پسند ہے، اُن کا بیان نہایت سادہ اور پُر اثر ہوتا ہے۔ مولانا اظہر حسن زیدی صاحب نے خطابت میں چونکہ ادبیت کو شامل کر دیا ہے اس لیے ہر چھوٹے بڑے کے دل پر یکساں اثر ہوتا ہے۔ تقریر میں اس قدر ٹھہراؤ ہے کہ پوری تقریر ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ انہوں نے مرثیوں کے مطالعے سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مصائب کے طرزِ ادا میں ایک ادبی وقار قائم ہے، وہی روایات وہی واقعات لیکن طرزِ ادا میں شعریت کی چاشنی سے نکھار پیدا کرتے ہیں۔ مصائب کا ایک نمونہ دیکھیے۔

۲۷ رجب کو امام حسینؑ کے پاس مسجد میں یہ اطلاع آئی ہے کہ ولید نے آپؑ کو دربار میں بلایا ہے۔ نماز سے فراغت پا کر آپؑ گھر میں تشریف لاتے ہیں۔

یہاں سے چند جملے مولانا اظہر حسین زیدی صاحب کے آپ ملاحظہ فرمائیں:

> ''حسینؑ گھر میں آئے۔ زینبؑ نے دسترخوان چنا۔ گھر کے تمام افراد جمع ہوئے، کھانا شروع ہوا۔ کھانے کے بعد سب اپنے اپنے حجروں میں چلے

گئے، لیکن زینبؑ نے محسوس کیا کہ بھائی آج بہت خاموش ہے، کچھ دیر نہ گذری تھی کہ بھائی نے صحن خانہ سے بہن کو آواز دی کہ زینبؑ ذرا میرا لباس لاؤ میں باہر جانا چاہتا ہوں، زینبؑ لباس لے کر آئیں، لیکن حیران تھیں کہ ''کیا بھیا اکیلے کہیں جائیں گے؟''

یکبارگی آواز دی، عونؑ و محمدؑ اپنے حجروں سے باہر آؤ۔ ماں کی پہلی آواز پر بیٹے باہر آئے، دیکھو! ماموں جان کہیں جا رہے ہیں، باادب پیچھے پیچھے غلاموں کی طرح جاؤ لیکن یاد رکھنا، میرا بھائی جہاں بھی جا رہا ہے اگر وہاں کوئی شخص میرے بھائی کی جانب نگاہ اُٹھا کر بھی دیکھے تو اس کے چہرے پر آنکھیں نہ رہیں اور اگر کسی کا ہاتھ میرے بھائی کی طرف بڑھے تو اس کے جسم پر ہاتھ نہ رہیں۔ زینبؑ کی آواز اُم فروہؑ کے کان میں پہنچی۔ بیٹے کو آواز دی، قاسمؑ، دیکھو! چچا کہیں جا رہے ہیں۔ شہزادی اپنے بیٹوں کو بھی ساتھ بھیج رہی ہیں تم بھی تیغ کے قبضے پر ہاتھ رکھو اور چچا کے ساتھ ہو جاؤ۔ یہ آوازیں ام لیلیٰؑ نے بھی سنیں، بیٹے کے پاس آئیں، کہا: میرے لال علی اکبرؑ! اُٹھو بیٹا کمر کسو، باپ کہیں جا رہا ہے، بابا کے ساتھ جاؤ۔ زوجۂ عباسؑ نے یہ سارا منظر دیکھا بے اختیار اپنے حجرے کی طرف بڑھیں جہاں عباسؑ آرام کر رہے تھے۔ چھوٹا بیٹا عباسؑ کے سینے پر کھیل رہا تھا (عباسؑ کا حجرہ دروازے سے قریب تھا جہاں تک صحن خانہ کی آوازیں نہیں پہنچ رہی تھیں) زوجہ عباسؑ نے دوڑ کر اپنے چھوٹے بیٹے کو عباسؑ کے سینے سے کھینچ لیا اور کہا: تم یہاں آرام کر رہے ہو اور آقا کہیں جا رہے ہیں، ساتھ میں عونؑ و محمدؑ، قاسمؑ و علی اکبرؑ بھی جانے کو تیار ہیں۔

عباسؑ نے تلوار اُٹھائی اور یہ کہتے ہوئے حجرے سے باہر آئے کہ ابھی چند لمحے پہلے کھانے کے وقت میرے آقا نے تو اپنے ارادے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اپنی کمر سے تلوار کھول دیتا۔ محلہ بنی ہاشم کی گلی میں یہ جوانانِ بنی ہاشم حسینؑ کو تلواروں کے سائے میں لیے ہوئے باہر آئے۔ مدینے والوں نے بنی ہاشم کے اس جلوس کو حیرت سے دیکھا۔ مدینے والو! دل بھر کر دیکھ لو! یہ مدینے میں بنی ہاشم کا آخری جلوس ہے۔''

رہِ سخن میں چراغِ آخر

حماد اہلِ بیت سید محسن نقوی

نطق و بیان کے شاداب جزیروں اور حرف وصوت کی گل رنگ وادیوں کی حد بندی کرنے والے مؤرخ مسافر اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے تردد محسوس نہیں کریں گے کہ اگر اخلاق دو عالم نے انسان کو تکلم کی صلاحیت عطا فرمائی تو انسان نے بھی ہوا کے بے رنگ پیکر کو حروف والفاظ کے قبیلوں اور فکر وتقریر کے رنگوں میں تقسیم کر کے اپنی ذات میں پوشیدہ معجزات کا سراغ لگا کر مخاطب کے وجدان میں اظہار وبلاغ کے چمن زاروں کی نکہتوں سے انواع واقسام کے خیمے نصب کر کے اپنے خالق کی صفات کو آئینہ دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

جس دن کی پہلی ساعت کی ساعت میں پہلے انسان کے لبوں سے پھوٹا ہوا پہلا لفظ ہوا کے جھونکے کی طرح آزاد ہوگا، اس دن یقیناً سورج کی کرنوں کے سجدے طویل ہو گئے ہوں گے اور زمین کی کانپتی ہوئی سرگوشیاں اپنی نبضیں گننے سے گریز کرنے لگی ہوں گی۔ فضا کے سکوت کی وحشتوں کے خلاف احتجاج کے طور پر ابھرنے والی پہلی انسانی صدا کا نام میرے نزدیک خطابت ہے اور خطابت کے عمل سے گزرتے ہوئے ایک خطیب کو تمام تر ذہنی مراحل طے کر کے ایسے فنکارانہ تخلیقی کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جس کی تپش سے بعض اوقات اس کے تمام تر حواس تیز دھوپ میں رکھی ہوئی برف کے ٹکڑے کی طرح قطرہ قطرہ پگھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

ایک اعلیٰ پایہ کے خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ بے پناہ مشاہدہ، وسیع تجربہ، گہرا

مطالعہ اور علم کلام کے تمام پہلوؤں کا عالم ہونے کے علاوہ انسانی نفسیات کا ماہر، موضوع کا انتخاب، سامعین کی ذہنی افتاد کا احاطہ، گفتگو کی کشش اور اندازِ بیان کی سلاست مقرر کو مشاق اور ذہنی طور پر بالغ نظر بنانے میں آب و ہوا کا کام کرتی ہے۔ عام انسانوں کی طرح لفظوں پر بھی بچپن، جوانی، بڑھاپا اور موت طاری ہوتی ہے۔ اب یہ مقرر کا منصب ہے کہ وہ اپنے نظریات، جذبات اور محسوسات کے اظہار کے لیے صحیح وقت پر صحیح لفظوں کا انتخاب کر کے سامعین کو اپنے مافی الضمیر کا قائل کرے اور لفظوں کے تند خو سیلاب میں سامعین کے اذہان کو خس و خاشاک کی طرح بہاتا چلا جائے۔

علم الکلام کے ماہرین نے مختلف نظریات کے مقررین اور خطیبوں کے لیے جو متفقہ اصول وضع کیے ہیں، ان میں اندازِ بیان سلاست کو واضح طور پر اہمیت دی ہے اور یہ بات متفقہ طور پر طے ہے اگر مقرر یا خطیب سامعین کے مزاج کو سمجھتے ہوئے ان کے معیار پر پورا اترنے والے الفاظ اپنے جذبات کا اظہار نہ کر سکے سامعین اس کی گفتگو کو قبولیت کی سند دیتے ہوئے ڈرتے نہیں تو ہچکچاتے ضرور ہیں۔ اصول وضع کیے ہیں، ان میں اس لیے ہر مقرر یا خطیب جو اندازِ بیان کی شگفتگی، لہجے کی دل گرفتگی، زبان کی پختگی اور طبیعت کی پُرزور شگفتگی سے عاری ہو یا نقاد بن جاتا ہے یا پھر خشک مزاج اور تند خو ناصح کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک ہر لعزیز اور شگفتہ مزاج خطیب یا مقرر نہیں بن سکتا۔

آج سے نصف صدی پہلے ہندوستان کے ایک زرخیز علاقہ بجنور سے ایک نوجوان سرما کے سورج کی طرح طلوع ہوا، جس کا مزاج قلندرانہ، طبیعت شاعرانہ اور انداز شاہانہ تھا۔ بڑے گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ گھر میں علم کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ خاندان ادب کا گہوارہ اور احباب کی محفلیں ستارہ مثال تھیں۔

وہ نوجوان دوستوں کی جان، گھر والوں کا لاڈلا، اپنوں کا مزاج شناس اور غیروں کے لیے صبح کی برفیلی ہوا کے جھونکوں سے زیادہ بے ضرر تھا۔ اس نے علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ادبی محفلوں میں پرورش پائی۔ مذہبی جلسوں میں تربیت حاصل کی۔ شفاف ذہنی

کیفیتوں نے اسے زمانے کی جھیل سے کنول کی طرح کھلنا سکھایا۔ ماحول نے اس کے برگ و بار میں رعنائیاں بھر دیں۔ آب و ہوا کی نرمی و خنکی نے اسے بردبار بنایا۔ والدین کی شفقت نے اسے انتہائی شفیق اور احباب کی چاہت نے اسے سب کا رفیق بنا دیا۔

وہ ریشمی لفظوں کا خالق، چھبتی ہوئی سطروں کا مصور اور بندھے ٹکے فقروں کا تخلیق کار، طبیعت میں موسم خوشبو کی قوس قزح کے سارے رنگ سمیٹ کر غیر شعوری طور پر مدحتِ و منقبت آلِ محمدؐ میں مصروف ہوا۔ فطرت نے اس لالہ سخن کی حنابندی کی۔ مزاج کی سیمائیت نے ایک جگہ نہ ٹکنے دیا۔ منشی فاضل کا امتحان دینے لاہور آیا۔ ایک سرائے میں رات بسر کی۔ انجم شماری سے اکتا کر ایک امام بارگاہ میں مجلس عزا سننے چلا گیا۔ وہاں اپنے جد امجد کی مدح سرائی کے شوق نے جنون کی کیفیت اختیار کی۔ اجنبی شہر، اجنبی ماحول، اجنبی لوگ منبر پر جانے کی اجازت چاہی۔ صرف پانچ منٹ ملے۔ لیکن وہ نوجوان منبر پر آیا تو اس کے نرم لبوں سے شگفتہ الفاظ کے چشمے پھوٹنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اجنبی نوجوان نے سننے والوں کی سماعت میں شناسائی کا رس گھول کر سب کو اپنا بنا لیا۔ ہر طرف سے واہ واہ سبحان اللہ اور آفرین کے شور نے حوصلہ افزائی کی۔ تقریر سے فارغ ہوا۔ رات کو سویا تو صبح کی سورج کی شعاعوں نے اُس نوجوان کی پیشانی پر ''خطیب آلِ محمدؐ'' کا کتبہ سجایا، اور تاریخ نے اپنے سینے پر اُسے خطیب آلِ محمدؐ سید اظہر حسن زیدی کے نام سے سجا لیا۔ اظہر حسن زیدی میرے نزدیک نام ہے خطابت کی شاعری اور شاعری کی خطابت کا۔ کیونکہ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ اگر خطیب آلِ محمد خطابت کی سرحد پر اپنا خیمہ نصب نہ کرتے تو وہ یقیناً آج اتنے بڑے شاعر ہوتے جتنے بڑے خطیب ہیں۔

زیدی صاحب کی خطابت نے منبر کی تاریخ میں بالکل اسی انداز کا انقلاب برپا کیا ہے جس طرح کا انقلاب غالب کے خطوط نے اُردو نثر کی تاریخ میں برپا کیا تھا۔ جس طرح غالب سے پہلے اُردو نثر کی نفاست، کوہسار قامت، الفاظ مبہم، تراکیب، غیر واضح، استعارات غیر ضروری تشبیہات اور بے معنی تصرفات کے بوجھ تلے دب کر کراہنے لگی تھی۔

اسی طرح زیدی صاحب سے پہلے خطابت کی نزاکت بھی، رجب علی بیگ سرور کے سنگ دل جملوں سے ملتی جلتی وزنی تقریروں، بے معنی قافیہ پیمائیوں مسجع مقفع عبارتوں اور بے مطلب مترادف کے بارگراں سے سربریدہ اور کمر خمیدہ ہو چکی تھی۔ مگر خطیب آلِ محمدؐ نے فنِ خطاب کو شمعِ محفل کا گداز، صبح صادق کی نفاست، برگ گل کی نزاکت، نالۂ نیم شب کا سوز وساز اور شعلہ مستعجل کا پیچ و تاب عطا کر کے اپنے تازہ دم خیالات کی ابدیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ میں نے جب بھی ان کی تقریر سنی ہے مجھے یوں لگا ہے جیسے ساعت کے بے آب وگیاہ دشت میں، ہوائے خلد برس کی اٹھکیلیاں اور تصور کے لق ودق صحرا میں ایک دم ڈھیر سارے پھول کھل اُٹھے ہوں۔ جس طرح فنِ شاعری میں سہل ممتنع مشکل کام ہے اسی طرح فنِ خطابت میں بھی آسان لفظوں کے آبگینے ڈھالنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر زیدی صاحب نے اس فن کو اپنی عادت نہیں بلکہ فطرت بنا لیا ہے۔ مشکل سے مشکل مسائلِ حیات کو سیدھے سادھے الفاظ میں دلکش انداز سے بیان کر دینا صرف زیدی صاحب کا حصہ ہے۔ وہ اپنے فن کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ اُن کا اپنا انداز، ان کی اعجاز بیانی، ان کی سحر انگیزی فطرت کی طرف سے انہیں ودیعت ہوئی ہے وہ لفظوں کے آئینہ گر، فقروں کے خالق، موضوع کے خزینہ دار اور خطابت کی سلطنت کے مطلق العنان تاجور ہیں۔

انہوں نے لفظوں کے سلسلے میں کبھی بھی تنگی داماں کا گلہ نہیں کیا، بلکہ لفظ ان کی ذہنی وسعت کے مقابلے میں ہمیشہ کوتاہ قامت ثابت ہوئے۔ وہ شاعرانہ موضوع ہو یا فقہی مسائل، علمی بحث ہو یا ادبی نوک جھونک، مترادفات کی قطاریں ہوں کہ استعاروں کی بہاریں، تشبیہوں کی تسبیحیں ہوں کہ کنایوں کے آبگینے وہ ایک تجربہ کار مرصع ساز کی طرح ہمیشہ ماحول کے مطابق گفتگو کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھی ذہنی تھکن محسوس نہیں کی اور نہ ہی ان کی آواز میں کبھی لرزش پیدا ہوئی ہے۔ وہ ایک مسیح مزاج چارہ گر کی طرح بیمار ذہنوں کو صاف شفاف لفظوں کی خاک شفا عطا کرتے اور الجھے مزاجوں کی سادہ سطح میں رنگ بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تقریر ہر فرقہ، ہر نظریہ اور ہر مذہب وملت کے

افراد کے لیے روح کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔

اظہر حسن زیدی کی تقریر ان کی طبعی شرافت کی آئینہ دار اور ان کی طبیعت ان کی تقریر کی طرح سادہ ہے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے ظاہری پیکر پر علمی جاہ وجلال کا لبادہ نہیں اوڑھا اور نہ ہی اپنے خدوخال پر کبر وغرور کا خول سجانے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ وہ لفظوں کی طرح لوگوں کے دل میں اترنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ قناعت پسندی میں اولاد علیؑ ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ فقر مزاجی میں ابوذرؓ کے ہم مسلک، قلندرانہ انداز میں میثم تمار کے مزاج آشنا اور گفتگو میں نہج البلاغہ کی سطروں کے اسیر نیاز ہیں۔ وہ بزرگوں کے گروہ میں معزز، نوجوانوں کے قبیلے میں سردار اور کم سنوں کے کارواں میں نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

زیدی صاحب جیسا فقیر منش انسان شہنشاہوں کے لیے درگاہ، ارباب جاہ وجلال کے لیے پیکر عبرت ہے۔ وہ گذشتہ نصف صدی سے محمدؐ وآل محمدؐ کی ثنا خوانی کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ ان کے نقش قدم پر چلنے والے اب بذات خود میر کارواں بن گئے ہیں۔ ان کے لفظ اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں مگر فکر اسی طرح زندہ وتابندہ ہے۔ شاعر آل عمران عزیزم صفدر حسین ڈوگر قابل مبارک ہیں کہ انہوں نے ایک یگانہ روزگار خطیب اور بے مثال مقرر خطیبِ آل محمدؐ علامہ سید اظہر حسن زیدی کی تقاریر کا مجموعہ شائع کر کے نہ صرف تشنگان علم وعرفان کی ذہنی آسائش کا سامان مہیا کیا ہے بلکہ خطابت کی تاریخ کو ایک روشن باب بھی عطا کیا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صدق چہاردہ معصومین علیہم السلام خطیب آل محمد کا سایہ ہم ایسے طالبان علم وادب پر سلامت رکھے۔ آمین!

لاہور، ۲۵ مئی ۱۹۸۱ء

خطیبِ آلِ محمد مولانا سید اظہر حسن زیدی کی یاد میں

زیدی ترا فراق ابد تک رلائے گا!

(حمادِ اہلِ بیت سید محسن نقوی)

یہ کون اُٹھ گیا ہے کہ محفل ہے سوگوار
یہ کس کے غم میں شہر کا منظر اُداس ہے

یہ کس کے سوگ میں ہیں دریچے بجھے ہوئے
یہ کس کے واسطے دلِ مضطر اُداس ہے

کیوں بانجھ ہو گئی ہے دل و جان کی سرزمین
کیوں نطق و لب کا سوچ سمندر اُداس ہے

کس کے لبوں پہ مہر سکوت اجل لگی؟
کیوں شہر میں ہر اک سخنور اُداس ہے

کیوں ماتمی ہوا ہے در و بام کا لباس
رخصت ہوا ہے کون کہ ہر گھر اُداس ہے

کس کے لیے ہیں آنکھ میں آنسو رُکے ہوئے
شہ رگ میں گونجتا ہوا محشر اُداس ہے

کس کی صدا پہ موت نے پہرے بٹھا دیئے
اربابِ چشم و گوش کا لشکر اُداس ہے

یہ کون آفتاب اندھیروں میں گم ہوا
کیوں بزم تابش مہ و اختر اُداس ہے

یہ کس نے حرف و صوت کا سورج بجھا دیا
گم صم ہے بزم گوشہ منبر اُداس ہے

کس آفتاب حرف و سخن کی تلاشِ میں
رہتا ہے زخم شامِ غریباں کھلا ہوا

کس کا نشان بند کفن دیکھنے کے بعد
پایا ہے کنج دیدہ ویراں کھلا ہوا

ٹوٹا ہے کس کا حلقہ زنجیر زندگی؟
ہے قفل بابِ شہر خموشاں کھلا ہوا

کس کے لہو کی قوس و قزح ٹوٹنے کے بعد
آنکھوں میں ہے گلاب گلستاں کھلا ہوا

کیا جانے کس کی یاد میں رہتا ہے آج کل
چاک جگر کے ساتھ گریباں کھلا ہوا

کیا کہیے اور چاہیئے کتنی متاع غم
اَب تک ہے اپنے درد کا داماں کھلا ہوا

دیکھو کہ رفتگاں نے لگائے کہاں خیام
حد نظر تلک ہے بیاباں کھلا ہوا

کس مرد حق پرست کی بخشش کے شوق میں
کب سے ہے بابِ رحمت یزداں کھلا ہوا

وہ مردِ حق پرست وہ پندار زندگی
سج دھج غمِ حیات کی اُس کے سخن میں تھی

اُس کے لبوں کو چھو کے بدلتی تھی پیرہن
لفظوں کی اک دھنک کہ بہار چمن میں تھی

اب کون بے ستوں سے تراشے گا جوئے شیر
یہ کاوشِ ہنر تو اسی کوہ کہن میں تھی

اک عمر بجلیوں کو سکھاتی رہی وقار
ناطاقتی کی موج کہ اس کے بدن میں تھی

کچھ ولولوں کا رنگ بھی لے میں تھا موجزن
کچھ زلزلوں کی گونج بھی اس کی تھکن میں تھی

اس کی صدا میں کرب و بلا کا گداز تھا
مظلومیت کی چیخ بھی اس کے دہن میں تھی

کرتا تھا موم جنبشِ لب سے حدید کو
یہ بات نکہتوں کی طرح اس کے فن میں تھی

اب سانس کی صلیب پہ جھولے گا اپنا جسم
جو زندگی تھی اس کی حسین انجمن میں تھی

اظہر حسن مصورِ تاریخ کربلا
یعنی خطیبِ آلِ محمد کہیں جسے

نباض علم و حکمت و ادراک و آگہی
عکّاس رنجِ مقتل مشہد کہیں جسے

موجِ فرأت درد اسی سے رواں دواں
محراب جاں میں فکر کی آمد کہیں جسے

خود چشمہ خیال کبھی عکسِ جمال بھی
رمز آشنائے منبر و مسند کہیں جسے

معیار آسماں پہ ستاروں کا دائرہ
کردار عکس حسن اب وجد کہیں جسے

الفاظ آبگینوں میں ڈھلتے ہوئے خیال
احساس دھوپ چھاؤں کی سرحد کہیں جسے

وہ جستجو کہ منزل ہستی نشانِ پا
وہ گفتگو کا حاصل مقصد کہیں جسے

کل اس کی دید وجہ فروغ دل و نظر
اب اس کی یاد فکر کا معبد کہیں جسے

وہ ماتمی لباس میں کھلتا ہوا گلاب
اک امتزاجِ احمر و اسود کہیں جسے

اے طالبانِ حرفِ سخن عاشقانِ شوق
زیدی کہاں ہے؟ گوشہ منبر سے پوچھیے

انہی ساعتوں میں اندھیرا ہے دیر سے
سورج کہاں گیا؟ مہ و اختر سے پوچھیے

وہ تاجدار تخت معانی ہے گم کہاں
روتے ہوئے ہر ایک سخنور سے پوچھیے

شیشے کو کب خبر ہے شکست مزاج کی
شیشے کی ضرب ٹوٹتے پتھر سے پوچھیے

بجھتے ہوئے چراغ کی ہچکی کا ماجرا؟
تاریکیوں کی زد میں بھرے گھر پوچھیے

بے درد دوستوں کو دکھوں کی خبر کہاں
زخموں کی ٹیس کاوش نشتر سے پوچھیے

چپ چاپ جا رہا ہے جنازہ خطیب کا
یہ موت چیختے ہوئے منظر سے پوچھیے

وہ چار اشک چارہ گر ہجر کب ہوئے
صحرا کی تشنگی کو سمندر سے پوچھیے

ذکرِ حسینؑ ابنِ علیؑ کا صلہ ہے کیا
فرصت ملے تو آلِ پیغمبرؐ سے پوچھیے

ہر "مجلسِ عزا" میں ہمیں یاد آئے گا
زیدی تیرا فراق ابد تلک رُلائے گا

دو دیدہ ور

خطیبِ آلِ محمدؐ

اور

حمادِ اہلِ بیتؑ کی تاریخ ساز گفتگو

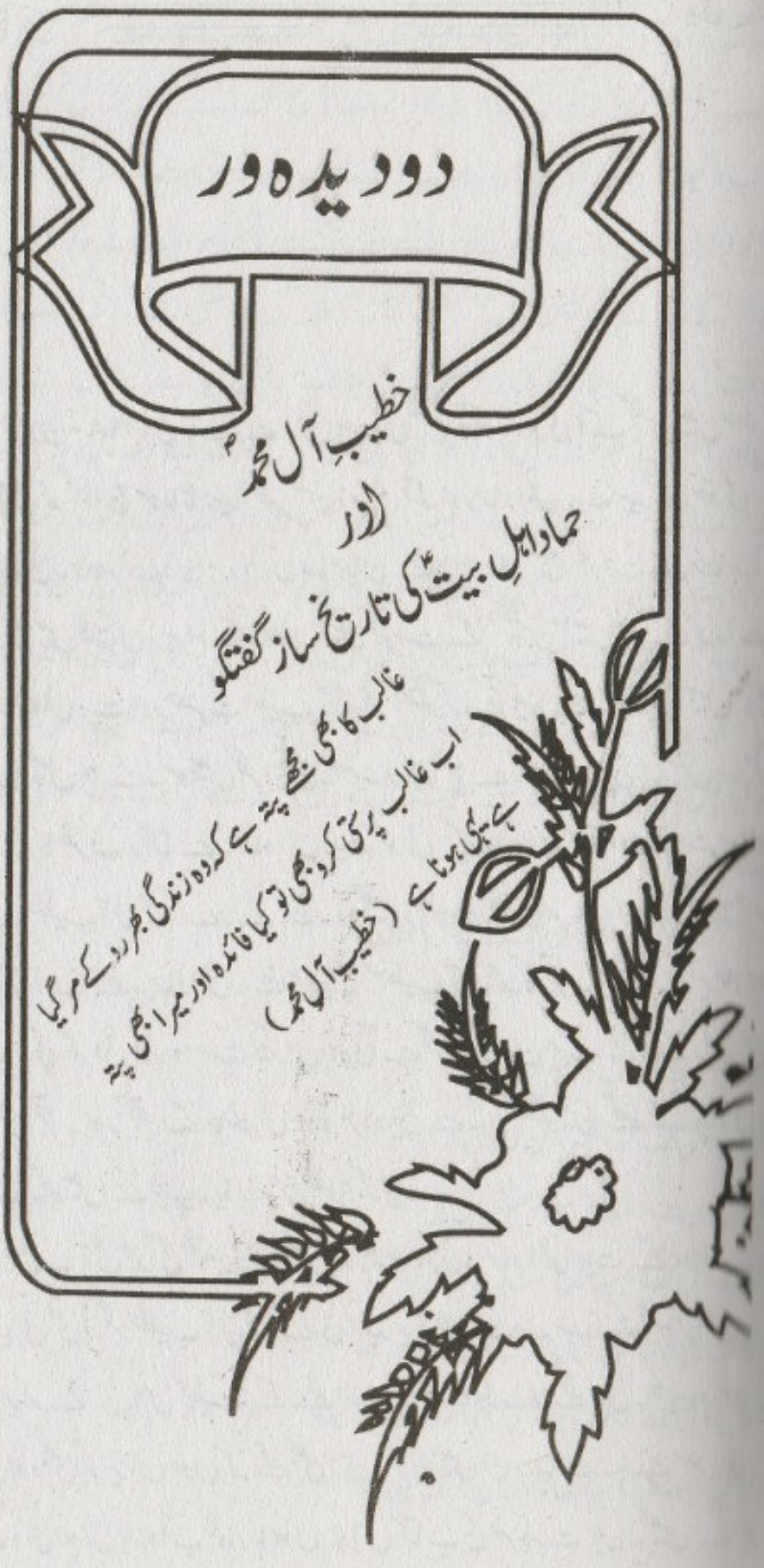

غالب کا بھی مجھے پتہ ہے کہ وہ زندگی بھر روتے مر گیا

اب غالب پر کی کرو بھی تو کیا فائدہ اور میرا بھی پتہ

ہے یہی ہوتا ہے (خطیبِ آلِ محمدؐ)

۲ جون ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ ٹلی سیداں ضلع شیخوپورہ کی ایک مجلس میں حضرت خطیبِ آلِ محمدؐ الحاج مولانا سید اظہر حسن زیدی قبلہ اور حماد اہل بیت سید محسن نقوی نے شرکت فرمائی۔ دوسرے دن ہر دونوں صاحبان نے لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں خطاب کرنا تھا۔ راستے میں گلستانِ زہراء کے دونوں بلبل گجرات کے ''نشیمن'' میں ٹھہرے کہ رات سر پر تھی۔ حماد اہل بیتؑ اور حضرت خطیبِ آلِ محمدؐ گفتگو کرنے بیٹھ گئے۔ کوثر و سلسبیل کے کنارے اچھل پڑے۔ موجیں ٹکرائیں۔ سمندر بپھر پڑے۔ سمندر اپنی امانتیں ساحل کو سپرد کرنے کا ظرف رکھتا ہے۔ حماد اہل بیتؑ سوال کیے جا رہے تھے اور برجستہ سوالوں کے جواب خطیبِ آلِ محمدؐ دے رہے تھے۔ دو عظیم ذہن اور فکری سرمایہ دار ایک تاریخ ساز بحث پر اُتر آئے تھے۔ حماد اہل بیتؑ کا جذبہ ''خطیبِ آلِ محمدؐ کا تجربہ'' اگلوانے پر تلا ہوا تھا۔ سمندر کی گہرائی اور وسعت بیکراں ہوتی ہے مگر غوطہ زن بہت کچھ لے لیتے ہیں۔ غواصی بھی تجربہ اور جستجو کے ساتھ ہی ہو تو مزا دیتی ہے۔ یہ گفتگو تین گھنٹے تک جاری رہی اور یہ سب کچھ میں نے ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر لیا۔

خطیبِ آلِ محمدؐ کی شخصیت پر بھرپور بحث ہوئی۔ حماد اہل بیت کے سوالات کی چبھن دیدنی تھی۔ مگر خطیب آلِ محمدؐ کے فی البدیہہ جوابات، یہ سب کچھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تحریر کرنے میں اس کیفیت کے لیے الفاظ ساتھ چھوڑنے لگے ہیں۔ مِن و عَن لکھنے سے میں خود بھی گریزاں ہوں کہ مجھے بھی اسی ماحول میں ہی رہنا ہے۔ اپنے معزز قارئین کے لیے وہی سوال و جواب لکھ رہا ہوں جو اس کتاب کی ضرورت ہیں۔ میں نے جو کچھ

لکھا ہے، وہ آواز کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہے۔ اس بات پر فخر ہے کہ حضرت خطیبِ آلِ محمدؐ کی زندگی کے حالات و واقعات آج تک اتنے مفصل شائع نہیں ہوئے۔ جذب و کیف، سوز و جنون میں ڈوبے ہوئے لوگ اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ بجنور (ہندوستان) سے ابھرنے والے سورج سے روشنی ہر ایک نے حاصل کی۔ نصف النہار کے زمانے کی تپش اس ''گفتگو'' میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ اب جب بضد ہو کر ''وقت'' نے اس سورج کا رخ مغرب کی جانب موڑ ہی لیا ہے۔ سانس بے ربط ہو چکے ہیں اور احباب مصروف ہیں۔ مسلم بن عقیلؑ کی طرح وقت کے کوفہ میں یہ شخصیت تنہائی کے کرب میں زندہ ہے تو بلا کا حوصلہ ہے اس انسان کا۔ کہیں کہیں زندہ رہنا بھی جرأت مندی ہے۔ میں خطیبِ آلِ محمدؐ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں کہ وہ آج بھی گفتگو کرتے ہوئے ماضی میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ اس سے ''مستقبل'' مایوس نہیں، میں خود دور نکل گیا ہوں۔ حضرت زید شہید کے خاندان کے چشم و چراغ حضرت خطیب آلِ محمدؐ۔ کیا تھے؟ اور کیا ہیں؟ حماد اہل بیتؑ اور خطیبِ آلِ محمدؐ کی گفتگو سے یہ سب کچھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

لیجئے میں درمیان سے ہٹ رہا ہوں۔

(صفدر ڈوگر)

حمادِ اہلِ بیت: آپ کا اسم گرامی؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: محمد اظہر حسن زیدی

حمادِ اہلِ بیت: والد محترم کا اسم گرامی؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: سید ابن حسن زیدی؟

حمادِ اہلِ بیت: آپ کی پیدائش کس جگہ کی ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: رسول پور، ضلع بجنور (ہندوستان)

حمادِ اہلِ بیت: آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: ۱۲ دسمبر ۱۹۱۲ء یہی بتائی جاتی ہے مگر میرے بڑے بھائی اس سے اختلاف کرتے تھے۔ بہر حال چاند کی چھبیس تاریخ تھی۔ سن کا صحیح پتہ نہیں۔

حماد اہلِ بیت: رسول پور قصبہ تھا یا گاؤں اور کوئی بچپن کی بات یاد رہ گئی ہو تو بتائیں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: دریائے گنگا کے کنارے ضلع بجنور (یو۔پی) ہندوستان میں ایک چھوٹی سی سادات کی بستی ہے جس کا نام رسول پور ہے۔ یہ گاؤں اور اس کے ساتھ دو تین گاؤں تھے۔ شاہان اودھ نے میرے دادا، پردادا کو بطور جاگیر عطا کیے تھے۔ اصل میں ہم رہنے والے تو ڈسٹرکٹ مظفر نگر کے اور ساگورے کے ہیں۔ ہم اس جاگیر پہ آ کے آباد ہو گئے۔ اس کی عبارت ابھی مجھے یاد ہے۔

موضع محب اللہ پوردّ ھاکی ویران مطلق برائے تقویت معاش اولاد کرم علی بھادر علی مقرر و معاف فرمودیم نیز عزاداری سید الشھداء لازم می کنیم۔

(آصف الدولہ بادشاہ اودھ)

یہ عبارت تھی اور اس کے نیچے تھے دستخط۔ اس وقت ویران علاقہ تھا۔ بزرگ جتنا چاہتے علاقہ گھیر لیتے۔ انہوں نے جتنا مناسب سمجھا، لے لیا۔ قبضہ کر لیا۔ مکان بنا لیا۔ میری پیدائش اسی گاؤں کی ہے۔ گنگا کے کنارے یہ گاؤں آباد ہے۔ اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ جن کا انتقال دس بارہ سال ہوئے ہوا ہے۔ حضرت سرکار مولانا صغیر حسن قبلہ پورے برصغیر میں جن کی علمیت مسلمہ تھی، جن کے شاگردوں میں مولانا سید محمد بھی تھے اور لوگ بھی تھے۔ جب میں پیدا ہوا تو انہیں بلا کے میرے باپ نے میرے کان میں اذان کہلوائی تھی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے میرے باپ سے بات کہی کہ اسے علم دین پڑھا کر مولوی بنائیں۔ یہ مولانا صغیر حسن قبلہ نے کہا۔ میرے والد نے کہا کہ کالے رنگ کا مولوی اچھا نہیں لگتا۔ جب میں پیدا ہوا تھا، میرا رنگ کالا تھا۔ مولانا نے میرا زائچہ نکالا۔ میرے ذائچے میں انہوں نے لکھا کہ یہ بچہ جس زائچے میں جس برج میں پیدا ہوا ہے یہ

حضرت یوسفؑ کا زائچہ ہے یہ وطن میں نہیں بلکہ پردیس میں تکلیف بھی اُٹھائے گا اور عزت بھی پائے گا۔ انہوں نے میرا نام محمد اظہر حسن زیدی رکھا تھا اور ساتھ میں رہبر حسین رکھا۔ عام طور پر مجھے رہبر کہا جاتا ہے۔

محسن بیٹے! شاید تم یقین نہ کرو جب میں چھ مہینے کا تھا اس وقت قبلہ مولانا نے میرا جھولا جھلا کر کچھ پڑھا۔ ان کا اس وقت کا جھولا جھلانا مجھے یاد ہے۔ یہ معجزے سے کم نہیں اور ان کی شکل بھی مجھے یاد ہے۔ اگر کوئی یقین نہیں کرتا نہ کرے مجھے کیا ہے؟ جب میں سوا سال کا تھا بارش ہونے لگی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جیسے یہ آج کی بات ہے مجھے میری ماں نے کہا بیٹا ایک بات یاد کرو، میں نے کہا کہ کیا، تو اس نے مجھے انیسؔ کا ایک بند سنایا۔ وہ مجھے یاد ہو گیا۔ اور آج تک یاد ہے تمہیں بھی سناتا ہوں ؎

عالم میں جو تھے فیض کے دریا وہ کہاں ہیں؟
ہم سب سے جو تھے افضل و اعلیٰ وہ کہاں ہیں؟

جو نورِ خدا سے ہوئے پیدا وہ کہاں ہیں؟
پیدا ہوئی جن کے لیے دنیا وہ کہاں ہیں؟

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدؐ مرسل نہ رہے کون رہے گا

یہ سوا سال کے سن میں مجھے یاد تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ بند مجھے یاد تھا اور اسی وقت یاد ہو گیا۔ میری ماں نے میرے باپ بھائیوں سمیت خاندان کو اکٹھا کر لیا اور کہا کہ سنو اس نے آج کیا یاد کیا ہے اور میں نے فوراً سنا دیا۔ مجھے گود میں باہر لے جایا گیا۔ بیسیوں آدمی اکٹھے تھے اور میں سوا سال کا بچہ انہیں شعر سنا رہا تھا۔ شہرت نہیں ہونی تھی کیا؟ قبلہ میر صغیر حسن نے سنا۔ شام کو ہمارے گاؤں میں ہمارے ہاں خوب محفل سجتی تھی وہاں ہر طبقے کے لوگ آیا کرتے تھے۔ یہ شعر تمام کے سامنے سنائے گئے۔

حمادِ اہل بیت: قبلہ آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: میرے علاوہ میرے حقیقی دو بھائی تھے اور چچازاد بھائی بھی تھے۔ ہم سب ایسے رہتے تھے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم تمام سگے بھائی ہیں یا چچازاد، تایازاد ہیں میرے سگے بھائی دونوں وفات پا گئے۔ اب کوئی زندہ نہیں ہیں۔ بہنیں زندہ ہیں اور پاکستان ہی میں ہیں، کراچی میں۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: کوئی اور بچپن کا واقعہ سنائیں اگر یاد ہو؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: ہاں سنو! جب میں دو سال کا ہوا تو تیس فٹ کی بلندی سے گر پڑا۔ وہ گرنا تو مجھے یاد نہیں۔ یہ بات مجھے یاد ہے کہ مجھے تختے پر لٹا دیا گیا اور پہلوان حکیم سب پاس تھے۔ ماں رو رہی تھی۔ مجھے یہ خوب یاد ہے وہ وقت بھی۔ سانس کی تکلیف ہوگئی تھی۔ آٹھ دس دن علاج رہا اور میں تندرست ہوا۔ چار سال کی عمر میں مجھے انیسؔ، میرؔ، دبیرؔ، غالبؔ، اور اسمٰعیلؔ میرٹھی کے بہت شعر یاد تھے۔ حافظ سید ذوالفقار علی شاہ قبلہ ہمارے ہاں مجالس پڑھنے جایا کرتے تھے اور مجھ سے شعر سنا کرتے تھے۔ میں انیسؔ کے شعر انیسؔ کے طرز میں سناتا۔

دبیرؔ کی شعر دبیرؔ کے طرز میں سناتا۔ میں نے تو انہیں پڑھتے سنا ہوا نہیں تھا۔ مجھے میری ماں نے سنایا تھا۔ بیٹے انیسؔ اس طرح پڑھتا تھا۔ دبیرؔ اس طرح پڑھتا تھا اور میں اسی لہجے میں ویسے ہی پڑھ دیتا اور لہجہ اب بھی مجھے یاد ہے۔ (اس کے بعد حضرت خطیبِ آلِ محمدؐ نے انیسؔ اور دبیرؔ کے اشعار ان ہی کے لہجوں میں پڑھ کر سنائے۔ مرتب)

حمادِ اہل بیت: آپ نے تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: میرے اپنے ہی گاؤں میں میری تعلیم کا آغاز ہوا۔ جب میں چار سال، چار ماہ اور چار دن کا ہوا مجھے ایک مولانا کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ اسے ہماری اصطلاح میں بسم اللہ کہتے ہیں۔ میری بسم اللہ کرائی گئی۔ اس وقت سونے کا ایک ہیرا میرے کان میں پڑا رہتا تھا۔ میرے گلے میں سونے کی ہنسلی اور کم از کم پچاس تعویذ۔ میں بڑا منتوں والا

تھا۔ نظر بد کے ڈر کے اور ہر آٹھویں دن میری ماں (خدا اسے جوارِ سیدہ میں جگہ دے۔ آمین! میں اس کی مقدور بھر خدمت نہیں کر سکا) میری یہ پلکیں کتر کے، ان کی دھونی مجھے دیا کرتی تھی تا کہ میری آنکھوں کو نظر نہ لگ جائے۔ بڑے ناز و نعم کی پرورش ہوتی تھی۔ بچوں میں کھیلتا نہیں تھا۔ گھر ہی میں رہتا تھا، گھر ہی میں کھیل لینا اور خاموش رہنا عجب سی زندگی تھی۔ میری رسم بسم اللہ پر بڑا جشن ہوا۔ بڑے ٹھاٹھ ہوئے۔ انہوں نے میرے سامنے قاعدہ رکھا جس میں الف۔ ب لکھا ہوا تھا۔ میں نے زیادہ سے زیادہ چار دن میں وہ قاعدہ یاد کر لیا جب میں چھ سال کا ہوا تو اُردو کی ہر کتاب پڑھ سکتا تھا۔ مطلب نہ سمجھوں الگ بات ہے، پڑھ لیتا تھا۔ تو اب مولانا صغیر حسن قبلہ نے اور ایک اور صاحب تھے وہاں مرتضیٰ حسن میرے بزرگوں سے کہا میرے بڑے بھائی سے بھی کہا وہ بی۔ اے تھے۔ اس وقت میرے خاندان تو کجا اس علاقے میں بھی کوئی بی۔ اے نہ تھا۔

ان سے کہا کہ اب اس کی زندگی ضائع نہ کرو۔ اب اسے کسی بڑے آدمی کے سپرد کر دو۔

چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو ۸ جمادی الثانی کے روز مجھے میرے استاد معظم محترم سرکار سید الفقہا علامہ سبط نبی کے سپرد کیا گیا۔ ہمارے گاؤں سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ان کا گاؤں تھا اور ہماری طرح وہ بھی زمیندار تھے۔ ساری آبادی سادات کی تھی۔ اس کا نام نوگانواں سادات ہے۔ وہ اتنے بڑے شخص تھے کہ سرکارِ ناصر الملت جیسا شخص بھی انہیں عالم سمجھ کے عزت کرتا تھا۔ گوشہ نشین اور خاموش آدمی تھے۔

اب تم دیکھو گھر سے ایک چھ سال کا بچہ میرے ساتھ ایک منشی ایک ملازم سونے کے کام کی مخملی ٹوپی، بہترین لباس، سلیم شاہی جوتا، چوڑی دار پاجامہ مولانا صاحب میرے باپ سے فرمانے لگے کہ یہاں تو فقیرانہ ماحول ہے۔ بوریے پر بیٹھنا پڑتا ہے اور دال وغیرہ کھانا پڑتی ہے۔ یہ بچہ تو شاید یہاں رہ نہیں سکے گا۔ انہوں نے کہا کہ نہیں میں اسے آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ مجھے ان کے سپرد کر کے چلے گئے۔ رات کو مجھے بخار ہو گیا۔

میرے ملازم یہ سمجھے کہ میں اب واپس چلا جاؤں گا۔ تم یقین کرو میں آرام سے اس بوریے پر بیٹھتا تھا اور تقریباً بارہ سال میں نے ان کی خدمت میں رہ کر تمام تعلیم مکمل کی۔ میرے استاد محترم اور اس بستی کے جملہ سادات کو میرے ساتھ بے حد محبت تھی۔ وہاں لکھنؤ کے فارغ التحصیل طلباء اور نہ جانے کہاں کہاں کے طلبہ اکٹھے تھے۔ عصر کے وقت ان کا درس ہوتا تھا۔ میں آ کے وہاں بیٹھ جاتا تھا۔ چھ سال کا بچہ، وہ پڑھتے رہتے، میں خاموش بیٹھا رہتا۔ پندرہ دن کے بعد میرے استاد نے ان سے پوچھا کہ آج سبق نہیں ہوگا۔ آج بتاؤ تم نے کیا پڑھا ہے؟ ان سے پوچھا: کوئی بتائے کوئی نہ بتائے۔ میں نے کہا: قبلہ میں بتاؤں۔ وہ تمام حیران ہوئے اور میں نے سب کچھ زبانی سنا دیا مگر اس کے معنی مجھے نہیں آتے تھے۔ عبارت سنا دی ساری کی ساری اور مجھے اب بھی یاد ہے اب تم بھی سن لو۔ (اور خطیب آلِ محمدؐ نے وہ ساری عبادت سنا دی۔ مرتب)۔

اب میں طلبہ سے کہتا ہوں کہ تم پڑھتے کیا ہو؟ تمہیں تو یاد ہی نہیں ہوتا۔ مجھے تو آج تک یاد ہے۔ اس سے میری شہرت ہوگئی۔ میں نے کہا کہ اب امتحان دوں گا۔ یونیورسٹی میں کچھ طلبہ امتحان بھی دیا کرتے تھے۔ میں نے منشی کا امتحان دینے کا مکمل ارادہ کر لیا۔ اب جب میرا فارم جانے لگا تو میری عمر کم نکلی، امتحان کے لیے۔ تو میں نے کہا کہ میری عمر اتنی لکھ دو کہ امتحان دے دوں۔ ابھی میرے بھائی کا لاہور میں انتقال ہوا ہے تو یہ وہ کچھ بتایا کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ بھئی اب اس قصے کو چھوڑو۔

تو میں یہ بتا رہا تھا کہ میں امتحان میں بیٹھ گیا جا کر۔ محسن بیٹے! مجھ سے میز کرسی پر بیٹھ کر لکھا نہ جائے بوجہ بچپن تو انہوں نے میرے لیے اور انتظام کیا۔ سنٹر والوں کو میری خاطر یہ کرنا پڑا۔ دنیا بھر نے میرے رول نمبر نوٹ کر لیے کہ یہ لڑکا پاس بھی ہوگا یا نہیں۔ تو میں امتحان دے کے آ گیا۔ مدرسے نہیں گیا۔ سیدھا گھر آ گیا اور آ کے کھیل کود میں لگ گیا۔ کھیل کیا تھا گھوڑے کی سواری۔ اس کا میں بہت شوقین تھا۔ اس کے علاوہ زمینداری میں دلچسپی لیتا۔ کھیتوں پر چلا جاتا۔ فارغ اوقات میں ڈیرے پر بیٹھتا۔ فرصت کے دن

تھے۔ سکون کی راتیں۔ اس وقت میری عمر سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ میرے بیٹے! وہاں سے نتیجہ آیا۔ میں بڑے اچھے نمبروں میں پاس۔ میری خوشی کی حد نہ رہی۔ میرے استاد خدا انہیں جوارِ سید الشہداءؑ میں جگہ دے بڑے خوش ہوئے۔ اس کے بعد منشی عالم کا امتحان دینے کا ارادہ کیا۔ میرے استاد نے کہا: چھوڑو! تم منشی عالم کی بجائے منشی فاضل کا امتحان دے دو۔ اتفاق سے آرڈر ہو گیا کہ یوپی کا کوئی آدمی پنجاب یونیورسٹی کا امتحان نہیں دے سکتا۔ جب تک وہ پنجاب کی سکونت اختیار کرے۔ میں نے الہ آباد یونیورسٹی میں امتحان دے دیا جو کہ وہاں ہمارے صوبے کی یونیورسٹی تھی۔ وہاں میں نے ''مولوی'' کا امتحان دیا۔ اس سال میرے ساتھ مولوی فاضل کا امتحان علامہ علی نقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دیا تھا۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ مولانا قمر الزمان نے مولوی عالم کا امتحان دیا، وہ فوت ہو چکے ہیں۔ بڑے پائے کے عالم تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی صاحبان تھے، یہ امتحان بھی میں نے پاس کر لیا۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: اس دور کی کوئی ایسی شخصیت جس سے آپ متاثر ہوئے ہوں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: اس زمانے کے جو اکابر تھے، اپنے اپنے فن میں ماہر تھے مثلاً علم فقہ و علم دینیات کے ماہر سرکار ناصر الملت تھے۔ ان کے سامنے کوئی شخص بھی کوئی شے نہ تھا۔ آقا ابوالحسن اصفہانی اور آقا بروجردی بھی اس شخص کے علم کے قائل تھے۔ نجف اشرف میں پانچ چھ صد علماء اکٹھے ہوئے۔ یہ میرے ہوش کی بات ہے۔ سرکار ناصر الملت کے کسی مقالے پر انہوں نے ''صدر المحققین'' کا خطاب لکھ کر انہیں بھیجا تھا۔ اور جب میں ایران گیا، آقائے مرعشی نجفی جواب بھی زندہ ہیں، ان سے ملنے گیا۔ میرا نوجوانی کا عالم تھا۔ اٹھارہ سال کے لگ بھگ میری عمر تھی۔ انہوں نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے دو چار باتیں کیں۔ انہوں نے مجھے قریب کر لیا۔ جب اور باتیں ہوئیں تو انہوں نے میرے لیے مسند بچھوا دی۔ باتیں اب مجھے یاد نہیں۔ میں اس مسند پر بیٹھ گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک کمرے میں چند علمائے کرام بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک میز رکھی ہوئی

ہے جس کے اوپر کتابوں کے ڈھیر رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے آقائے مرعشی سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے ہندوستان میں جو ناصر حسین نامی شخص ہیں، ان کے کچھ مضامین پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ یہ میں نے خود دیکھا ہے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: سرکار ناصر الملت سے آپ ملے ہوئے ہیں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: ہاں ملا بھی ہوں اور مختصر سا عرصہ ان کے پاس بھی رہا ہوں۔ ویسے ان سے ملتا جلتا رہتا تھا۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: سرکار ناصر الملت کو آپ نے عام گفتگو یا عام زندگی میں کیسا پایا؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: ان کی محفل میں علماء، سب ہوتے تھے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ میرا لڑکپن تھا۔ مجھے جرأت نہیں ہوتی تھی پوچھنے کی۔ البتہ میرے سامنے لوگ پوچھتے تھے نا سوال وہ میں یاد کر لیتا تھا۔ بوجہ لڑکپن کے ان کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ میں نے کبھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: اچھا ان کا اندازِ گفتگو کیا تھا؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: چوبیس گھنٹے میں صرف ایک گھنٹے کے لیے ملاقات کرتے تھے۔ تئیس گھنٹے مصروف رہتے تھے۔ ایک گھنٹہ ملاقات کا ہوتا تھا۔ ایک کمرہ تھا، ایک کونے میں وہ بیٹھتے تھے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ لگ کے آدمی بیٹھتے تھے۔ تو وہ سب سے پہلے جو آدمی ہے، چاہے کوئی بھی ہو، آہستہ سے فرمایا کرتے تھے ''فرمائیے'' اتنا آہستہ بولتے تھے کہ مشکل سے سمجھ میں آتی تھی اور لباس کپڑے کی ٹوپی جس طرح کی میں پہنے ہوئے ہوں، اس طرح کی اور ایک پٹکا پڑا ہوا تھا گلے میں۔ آہستہ سے۔ پہلے آدمی سے کہتے ''فرمائیے'' اس آدمی نے کوئی بات کی۔ اس کا جواب دیا۔ دوسرے آدمی نے سوال کیا۔ اب جب گھنٹہ پورا ہو گیا تو باقی کل۔ باقی سب جائیں اسی طرح میں بھی لوگوں میں بیٹھتا تھا۔ میں لوگوں کے سوال اور مولانا کے جواب سنتا تھا۔ وہ میں یاد کر لیتا تھا کہ انہوں نے کیا پوچھا ہے؟ اور انہوں نے کیا جواب دیا ہے؟

حمادِ اہلِ بیت: قبلہ ناصر الملت کی کوئی خاص بات ہو جو کسی نے پوچھی ہو اور انہوں نے

جواب دیا ہو؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: ایک فقرہ یاد ہے۔ دلائل تو یاد نہیں کسی نے سوال کیا۔ سرکار والا! لوگ پوچھتے ہیں یہ عقدام کلثوم کیا ہے؟

انہوں نے فقرہ جواب میں کہا:

معاذ اللہ این الکفر والاسلام این النور والظلام

''خدانخواستہ کفر واسلام کا کبھی رشتہ نہیں ہوتا۔ نور وظلمت میں کبھی تعلق نہیں ہوسکتا۔''

دو چار فقرے انہوں نے فرمائے، مجھے یاد ہو گئے۔ میرے ذہین ہونے کے وہ بھی قائل ہو گئے۔ مجھے لکھنؤ کے لوگ اور طلبہ جو اکثر بعد میں مجھے ملے، مبارک دیتے تھے کہ مبارک ہو تمہیں ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

ایک دفعہ گرمی کا موسم، سرکار نحیف آدمی، بانس کی لاٹھی، ہاتھ میں لے کر چلتے تھے۔ آہستہ آہستہ بات کرتے تھے۔ سولہ سال کے تھے کہ اپنے کتب خانے میں جاتے تھے۔ چھ گھنٹے کتب خانے میں رہا کرتے تھے۔ ۷۶ برس کے تھے جب فوت ہوئے۔ ایک دن ناغہ نہیں کیا۔ شیعہ، سنی اور ہندو سب آپ کو چلتی پھرتی لائبریری کہا کرتے تھے۔ کسی کتاب کا نام لے دو ہاں اس کے فلاں صفحے پر یہ لکھا ہے۔ اس قسم کا وہ انسان تھا ناصر الملت۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: آپ علامہ علی نقی سے بھی ملے ہیں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: اس زمانے میں بھی ملا تھا اور اب بھی ملتا ہوں۔ برصغیر میں اب سب سے زیادہ پڑھا لکھا انسان علی نقی ہے۔ میں نے جب مولوی کا امتحان دیا تھا، انہوں نے مولوی فاضل کا امتحان دیا تھا۔ اکٹھے ایک ہی سنٹر میں بیٹھے تھے۔ میری داڑھی وغیرہ نہیں آئی تھی۔ بالکل لڑکپن تھا۔ ان کے آ گئی تھی۔ یہ جوان تھے۔ ناصر الملت کا اپنا صاحبزادہ نصیر الملت بڑا ادیب مشہور تھا، عربی زبان کا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی پڑھانے والے ایک ادیب عربی کی ضرورت تھی۔ سرکار ناصر الملت سے کہا گیا کہ آپ کوئی عربی پڑھانے کے لیے

کسی شیعہ ادیب کا نام دیں تو انہوں نے علی نقی کا نام دیا۔ اپنے بیٹے کو نہ بھیجا۔

رات ڈھل چکی تھی۔ پچھلے پہر کے جاگنے والے ستارہ سحری سے ہمکلام تھے۔ حضرت خطیب آلِ محمدؐ کی ضعیفی اتنی طویل گفتگو کی متحمل نہ تھی مگر حماد اہل بیت کے سوال کرنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ خطیب آلِ محمد تھکن محسوس نہ کرتے بلکہ ہشاش بشاش تھے۔ دونوں شب بیدار سید محو گفتگو تھے۔ ماضی و حال ٹکرا کر مستقبل تراش رہے تھے۔ بحث جوبن پر تھی کہ سوالات کا رخ یکدم بدل گیا۔ حماد اہل بیت کا سوال خطیبِ آل محمدؐ کو چاندانی چونک سے برف خانہ چوک لے آیا۔ (صفدر ڈوگر)

حمادِ اہلِ بیت: آپ لاہور کب تشریف لائے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: ۲۳ دسمبر ۱۹۳۰ء کو ہندوستان سے لاہور پہنچا۔ یہاں امام باڑہ خواجگان نارووالی میں ایک جلسہ تھا۔ یہ معراج کے سلسلے میں تھے۔ میں پانچ منٹ شوقیہ منبر پر آیا۔ تازہ تازہ امتحانات دیئے تھے۔ نوعمری کا زمانہ تھا۔ جب پانچ منٹ پڑھا تو مجمع نے شور مچا دیا کہ ''ابھی اور ابھی اور'' میں نے چالیس منٹ پڑھا۔ یہ میرا خطاب اتنا مؤثر اور کامیاب تھا کہ میری پڑھائی پر ہی جلسہ کا اختتام ہوگیا۔ اس کے بعد پانی پت میں خواجہ تہور علی اور سید شریف حسین کے ہاں میں نے مجلس پڑھی۔ یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے۔

حمادِ اہل بیت: خطابت میں آپ کا استاد کون ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: میں فطری طور پر بولتا ہوں جو خدا نے مجھے دیا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی میرا استاد نہیں ہے۔

نظر ہے ابرِ کرم پر درخت صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو

حمادِ اہلِ بیتؑ: جب آپ لاہور آئے تو کیا لاہور میں رہائش اسی دن سے ہے یا بعد میں مستقل سکونت اختیار کی؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: ایک عرصہ بعد ۱۹۳۶ء میں، میں دوبارہ لاہور آیا۔ پنجاب میں تقاریر

کیں۔ امام باڑہ خواجگان کی دس تقاریر میرے تعارف کی وجہ بنیں اور ہر جگہ شہرت ہوگئی۔ اس کے بعد میں عراق چلا گیا اور زیارات سے واپسی جس دن ہوئی، اسی دن ڈاکٹر محمد اقبال کا انتقال ہوا تھا۔ یہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ اقبال ہی کے موضوع پر رات مولانا ظفر علی خان کی صدارت میں ''برکت علی ہال'' میں جلسہ تھا۔ یہ میری پبلک تقریر تھی۔ مولانا ظفر علی خان اس تقریر سے بڑے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد لکھنؤ ایجی ٹیشن ہوا۔ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ میں نے اس سلسلے میں پنجاب بھر میں تقاریر کیں اور میرا تعارف عام ہوگیا۔ ایک چہلم کی مجلس پڑھ کر امام باڑہ خواجگان سے واپس آ رہا تھا کہ میں نے دیکھا چند آدمی فرش پر بیٹھے ہیں اور ایک آدمی سوز پڑھ رہا ہے۔ پتہ چلا کہ مجلس ہے مگر کوئی خطیب ان کے پاس نہیں آیا۔

میں نے کہا کہ میں پڑھوں گا۔ دوسرے دن اعلان ہوگیا۔ خاصا ہجوم تھا۔ میں نے خطاب کیا اور یہاں اسی امام باڑے میں، میں نے بیس سال عشرہ بھی پڑھا۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: زیدی صاحب۔ آج میں آپ سے چند باتیں کھل کر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ایک دفعہ اس بات پر تقریر بھی کی تھی کہ امیر المؤمنین کی نہج البلاغہ کا ترجمہ یا تو میر تقی میرؔ کرتا کہ اس کے دل میں وہی گداز تھا چونکہ سید ہونے کی حیثیت سے اسے ورثے میں ملا تھا اور اس دور میں جس نہج پر آپ چلے ہیں، اگر علیؑ کے کلام کا ترجمہ زیدی کرتا تو لطف آتا۔

خطیبِ آلِ محمدؐ: یہ تمہارا حسن ظن ہے تم اپنی محبت کے پیش نظر ساری باتیں کر رہے ہو۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: یہ حقیقت پر مبنی باتیں ہیں۔ زندہ فلاسفر بھی رہتا ہے۔ مصیبت یہ پڑ گئی کہ اس قوم نے سب سے زیادہ نقصان یہ دیا کہ اس نے خطیبِ آلِ محمدؐ آپ کو بنا کے۔ علامہ سید اظہر حسن زیدی کے نام کے بہت بڑے پوسٹر چھپوا کے آپ کو بلایا۔ سینکڑوں آدمیوں نے اسٹیشن پر آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے تقریر کی اور چلے گئے اور چرچا ہوگیا۔ زیدی صاحب زندہ باد۔ وہ یہ تھا کہ ایک سمندر کو ایک ندی نے اپنی کشش سے خشک کر کے اس کے کناروں کو اپنے کناروں کے ساتھ ملا کے اپنے قطروں میں اس کے قطرے ڈال دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سیپ جو سمندر

کے تہہ میں تھے، وہ ریت میں دب گئے۔

خطیبِ آلِ محمدؐ: اب تک میرے خیالات کی، میرے ذہنی تصورات کی جو کبھی کبھی تنہائی میں میرے ذہن میں آتے ہیں، تم ان کی ترجمانی کر رہے ہو۔ میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ میں جو ہوں مجھے یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کچھ اور تھا اور میں کچھ اور ہو گیا۔ یہ میں خود بھی سمجھتا ہوں اور مجھے خود بھی اس بات کا اعتراف ہے اور اگر تم میری شروع میں آخر تک ساری زندگی دیکھو تو کچھ بہ حالت مجبوری اور کچھ باتیں غیر ارادی ہوتی رہیں۔ ورنہ میں خود جانتا ہوں کہ میں یہ نہیں تھا میں ہو گیا مگر میرے حالات ہی اس قسم کے ہو گئے تھے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: زیدی صاحب اسی بات پر آج بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اگر غالبؔ اپنے خطوط میں ان حالات کا اظہار کر سکتا ہے جن حالات کی وجہ سے غالبؔ وہ کچھ نہ کہہ سکا جو اسے کہنا چاہیے تھا تو آپ یہ بات کہہ کے ٹال کیوں دیتے ہیں؟ کہ کچھ حالات ایسے ہیں کچھ باتیں ایسی ہیں۔

خطیبِ آلِ محمدؐ: محسن بیٹے! میرے حالات ہی ایسے ہیں کہ میں بات کو ٹالنا ہی پسند کرتا ہوں۔ غالبؔ کا بھی مجھے پتہ ہے کہ وہ زندگی بھر رو کے مر گیا۔ اب اگر غالب پرستی کرو بھی تو کیا فائدہ؟ اور میرا بھی پتہ ہے یہی ہونا ہے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: آپ یہ باتیں کہ اگر آپ پاکستان نہ آتے۔ آپ رہتے بجنور میں یا لکھنؤ یا دہلی چلے جاتے تو کیا آپ خطابات کرتے۔

خطیبِ آلِ محمدؐ: پتہ نہیں۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: آپ نے الہ آباد یونیورسٹی کے علاوہ بھی کہیں باقاعدہ امتحان دیا ہے۔

خطیبِ آلِ محمدؐ: میں نے الہ آباد کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے بھی تمام اورنیٹل امتحان اعلیٰ درجے میں پاس کیے اور اس وقت تمام مدارس عربی میں میری ذہانت کی شہرت ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر دینی تعلیم و اصول و فقہ و علم کلام وغیرہ بھی حاصل کیے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: کیا آپ اپنے موجودہ مقام سے مطمئن ہیں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: میں ہر حالت میں مطمئن ہوں۔

حمادِ اہلِ بیت: کیا آپ ملت جعفریہ کے ارتقاء کی موجودہ رفتاء سے مطمئن ہیں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: میرے خیال میں قوم ارتقاء کی طرف بالکل نہیں جا رہی۔ خدا کرے یہ ارتقاء کی طرف روانہ ہو جائے اور اگر یہی حالت جمود کی رہی تو خدا جانے کیا ہوگا؟

حمادِ اہلِ بیتؑ: خطابت یا ذاکری کا آپ کے نزدیک معیار کیا ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: خطابت یا ذاکری کے لیے میرے نزدیک معیار صرف اور صرف علم ہے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: آپ کا پسندیدہ مؤرخ کون ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: ہر مؤرخ میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے، ویسے مجھے علامہ فخری پسند ہیں۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: آپ کی پسندیدہ کتاب کون سی ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: قرآن کے بعد نہج البلاغہ، صحیفہ کاملہ اور اُردو میں مراثی انیس۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: آپ کس کے مقلد ہیں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: آقائے سید کاظم شریعتمداری کے حکم سے آقائے بروجردی کی تقلید پر قائم ہوں۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: مفتی جعفر حسین صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: وہ بہت ذہین آدمی ہیں۔ میں بچپن سے انہیں جانتا ہوں۔ ادیب ہیں۔ پندرہ سال مولانا سبط حسن قبلہ کے ساتھ رہے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: آج کل کے ذاکرین کو آپ نے سنا ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: بہت کم سنتا ہوں۔ ویسے بھی جب فلمی طرز عام ہوئی ہے، میں نے سننا چھوڑ دیا ہے اور جب عزیزم صفدر ڈوگر نے الذاکر نکالا (جواب حکومت نے بند کر دیا ہے اور اس کی جگہ القائم کا اجراء ہوا ہے) تو مجھے ذرا سی یہ جھلک امید کی پیدا ہوئی کہ ان ذاکرین میں بھی۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ان میں بھی اہلِ علم اور اہلِ قلم موجود ہیں ورنہ میں تو ان سے مایوس ہو گیا تھا۔ اس رسالے سے پتہ چلا کہ ان میں اچھے آدمی پیدا ہو سکتے ہیں۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: قبلہ یہ بتائیں کہ شیعہ شاعری جو اس وقت چل رہی ہے ہمارے ہاں یا ہندوستان میں۔ یقیناً آپ کے پاس کتابیں وغیرہ آتی ہوں گی، مطالعہ کے لیے موجودہ دور میں شعراء کی جو ایک صف ہے، انہیں گاہے گاہے سننے کا موقعہ تو ملتا رہتا ہو گا مثلاً کئی رسالوں کی ادارت بھی آپ کرتے ہیں۔ تو ان میں سے آپ کو کون سا شاعر پسند ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: بھئی مجھے لاہور میں تو مشکور حسین یادؔ زیادہ پسند ہیں۔ ہنر یہ کہ شعر پڑھو۔ اس کے اندر چھپا ہوا حسن یا عیب، فوراً میری نظر اس پر پہنچتی ہے تو میں جب داد دیتا ہوں تو اس شعر پر نہیں دیتا بلکہ اس چیز پر دیتا ہوں جو اس کے اندر چھپی ہوئی مجھے نظر آتی ہے۔

دیکھو میرے بیٹے! ایک ہوتا ہے ناظم، اس نے الفاظ اکٹھے کر کے نظم کر لیا۔ چاہے غزل کی شکل میں ہو، چاہے رباعی کی شکل میں۔ ایک ہوتا ہے شاعر۔ شاعری چیز ہی اور ہے ناظم ہونا اور بات ہے۔ شاعری چیز ہی اور ہے وہ فوراً شعر کو سنتے ہی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ جب تک آدمی شعر اور نظم کا فرق نہیں جانے گا جب تک وہ شاعری نہیں سمجھ سکے گا۔

اب دیکھو ایک شعر ہے ؎

ہزار تہمتیں دنیا نے بخش دیں مجھ کو
میں آدمی تھا مگر چپ رہا خدا کی طرح

کوئی آدمی دادِ دے ہی نہیں سکتا۔ اس شعر کی جب تک اس کی شعریت تک کوئی نہ پہنچے۔ میں نے اس شعر پر عشرہ پڑھا ہے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: یہ کس کا شعر ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: یاد نہیں شاید محسن نے سنایا تھا۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: آپ کو یاد ہو گا کہ آپ ڈیرہ غازی خان آئے تھے اور میں نے آپ کو اپنا پہلا شاعری مجموعہ ''بندِ قبا'' دیا تھا۔

خطیبِ آلِ محمدؐ: ہاں! میرے پاس موجود ہے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: زیدی صاحب قبلہ ارباب منبر میں سے منبر پر آپ کو سب سے زیادہ اچھا کون سا خطیب لگا۔

خطیبِ آلِ محمدؐ: قبلہ سبط حسن سے زیادہ میں نے خوبصورت آدمی نہیں دیکھا۔ پہلے جب دیکھا میں چار پانچ سال کا تھا۔ اتنا حسین اور خوبصورت انسان میں نے نہیں دیکھا۔ پھر انہیں زہر دے دیا گیا۔ میرا اٹھارہ انیس سال کا سن تھا۔ میرے استاد مرحوم بھی موجود تھے۔ قبلہ سبط حسن کا رنگ سانولا ہو گیا تھا۔ اکاون سال کے سن میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ کوئی بڑی عمر نہیں۔ تقریر کا انداز بھی منفرد تھا۔ میں نے ان کی پانچ تقریریں سنی ہیں۔ ایک کم سنی کے زمانے میں جب انہیں زہر مل گیا تھا۔ لوگ انہیں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رویا کرتے تھے۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: مجالس کے علاوہ فارغ اوقات میں آپ کا شغل کیا ہے؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: تحصیل علم اور اس کو نوجوانوں تک پہنچانا۔

حمادِ اہلِ بیتؑ: نوجوان خطیبوں میں سے آپ کا پسندیدہ خطیب کون ہے؟ کس میں یہ جوہر ہے کہ اگر اسے سنوارا جائے تو وہ اسی سے توقعات وابستہ رکھی جا سکتی ہیں؟

خطیبِ آلِ محمدؐ: میرے خیال میں عزیزم سید عرفان حیدری عابدی میں یہ جوہر ہے کہ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

خلقِ عظیم

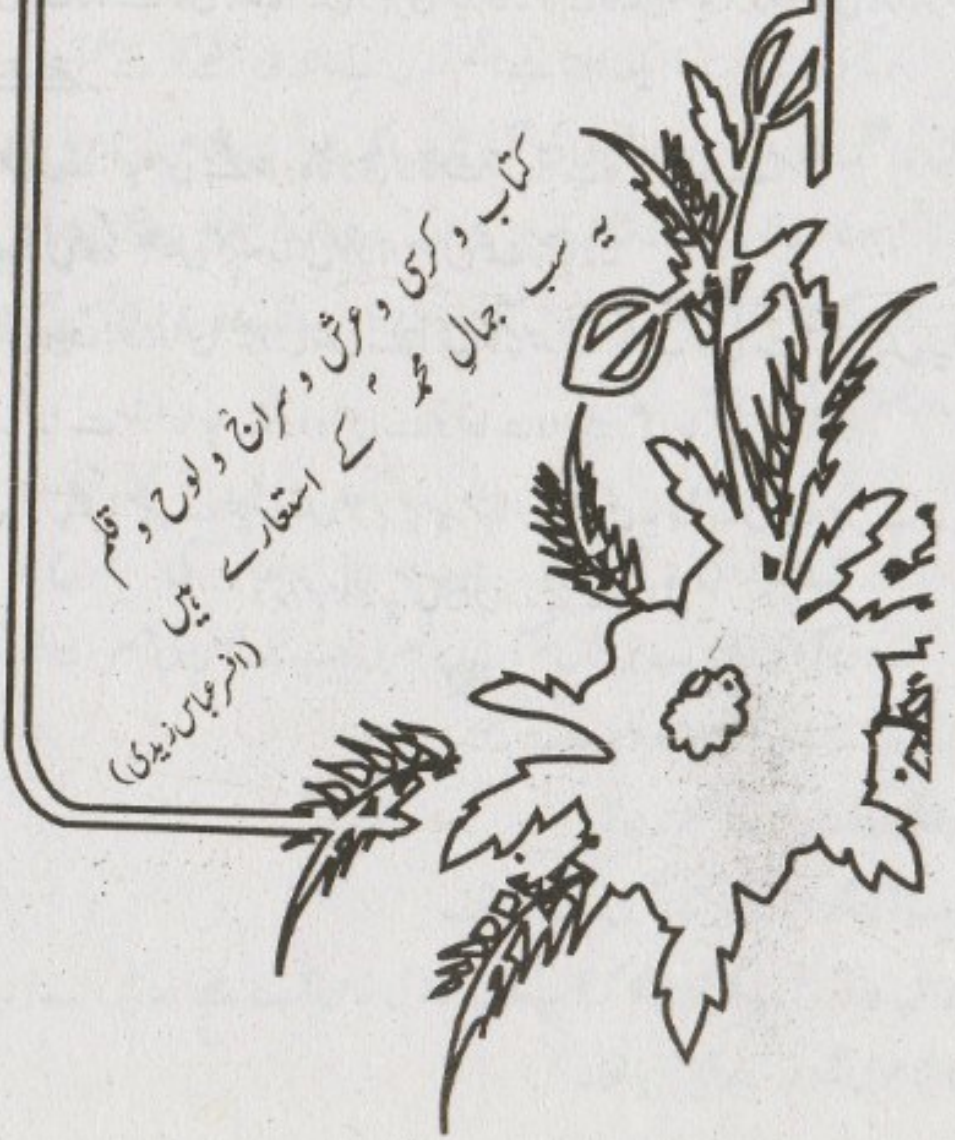

کتاب و کرسی و عرش و سراج و لوح و قلم
یہ سب جمالِ محمدؐ کے استعارے ہیں
(اختر عباس زیدی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے تھے:

''مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

انک لعلی خلق عظیم

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور اُسوہ حسنہ نے پوری نوع انسانی کو راہِ ہدایت دکھائی، اور انسانیت کو اس کے شرف سے بہرہ ور کیا۔ ہادی اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل انسان کی گردن میں کئی جھوٹے خداؤں کی غلامی کا طوق ہوتا تھا اور چار سو ظلم و نا انصافی اور عصیان کے اندھیرے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ ہیں وہ حالات کہ یکا یک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی۔ اور ہادی اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت اور تمام عالمین کے لیے رحمت بن کر تشریف لائے۔

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْن

حضورؐ نے اپنی پاکیزہ اور ارفع تعلیمات کے ذریعے زندگی کا نیا تصور پیش کیا۔ اللہ کی وحدانیت اور انسان کی برابری کی تعلیم دی۔ قبائلی نسبی اور خاندانی بڑائی کے انسانیت کش نظریے، بیخ و بن سے اکھاڑ کر عظمت اور بڑائی کی بنیاد اچھے اعمال اور اچھے اخلاق پر رکھی اور ظلم و نا انصافی کی ہر شکل کو ممنوع قرار دیا۔ آپؐ کے اثر انگیز ارشادات اور حیات افروز وعظ کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدیوں کے دشمن بھائی بھائی بن گئے اور غریبوں، کمزوروں اور زیردستوں کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار ٹوٹ گئی۔ زخمی اور غلام روحوں کو عظمت اور مسرت کے نئے افق نظر آئے۔ ظالم و جابر حکمرانوں کا تسلط ختم ہونے پر انسانی ذات اور شخصیت کو

نشو ونما کے نئے مواقع اور اسباب میسر آئے۔ جہالت کی جگہ علم وعرفان نے لے لی اور افلاس ومحکومی کے بدلے غنا اور آزادی کی روشنی پھیلنے لگی۔

ہادیٔ اعظم کی تعلیم نے پوری انسانیت کا رخ بدل دیا اور کرہ ارضی پر حریت و مساوات کا نیا سورج طلوع ہوا۔ کالے گورے اور عربی وعجمی کی تفریق ختم ہوکر اقوام ملل اخوت اور وحدت کے روح پرور رشتے میں منسلک ہوگئیں۔ سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حسنِ اخلاق کے وہ جوہر دکھائے کہ تمام اہل عرب عش عش کر اُٹھے۔ اور آپؐ کو صادق اور امین کہنے پر مجبور ہوگئے۔ جن میں اپنے، پرائے اور دوست دشمن سب ہی شامل تھے..... اس ضمن میں ایک مشہور واقعہ پیش کرتا چلوں۔

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی، تو مکے کے لوگ آپؐ کے خلاف ہوگئے۔ آپ جب بازاروں اور گلیوں سے گزرتے تو آپؐ پر پتھر مارتے اور کوڑا کرکٹ پھینک دیتے۔ ایک بوڑھی عورت کا یہ معمول تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے گھر کے نیچے سے گزرتے تو وہ آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیتی۔ آپؐ نگاہ اُٹھا کر مسکراتے ہوئے سر اور کپڑے جھاڑ لیتے۔

ایک دفعہ آپؐ اس بوڑھی عورت کے گھر کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ اس دن کوڑا کرکٹ آپؐ پر نہ پھینکا گیا۔ آپؐ حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ ضرور کوئی وجہ ہے کہ آج اس بوڑھی عورت نے کوڑا نہیں پھینکا۔ آپؐ نے اس کے گھر کا رُخ کیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی کون ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: میں ہوں محمدؐ۔ اس نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

بڑھیا کئی روز سے بیمار پڑی تھی۔ آپؐ نے پوچھا: اے عورت! کیا بات ہے؟ اس نے ڈرتے ہوئے کہا کہ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ میرا کوئی سہارا نہیں۔ میں نے کئی روز سے کچھ نہیں کھایا پیا۔ آپؐ نے اس عورت کو تسلی دی اور کہا کہ فکر نہ کر میں تیری خدمت کروں گا۔ آپؐ نے اسے دوا لاکر دی۔ کھانا کھلایا، پانی پلایا اور اجازت لے کر چلے

گئے۔ اس طرح کئی روز اس کی تیمارداری کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ عورت بالکل تندرست ہوگئی اور معافی مانگنے لگی کہ مجھے معاف کردیں۔ حضورؐ نے اسے معاف کردیا اور وہ عورت آپؐ کے حسنِ اخلاق دیکھ کر مسلمان ہوگئی۔

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آپ کی تمام انبیائے کرام اور مصلحین عالم سے ممتاز نظر آتی ہے۔ مکے کا معلم اخلاق پکار کر کہتا تھا: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (بقرہ) ''جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو؟'' حضورؐ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھے۔ اخلاق و عمل کا جو نکتہ آپؐ دوسروں کو سکھاتے تھے، خود اس کا عملی پیکر بن جاتے تھے۔

ان خلق رسول اللہ کان القرآن

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔''

موجودہ صحائف آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا ان کا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدعی ہے؟ قرآنِ مجید لاکھوں مخالفین اور اہلِ عناد کی بھیڑ میں اپنے داعی کی نسبت گویا ہے:

انک لعلی خلق عظیم ط

''اے محمدؐ! تم اخلاق کے بڑے درجے پر ہو۔''

تاریخ کہتی ہے کہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد پچیس برس تک آپؐ کے حرم پاک میں زوجیت سے مشرف ہو کر ہمدم و دمساز ہیں۔ آغازِ نبوت میں آپؐ کو ان الفاظ سے تسلی دیتی ہیں:

''ہرگز نہیں خدا کی قسم! خدا آپ کو غمگین نہ کرے گا۔ آپؐ رحم کرتے ہیں۔ مقروض کا بار اُٹھاتے ہیں۔ غریبوں کی اعانت کرتے ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے ہیں۔ مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔''

ام المؤمنین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے متعلق فرماتی ہیں کہ سرور کونین کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ برائی کے بدلے برائی نہ کرتے۔ بلکہ درگزر فرماتے تھے۔ آپؐ نے کسی سے ذاتی معاملے میں کبھی انتقام نہیں لیا۔ آپؐ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپؐ نے کبھی کسی غلام، لونڈی کو، کسی عورت کو، کسی خادم کو، کسی جاندار کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپؐ نے کبھی کسی کی درخواست رد نہیں فرمائی۔ آپؐ جب گھر تشریف لاتے تو نہایت خنداں، ہنستے مسکراتے ہوئے۔ دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔ رات کی تنہائیوں اور خصوصی اوقات میں اپنے دشمنوں کی اصلاح کے لیے دعائیں فرماتے۔ آپؐ نے کبھی کسی کے لیے بددعا نہ کی۔ آپ محسنِ اخلاق کے مجسم پیکر تھے۔ آپؐ نے زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاق کے وہ مایہ ناز نمونے چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک مشعلِ راہ رہیں گے۔ آپؐ نے ہمسایوں سے ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آنے کی تلقین فرمائی۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہمسائے کے بہت حقوق ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہمسایہ رشتہ دار سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

ہمارے سرکار اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسم عمل تھے۔ اپنا کام خود اپنے دستِ مبارک سے کیا کرتے تھے۔ سرکار دو عالمؐ اپنے پھٹے پرانے کپڑے خود سی لیتے۔ بکریوں کا دودھ خود دھو لیتے۔ اپنے جوتے خود گانٹھ لیتے۔ غرض گھر کا ہر کام خود کر لیتے تھے۔ حضور اکرمؐ نے ہمیشہ مساوات، بھائی چارے اور سادگی کا درس دیا۔ آپؐ نے بے جا مصرف اور فضول خرچی سے منع کیا اور فرمایا: میانہ روی اختیار کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ عفو و درگذر کی تلقین فرمایا کرتے اور کہا کرتے کہ مسلمانوں کے لیے بہتر ہے کہ دشمن کو معاف کر دے۔ اگر کسی سے غلطی سرزد ہو گئی ہو تو اسے درگزر کر دے۔ غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔ جس نے اپنے غصے پر قابو رکھا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر تمام دشمنوں کو معاف

کر دیا تھا اور یہاں تک کہ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کروانے والی عورت ہندہ کو بھی معاف کر دیا۔

تجارت میں آپؐ نے عملی طور پر حصہ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ آپؐ نے تجارت کے فضائل اور اصول بیان کیے۔ مسلمانوں کو تجارت کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا کہ سچا امانت دار تاجر قیامت میں انبیاء اور سچے لوگوں کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ آپؐ نے تجارت کے غلط طریقوں سے منع فرمایا۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے:

''ذخیرہ اندوزی کرنے والا لعنتی ہے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

''جس نے ذخیرہ اندوزی کی، وہ گناہگار ہے۔''

ملاوٹ کی مذمت کرتے ہوئے کہا:

''جس نے دھوکا دیا، وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔''

قربان جایئے اس محسنِ انسانیت اور رحمت اللعالمین کے جنہوں نے عملی طور پر مزدوری فرما کر مزدوروں کے حوصلے بلند کر دیئے اور معاشرے میں ان کو باعزت مقام دلوایا۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں حصہ لے کر آپؐ نے پتھر، مٹی اور گارا اُٹھانے والوں کی رہنمائی کی۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم سے زیادہ پتھر حضور اکرمؐ نے اُٹھائے تاکہ آنے والا مزدور آپؐ کا اُسوۂ حسنہ دیکھ کر احساسِ فرض کا حامل بنے۔

آپؐ نے فرمایا:

''مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔''

حضور اکرمؐ نے فرمایا:''

''علم کو طلب کرو خواہ تمہیں اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

''گہوارے سے لے کر قبر تک علم حاصل کرو۔''

ایک اور مقام پر تمام مسلمانوں پر علم دین کا طلب کرنا فرض قرار دیا۔

آپؐ نے فرمایا:

''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، تا کہ تمہارے اخلاق کو مکمل کر دوں۔''

حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمیشہ بچوں سے پیار تھا۔ وہ بچوں سے محبت کرتے اور شفقت سے پیش آنے کی تلقین فرماتے۔ آپ کو بچوں سے اتنا پیار تھا کہ آپ جب کبھی بچوں کے قریب سے گزرتے تو کمالِ شفقت سے ان کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

''والدین اپنے بچوں کو جو سب سے قیمتی اور اعلیٰ تحفہ دے سکتے ہیں، وہ بچوں کی اچھی تربیت اور اچھی عادتیں پیدا کرنے کا تحفہ ہے۔''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ لوگوں کو خدا کی راہ میں خیرات کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت ام سلمیٰؓ فرماتی ہیں: ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں رنجیدہ تشریف لائے۔ میں نے رنجیدگی کا سبب پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا: ام سلمیٰ! کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہوگئی تھی، وہ میرے بستر پر پڑے رہ گئے، خیرات کرنے میں دیر ہوگئی۔

دنیا سے رحلت کے وقت جب آپؐ بیمار تھے تو آپ کو خیال آیا کہ چند اشرفیاں گھر میں موجود ہیں۔ آپؐ نے انہیں خیرات کا حکم دیا۔ فرمایا: جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ میں اس سے رخصت ہو کر جب اپنے رب سے ملوں تو اس وقت میرے گھر میں اشرفیاں موجود ہوں۔

ظہور

حضرت قائمِ آلِ محمدؐ

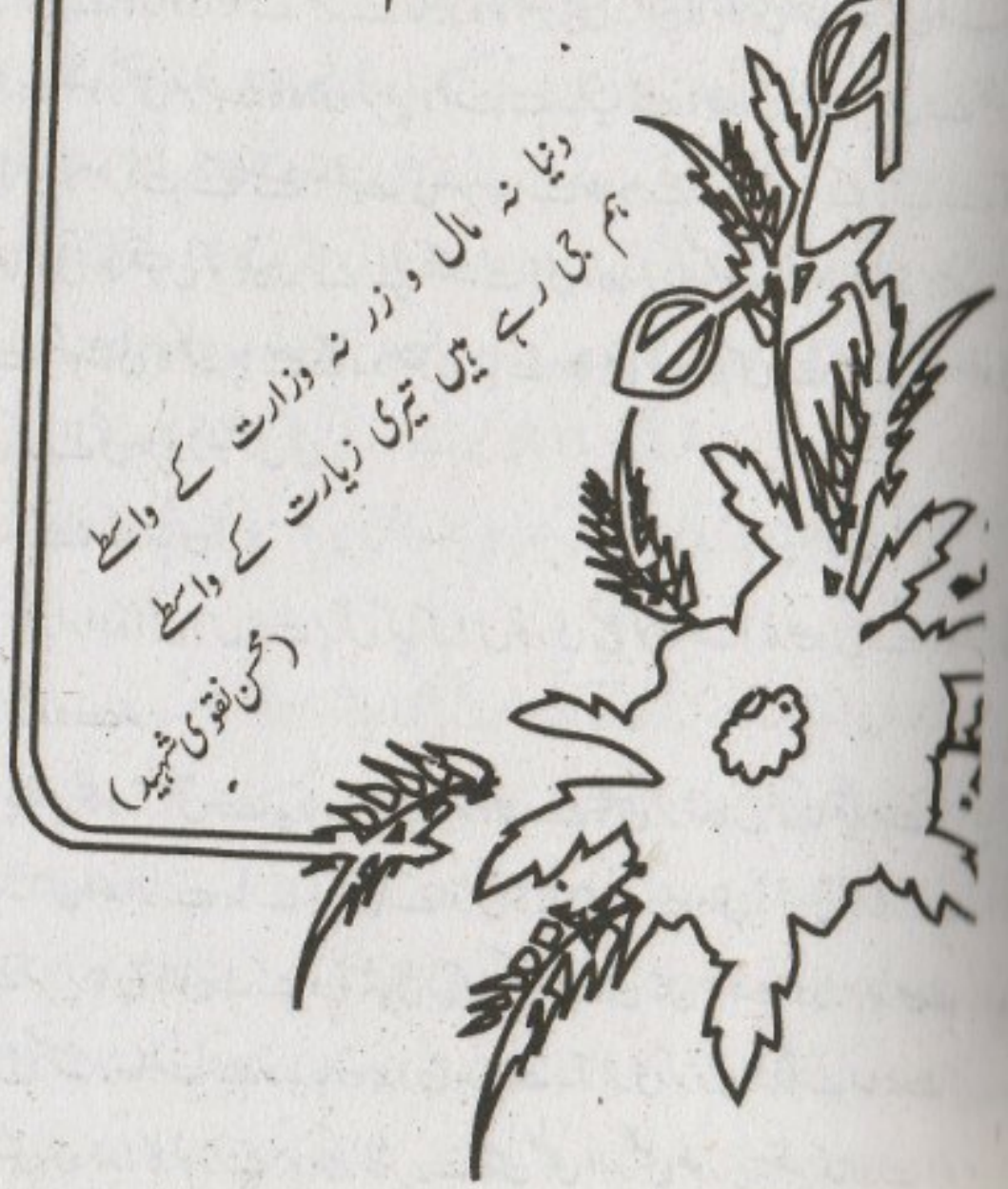

دنیا نہ مال و زر نہ وزارت کے واسطے
ہم جی رہے ہیں تیری زیارت کے واسطے
(محسن نقوی شہید)

حضرت قائم آل محمدؐ

یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون○

خدائے بزرگ و برتر کی نعمتیں اور رحمتیں مخلوق پر بے حد و بے شمار ہیں۔ انسانی طاقت ان کے شمار اور ادائے شکر سے عاجز و قاصر ہیں۔ ان لامتناہی نعمات میں سب سے عظیم نعمت حضور ختمی مرتبتؐ کا وجود سراپا رحمت ہے۔ یہ اتنا بڑا خدائی انعام جس نے مخلوق کے عرفان و معرفت کے سلسلے خلقیت کی سرحد سے ملا دیئے۔ عالمین کے رب سے آشنا کیا۔ طاغوتی طاقتوں کو ہمیشہ کے لیے شکست دی اور پورا صحن عالم خدائے بزرگ کی باجبروت و شہنشائی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ دستور دنیا کے مطابق شرار بولہبی نے چراغ مصطفوی کو خاموش کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔

سمجھے ناصاحبان!

مگر ارادۂ الٰہی اس بات پر تل گیا کہ اس نوری شمع کو مخالف آندھیوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کردے۔

چنانچہ قادر مطلق نے یہ بارہ حجاب نور جن سے چھن کر شعاع محمدؐ تا قیامت نور پاش رہے گی۔ اس انداز سے بنائے کہ اُن کے اوّلؑ کا جو انداز ہے وہی آخریؑ کا ناز ہے۔ اگر اوّلؑ کے سر پر تاجِ ولایت ہے تو آخریؑ کے پیکر موزوں میں خلعت دوام ہدایت ہے۔ ذاتِ محمدی ختمۂ رسالت ہے تو یہ بارہ بروجِ ہدایت۔ آخری گردش آفتابِ امامت ہیں۔ یہی وہ خدا کا نور ہے جو پیکر بشریت میں علمی اور عملی طور پر مظہر کمالاتِ الوہیت

ہے۔

یہ سلسلہ قبل ازل سے شروع ہو کر اخیر ابد تک دائم و قائم ہے۔ خلاقِ عالم نے ایک ایسی جماعت پیدا کی ہے جن کے دل و دماغ ان عصمت پوش ذواتِ قادسیہ کے انوار مودّت سے جگمگا رہے ہیں اور اس جماعت پر خدا کا فضل ہے کہ وہ محبتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کو دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز اور عاقبت میں واحد ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور اپنا جان و مال اور اولاد، عزت آبرو ہر شے اُن کے عشق میں قربان کر دینا سب سے بڑی سعادت جانتے ہیں۔ اُن کی خوشی میں خوشی اُن کے غم میں غم منانا یہی ان کا ایمان ہے اور اسی پر اُن کے دین کی حیات کا دارومدار ہے۔

سن رہے ہیں نا صاحبان، آپ میری بات!

چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ پاکستان کے عظیم تاریخی شہر لاہور میں پورا رجب کا مہینہ حضور تاجدار ولایت کی پُرشکوہ آمد کے جشن ہائے مسرت سے جگمگا تا رہا۔ نعرہ ہائے حیدری کی گونج آسمانی فضاؤں میں گونجتی رہی اور ولائے ساقی کوثر کے متوالے تشنگانِ معرفت کو مے خانہ اَلست کے ساغر پلاتے رہے۔ برقی روشنیوں میں دلوں کا نور دونوں مل کر دین و دنیا کی برکت سے صاحبانِ توفیق کو مالا مال کرتے رہے۔ ابھی ماہ رجب کی ایمان افروز فضا صحن عالم میں ضیاء پاشی کر رہی تھی کہ اچانک افق پر ماہ مبارک شعبان کا ہلال نمودار ہوا۔

شعبان وہ مہینہ ہے کہ اس کی کوئی تاریخ بھی جانثارانِ آلِ محمدؐ کے لیے یوم غم نہیں۔ تیسری شعبان شہید اعظمؑ کی ولادت کی عید ہے اور اس پُرمسرت تقریب میں خوشی کے آنسو آجانا تقاضائے محبت ہے۔ چار شعبان سے ہی پوری دنیائے مودّت چودھویں بدر کامل کے لیے سراپا انتظار ہوتی ہے تو صاحبان ادھر آسمان پر چاند بڑھتا رہے، ادھر ماہتاب برج عصمت کے شوقِ دید میں اہل ایمان کے چہروں پر نور اور دل میں سرور بڑھتا ہے۔ زندہ دلانِ لاہور حدیث عشق سننے کے لیے معتبر "راوی" کی تلاش میں گھروں سے نکل

پڑتے ہیں اور مسرت و کامرانی کے لمحات گزارنے کے لیے اثنا عشری متوالے کامران کی بارہ دری میں ''راوی'' کے قدموں میں ہمہ تن گوش ہو کر جا بیٹھے اور مرد قلندر کی عاشقانہ کاوشوں نے جنگل میں منگل کر دیا۔

بابِ مدینہ علم کے آستانہ اقدس پر سر جھکانے والوں کو مسلسل بارہ دروازے نظر آئے، ہر دروازہ جنت کا باب اور حلِ مشکلات کے لیے عملِ فتح بابِ محمدیؐ سے عباسی دروازے تک نور کا سماں تھا۔ فطرت نکھر گئی تھی۔ فضائیں ضیاء پاشی انوار سے جگمگا گئیں۔ راوی کا پل صراط مستقیم کا راہبر بن گیا اور ایک ویران درختوں کا جھرمٹ دیکھتے ہی دیکھتے رشک فردوس بریں ہو گیا۔ حورانِ جنت، جنت کے دریچوں سے محوِ نظارہ، چشمہ کوثر امواجِ راوی سے ہم آغوشی کے لیے بے چین۔ ساکنانِ عرش و کرسی اپنے مصلی نور چھوڑ کر زمین پر شہنشاہ ارض و سماء کے استقبال کے لیے حاضر ہو گئے۔

کائنات کا ذرّہ ذرّہ ''اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِہٖ'' کی تسبیح پڑھنے لگا۔ راوی کا کنارہ رشک عرش بریں ہو گیا۔ پوری فضا روحانیت سے معمور ہو گئی۔ کہیں نعرہ ہائے درود وسلام۔ کسی طرف رکوع و سجود و تسبیح و تحلیل کی فضا کہیں یاصَاحِبَ الْعَصْرِ وَالزَّمَانِ اَدْرِکْنِیْ کا نورانی اور روحانی سرور۔ ایک طرف نوجوانانِ ملت کی محفل قصیدہ خوانی کا شباب دوسری طرف علمائے اعلام کا عرفانی خطاب اور حد نظر تک پھیلے ہوئے مجمع کی نگاہوں کا مرکز۔

اس مے خانے کا ساقی خاکساری میں غلام ابوتراب۔ شہرت میں نواب ابنِ نواب۔ عالم کے لیے باعثِ برکت و فراخ فال۔ محفل ایمان کے لیے مرد خوش اقبال۔ میں نے بھی جا کر عرض کیا: آج یہ کیا منظر ہے؟ کہ جس کے نظارے میں چودھویں کا چاند ادب و سکوت کے ساتھ محو ہے۔ دنیا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور عالم کی نبضیں حدِ اعتدال پر آ گئی ہیں۔ پوری کائنات ایک دوسرے سے گلے مل کر فرحتِ مسرت سے جھوم کر یہ مژدہ جانفزا سنا رہی ہے۔

ہوئی کعبہ میں اذاں صبح کا تارہ چمکا
بارھواں برجِ امامت کا ستارہ چمکا

سفینہ آلِ محمدؐ میں سوار ہونے والے! اپنی نجات کے عریضے لے کر کشتی ایمان میں سپرد کرنے کے لیے پورے ادب واحترام سے کھڑے ہیں۔ میں نے بھی ادب سے عرض کیا: حضور عالم پناہ!

صبح کے وقت ادا کر کے فریضہ ساقی
پیش کر دے ابھی میرا بھی عریضہ ساقی

مومنین عالم کو عموماً اور لاہور خصوصاً جشن ولادت مبارک ہو اور اس ولادت کی برکت سے یملاء اللہ الارض قسطا وعدلا کما ملئت ظلما وجورا۔ اللھم صلی علی محمد و آل محمد

عظمتِ

حسین علیہ السلام

عظمتِ حسین علیہ السلام

اسلام اور انسانیت مترادف لفظ ہیں۔ خلاق عالم کی قدرت کامل نے انسان کو عجیب وغریب صفات سے متصف کر کے صحنِ عالم میں بھیجا ہے۔ نیابت اللہ وخلافت ارضی کا امانت دار انسان جہاں عزت وشان کی اعلیٰ منازل پر فائز ہے اور تمام مخلوق عالم من جانب اللہ انسان کی اطاعت پر مجبور ہے۔ کرہ ہائے آسمانی کی عظمت سے لے کر ادنیٰ سے ادنی چیز تک انسان کی مطیع، خدمت گذار اور تابع فرمان ہے۔ انسان نے عقل خداداد کی طاقت سے قوائے عالم کو مسخر وتابع بنا کر ''وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا'' کی عملی تفسیر اپنے بے پناہ عزم وارادے سے مکمل کر دی ہے اور صنفِ انسانی اس تسخیر کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ومشغول ہے، مگر یہ انسان جہاں اعلیٰ صفات برگزیدہ اخلاق کا نمونہ کامل ہے اس کے ساتھ ہی شر کی مخفی طاقتیں بھی انسانی جدوجہد کے ساتھ مشغولِ عمل ہیں۔ عجوبہ خلقتِ انسانی شر کی طاقتوں کے سامنے باوجود ملکی صفات ہونے کے اکثر وبیشتر سپر انداختہ سرنگوں ہو جاتا ہے۔ طاغوتی لشکر ہمیشہ انسانی ضمیر کو شکست دینے پر آمادۂ پیکار و رزم رہتا ہے۔ خداوند عالم اپنی رحمتِ کاملہ سے انسان کو طاغوتی طاقتوں کی یلغار سے محفوظ ہونے کا انتظام فرماتا رہتا ہے۔

انبیاءؑ ورسلؑ کے سلسلہ عالیہ اور دماغِ انسانی میں عقل دوراندیشی کی مشعل اسی لیے ہے کہ ان قدرتی طاقتوں سے مدد لے کر انسان ''اَسْفَلُ السَّافِلِيْن'' کی دلدل سے نکل کر ''منابنی آدم'' کی معراج کو پہنچے۔ یاد رکھیے! قانونِ اسلام درستی کا ذمہ دار ہے۔ اسلام کی تعلیم اور اس پر عمل تہذیب، اخلاق، تدبیر، منزل، سیاستِ مدن وہ زریں اور قیمتی

اُصول اپنے دامنِ رحمت میں لیے ہوئے ہے کہ جس نے آنکھ جھپکنے میں ایک وحشی محض قوم کو معلم اخلاق واستادِ انسانیت بنادیا تھا۔

اسلام کی فطری آسان سہل مزاجی کی وجہ سے، انسانی تعلیم وتبلیغ نے دشت وصحرا، بحر وبر، کوہ وادی میں ''اسلام زندہ باد'' کی خدائی آواز بلند کرادی تھی۔ پیغمبر اسلامؐ کی جاذبیت ہر خشک وتر، بلند وپست یگانے بے گانے سے کلمہ پڑھوانے میں کامیاب ہوگئی۔ عرب کا فرزندِ صحرا اس فطرت سے جلد مانوس ہوگیا اور ہادی اعظم اس پیغام مکمل کو اتمام تک پہنچا کر نعیم دائمی کی طرف انتقال فرما گیا۔

آپ میری بات سمجھ بھی رہے ہیں ناصاحبان؟

بات ذرا دور چلی گئی تو میں عرض کررہا تھا وہ ہادی انتقال کرگیا، مگر اتنی عظیم الشان تعلیم اور آخری خدائی پیغام کو دنیا کے ذہن نشین کرانے کے لیے ابھی اور عصمت پوش معلمین الٰہی کی ضرورت تھی، جو اپنے علم وعمل سے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مؤمن کامل بنا دیں۔ ابھی لوحِ دماغ پر اسلام کا نقش سادہ ہی تھا۔ قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج اور فتوحات ملکی کی ہوائے نخوت نے اسلام کی سادگی کی جگہ لے لی۔ خلافتِ راشدہ تک ظاہری لباس کسی قدر جسمِ اسلام پر باقی رہا، مگر اس دور کے بعد ملوکیت واستبداد پوری شان سے جلوہ گر ہوگیا۔ قصرِ حکومت اسلامی تعلیم اور خدا کی بجائے ''السلطان ظل اللہ'' کے نعروں سے گونجنے لگا۔

اسلام کے نام پر وہ بدعتیں ہوتیں کہ کفر بھی جن سے شرما جائے۔ زبان ودل کی ہم آہنگی رخصت ہوگئی۔ نفاق نے ایمان کا روپ دھار لیا۔ احکامِ الٰہی کا مضحکہ ہونے لگا۔ زبانی وعوامی اسلام عین ایمان بن گیا۔ اعمالِ صالح کی ضرورت بے ضرورت ہوگئی۔ علماء راہزن اور ذمہ دارانِ مذہب دین فروش بن گئے۔ تہذیب انسانی نے سر پیٹ لیا۔ قانونِ الٰہی بالائے طاق رکھ دیا گیا۔

یہ سب کچھ بانی اسلامؐ کے صرف چند سال بعد حریم خلافت سے اُٹھی ہوئی نخوت و

غرور، بداعمالی وسفاکی کی سیاہ آندھی چراغِ حرم کو بجھاتی ہوئی شمع دین وملت کو گل کرتی ہوئی دنیا اسلام پر چھا گئی۔ آئین الٰہی بحکم خلیفہ غرق مے ناب ہو گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ بداخلاقی، اخلاق، بے دینی، دین، بے ایمانی، ایمان، بے حیائی، عفت، انکارِ معبود عبادت ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں زبانوں پر مہریں لگ گئیں اور قوائے عمل مفلوج ہو گئے۔ آخر غیرت خداوندی نے اس نازک دور کے لیے جبکہ کفر اسلام بن کر ہم رنگ زمین دام میں دنیا کو پھنسا رہا تھا اپنے قاعدہ جاریہ کے مطابق توفیق الٰہی و تائیدی غیبی کو بشکل حسینؑ دنیا کے سامنے پیدا کیا۔

کون حسینؑ؟ جو اَبی طالبؑ محافظِ رسول کا پوتا اور خدیجۃ الکبریٰؑ کا نواسہ، فاطمہ بنتِ اسد نبیرۂ جلیل اور آبِ وحی میں دھلی ہوئی زبانِ رسالت چوسنے والا، اسلام کے فاتح اعظم اسد اللہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کا فرزند میدانِ عمل میں آیا، چونکہ رنگ الحاد زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ عوام دین کے نام پر بے دین ہو رہے تھے اور شر خیر کا لبادہ اوڑھ کر شرارت پھیلا رہا تھا، اس لیے اس کو روکنے کے لیے اہم ترین اقدام کی ضرورت تھی۔

کسی مصلوب کے ہاتھوں میں ٹھکی ہوئی چند کیلیں اور محض کسی نبی زادے کا چھری کے نیچے آ جانا اس انقلابِ اعظم کو روک نہ سکتا تھا۔ ضرورت تھی کہ اس بڑی ہنگامی مصیبت عظمیٰ سے روکا جائے اور اس تخریبی انقلاب کو ذبح عظیم سے دبایا جائے۔

سمجھے نا، میرے محترم سامعین!

فرزندِ رسولؐ اسی دن کے لیے آغوشِ رسالت میں پل کر پروان چڑھا تھا۔ حسینؑ کی عظیم القدر قربانی نے خیر وشر میں حد فاصل قائم کر دی۔ ایمان و بے ایمانی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ حریت فکر و دماغ از سر نو پیدا کی۔ علماء میں اجتہاد اور عوام میں طاغوتی طاقتوں کے خلاف جذبۂ جہاد پیدا کیا اور آج تک جو اسلام کے نام پر کسی قدر نیکی دنیا میں موجود ہے وہ اسی بطلِ جلیل کی شہادت عظمیٰ کا صدقہ ہے۔ مگر آج پھر دین کا نام تہذیب اور اسلام دشمنی کا نام خدمتِ دین ہو گیا ہے۔ علماء بے عمل، حکام بے عدل اور

عوام شتر بے مہار بن گئے ہیں اور کلمہ گویوں کے خلاف فتویٰ کفر ہے۔

آج زمانے کے بے شمار یزید دین کو ختم کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اتحاد واتفاق اسلامی عنقا ہو گیا ہے۔ پابندی احکام الٰہی کا نام حماقت اور خدا اور رسولؐ کے احکام دفتر پارینہ بن گئے ہیں۔ مسلمان کہلانے والے معاشرے میں یہود، تمدن میں ہنود، چمک دم میں عیسائی اور برادر کشی وفتنہ پروری میں شہرہ آفاق ہو چکے ہیں۔ روحِ مذہب فنا ہو چکی ہے۔ کچھ آثارِ رسم ورواج آثارِ قدیمہ کے طور پر حائل بہ انہدام باقی ہیں اور بس آج بھی ایمان کی روح، ہدایت کی تڑپ، توفیقِ الٰہی وتائید ایزدی کی ضرورت مشعلِ عقل وخرد ہاتھ میں لے کر حسینؑ کے رخِ زیبا کو تلاش کر رہی ہے۔ اس زمانے کا حسینؑ پردۂ غیب سے آئے تو پھر دنیا عدل وانصاف سے پُر ہو جائے

آج پھر تیری زمانے کو ضرورت ہے حسینؑ

حسینیت

فضائل ..... حسینیت

مصائب ..... دربارِ شام

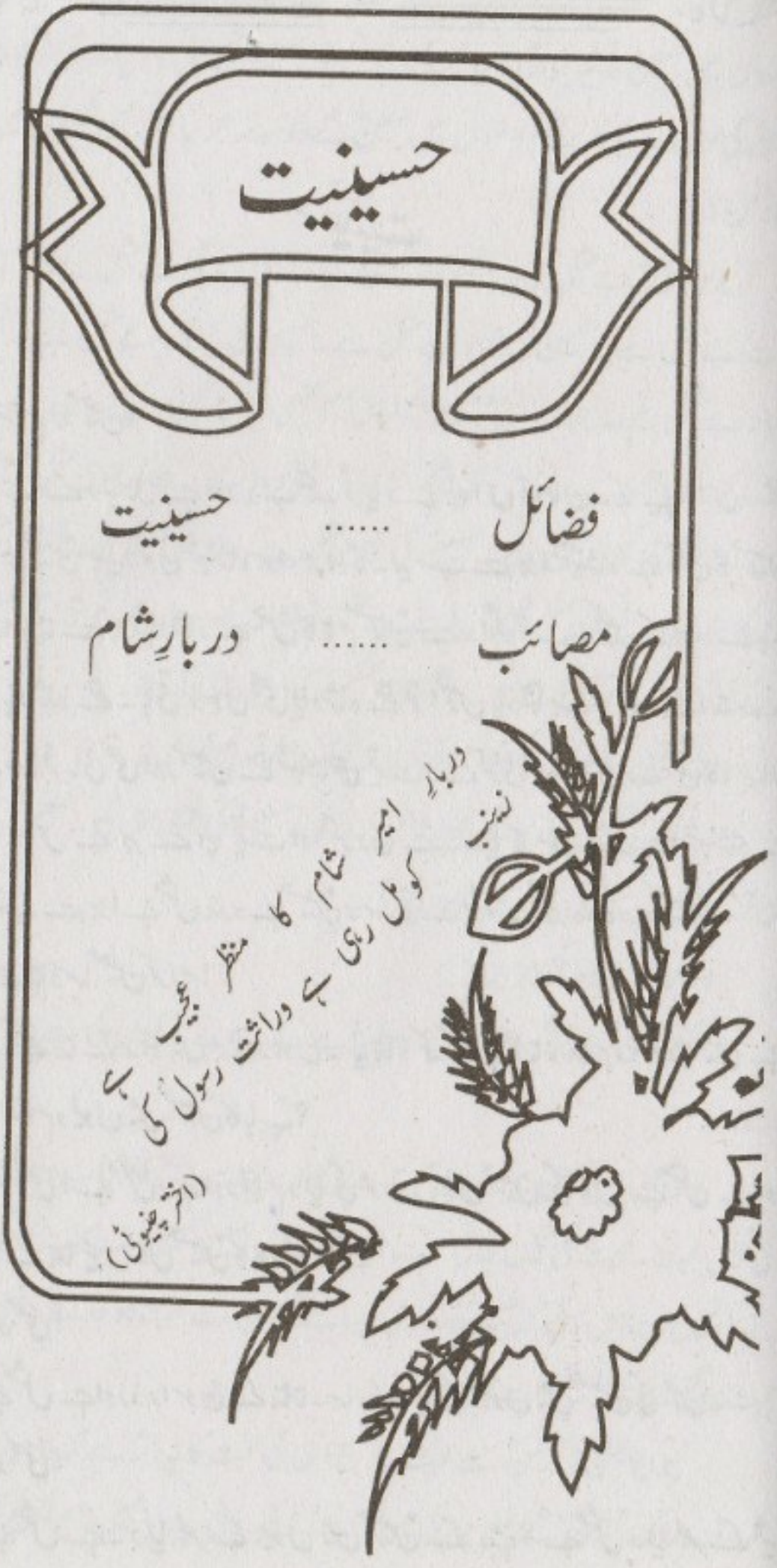

حسینیت

محترم سامعین!

جب سے دنیا بنی ہے اور جب تک دنیا رہے گی اس آسمان کے نیچے، اس زمین کے اوپر، نہ حسینؑ جیسا کوئی شہنشاہ ہوا، نہ ہوگا۔ یہ سب سے بڑا شہنشاہ ہے جس کا حسینؑ نام ہے۔ سب سے بڑا بادشاہ ہے جس کا نام حسینؑ ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ہمارے باقی آئمہؑ بھی بادشاہ تھے۔ باقی رسول بھی بادشاہ تھے تو انہیں بادشاہت وحکومت اللہ نے ازراہ کرم عطا فرمائی تھی اور حسینؑ نے شہنشاہی قیمت دے کر لی تھی۔ اس نے کسی کا احسان نہیں رکھا۔ اس نے ہر شے کی قیمت ادا کر دی ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ ہے حسینؑ۔ سب سے بڑا بے مثل بندہ ہے حسینؑ۔ سب سے بڑا بے نظیر بندہ ہے حسینؑ۔

مجھے بتاؤ سامعین کرام!

تم مجھے بتاتے رہو میں بولتا رہوں۔ یہ بتاؤ کہ حسینؑ کا نانا تمام رسولوں میں بے مثل ہے؟ تمام ولیوں میں حسینؑ کا باپؑ؟

بولو بھئی! بے مثل ہے اور تمام دنیا کی عورتوں میں حسینؑ کی ماںؑ بے مثل ہے اور ساری دنیا کے بھائیوں میں حسینؑ کا بھائی حسنؑ۔

بولو بھئی!

بے مثل ہے اور ذرا سوچ کے بتانا۔ ساری دنیا کی بہنوں میں حسینؑ کی بہن۔

بولو بھئی!

بے مثل ہے۔ دنیا بھر کے بیٹوں میں حسینؑ کے بیٹے؟ بے مثل دنیا بھر کے شیر

خواروں میں حسینؑ کا شیر خوارؑ؟ دنیا بھر کی بیٹیوں میں حسینؑ کی بیٹیؑ؟ دنیا بھر کی فوجوں میں حسینؑ کی فوج۔ دنیا بھر کے دوستوں میں حسینؑ کے دوست؟ دنیا بھر کے دشمنوں میں حسینؑ کے دشمن؟

بولو بھئی! بے مثل ہے یا نہیں؟ حسینؑ کی ساری زندگی بے مثل ہے؟ حسینؑ کی موت بے مثل ہے۔ حسینؑ کی نماز بے مثل ہے۔ حسین کی یادگار بے مثل ہے۔ حسینؑ کا دربار بے مثل ہے۔ جہاں اتنی ''بے مثالیاں'' اکٹھی ہو جائیں اس بندے کے لیے بے تکلف کہہ دو۔ ''حُسَین لَیسَ کَمِثلِہٖ شَیءٌ'' تو وہ انسان ہے کہ تیری مثل کہیں ہے ہی نہیں۔ نہ اللہ کی کہیں مثل ہے نہ حسینؑ کی کہیں مثل ہے۔ اس کی اللہ ہونے میں مثل نہیں اس کی بندہ ہونے میں مثل نہیں۔ ایسے بے مثل شہنشاہ کے دربار میں تم آ کے بیٹھے ہو۔ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ اتنے بڑے شہنشاہ اعظمؑ کے دربار میں آئے۔

اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ اللہ تمہارے آنے کو قبول فرمائے۔

اب میں تمہیں چار باتیں اور عرض کر دوں، حسینؑ کی شہنشاہی کی۔ حسینؑ کے دربار میں آنے کی۔ حسینؑ کی خدمت میں پہنچنے کی۔

دیکھو بھائیو! دیکھو عزیزو!

کہو ہمیں حسینؑ سے محبت ہے۔ یقیناً ہے۔ آپ نے یہ کیوں کی ہے؟ یہ محبت حسینؑ سے۔

بولو بھئی! یہ حسینؑ سے محبت آپ نے کیوں کی ہے، اس کا جواب دو مجھے۔ ہم نے کی نہیں محبت۔ محبت کی نہیں جاتی محبت ہو جاتی ہے۔ ہمیں حسینؑ سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم نے کی نہیں ہے اس لیے کہ حسینؑ بندہ ہی ایسا ہے کہ اس سے محبت ہو جائے۔ اس سے ہمیں محبت ہو گئی ہے نا! حسینؑ سے محبت۔

کیوں بھئی! حسینؑ سے محبت۔ آج اس کی محبت کا یہ اثر ہے کہ لاہور شہر کی ایک معروف سڑک حسینؑ کے نام پر رکی ہوئی ہے۔ رکی ہوئی ہے یا نہیں؟ پولیس کھڑی ہے۔

ادھر بھی، اُدھر بھی۔ میں آیا تو میں نے دیکھا ادھر بھی پولیس کھڑی تھی ادھر بھی پولیس کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا پولیس کے جوانو! کیوں کھڑے ہو؟ یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہو؟ کہ بھئی آج حسینؑ کا دربار لگا ہوا ہے۔ ہم اس انتظام کے لیے کھڑے ہیں کہ کوئی خرابی پیدا کرنے والا نہ آجائے کوئی گڑبڑ کرنے والا نہ آجائے۔ بس پولیس نے مجھے یہ بیان کیا اور وہیں مجلس ہوگئی کہ واہ رے حسینؑ! واہ آج پولیس اس لیے کھڑی ہے کہ تیرے دربار میں بدنظمی نہ ہو اور ایک دن پولیس اس لیے کھڑے تھی کہ دربار میں کہ بازار والو آؤ آج حسینؑ کی بہن آرہی ہے۔ بازار والو آؤ دیکھو! حسینؑ کا کنبہ آرہا ہے۔ اس دن بھی پولیس بازار میں تھی۔ آج بھی پولیس بازار میں ہے۔ اس دن بھی مجمع تھا، آج بھی مجمع ہے۔ اس مجمع کا انداز اور تھا اس مجمع کا انداز اور ہے۔

محترم بھائیو!

کربلا کے میدان میں جہاں حسینؑ عظیم بادشاہ آیا تھا وہاں اس کے ساتھ اس کی بہن بھی آئی تھی۔ حسینؑ کی بہن بھی تھی کربلا میں اور میں یہ کہا کرتا ہوں کہ کربلا کا اصل ہیرو زینبؑ تھی۔ اس کے گرد گھوم رہا تھا تمام کردار کربلا کا۔ دونوں بہنؑ بھائی کربلا میں آ کے بیٹھ گئے۔ روز رات کو بہن بھائی آپس میں باتیں کیا کرتے۔ جب پچھلی رات ہوتی تو زینبؑ بلاتی، آؤ حسینؑ باتیں کریں۔ اللہ جانے پھر موقع ملے گا یا نہیں۔ بھائی بہن کو بات کرتے۔ بات کیا ہوتی؟ زینب کہتی حسینؑ! تو تے جب سے اس جنگل میں آ کے خیمے لگائے ہیں مجھے روزانہ رات کو خیمے کے پیچھے سے کسی خاتون کی رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ اللہ جانے کون روتا ہے؟

امامؑ فرماتے ہیں کہ بہن پہچاننے کی کوشش کرنا۔ یہ میری اماں روتی ہے۔ پہلے دونوں بہن بھائی امانؑ کے رونے کی باتیں کرتے۔ پھر آپس میں بیٹھ کر گفتگو کرتے۔ زینبؑ پوچھتی، حسینؑ ارادہ کیا ہے؟ کربلا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ چاہتے کیا ہو؟ تو حسینؑ کہتے: زینبؑ میں اللہ کے نام کو دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے، اللہ کی اذان کو قائم رکھنے کے

لیے، اللہ کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے، میں اپنی جان دینا چاہتا ہوں، میں مرنا چاہتا ہوں۔

ذرا غور سے فقرہ سننا دوستو!

حسینؑ کیا کہا تم نے؟ تم مرنا چاہتے ہو؟ کہ ہاں میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں آیا ہی اسی لیے ہوں کربلا میں کہ میں مر جاؤں گا مگر اللہ کا نام نہیں مٹنے دوں گا، تو زینبؑ نے مسکرا کے کہا: لے حسینؑ سن! تو بھی علیؑ کا بیٹا، میں بھی علیؑ کی بیٹی، جو خون تیری رگوں میں وہی میری رگوں میں، جو جوش تجھ میں وہی مجھ میں، جو تیرا نانا وہی میرا نانا، جو تیرا باپؑ وہی میرا باپؑ، جو تیری ماںؑ وہی میری ماںؑ۔ بس فرق اتنا ہے کہ تیرے سر پر ابا کا عمامہ ہے یہ دیکھ میرے سر پر اماں کی چادر ہے۔ میں بھی وہی ہوں حسینؑ جو تو ہے تو تو ارادہ کر چکا مرنے کا؟ ہاں! بہن میں نے ارادہ کر لیا۔ مگر میری بات سن لے! بے شک حسینؑ تو مر جا۔ اپنے ارادے کو پورا کر لے میرا بھی زینبؑ نام ہے۔ حسینؑ میں تجھے قیامت تک نہیں مرنے دوں گی۔ اگر گلی گلی، کوچے کوچے، بازار بازار، تیرے دربار نہ لگوا دیئے تو زینبؑ نہ کہنا۔ میں دنیا بھر میں تیرے دربار لگوا دوں گی۔ ساری دنیا سے حسینؑ حسینؑ کرا دوں گی۔ یہ زینبؑ نے تہیہ کیا۔ چنانچہ آج یہ زینبؑ کا اقبال ہے کہ اتنا بڑا دربار یہاں لگا ہوا ہے۔ یہ زینبؑ نے کام کیا تھا۔

میرے محترم بزرگو!

دسویں کی عصر تک حسینؑ کا کارنامہ تھا۔ اس وقت حسینؑ اپنا کام کر رہے تھے۔ عصر تک حسینؑ نے کیا جو کچھ کیا۔ پھر عصر تک حسینؑ اپنا کام کر کے اپنے مفتوحہ علاقے میں آرام سے سو گئے۔ حسین تو سو گئے۔ اب چارج زینبؑ نے سنبھال لیا۔ لاشے پر رونے نہیں آئی تھی آئندہ زندگی کا چارج لینے آئی تھیں کہ حسینؑ اب میں چارج لے رہی ہوں، چنانچہ زینبؑ نے چارج لیا۔ حسینؑ میں اپنی فوج لے کر شام جا رہی ہوں۔ چنانچہ زینبؑ نے چارج لیا۔ حسینؑ میں باقی فوج لے کر شام جا رہی ہوں۔ اگر دنیا کے سب سے بڑے ہنر،

مجسٹی، دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کے نام کو گالی نہ بنوادوں تو زینبؑ نہ کہنا۔ لے حسینؑ میں جارہی ہوں شام۔

لو بھائیو! چند فقرے سن لو، خدا تمہیں سلامت رکھے۔

زینبؑ گیارہ تاریخ کو تیار ہوگئی شام جانے کے لیے اور زینبؑ نے اپنی فوج کو لائن میں کھڑا کر دیا۔ حسینؑ اگر مناسب سمجھے تو ذرا میری فوج کا معائنہ کر لے جو فوج لے کے جارہی ہوں اتنی بڑی سلطنت فتح کرنے اور حسینؑ، افواجِ قاہرہ زینبیہؑ کا معائنہ کرنے کے لیے نیزے پہ سوار ہوئے۔ زینبؑ کی فوج دیکھی۔ ایک لائن میں بیوہ عورتیں، ایک صف میں یتیم بچے، چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے، ایک لائن میں عورتیں کھڑی تھیں، ایک لائن میں بچے تھے۔ حسینؑ نے زینبؑ کی فوج کو دیکھا۔ ماشاء اللہ زینبؑ بڑی فوج عجیب فوج ہے کہ حسینؑ ذرا میری فوج کی وردی بھی دیکھو۔ اب جو فوج کی وردی دیکھی تو حسینؑ نے نیزے پہ آنکھیں بند کر لیں، وہ نہ دیکھ سکے۔ وردی کیا تھی؟ گردن سے ہاتھ باندھے ہوئے، سر کھلے ہوئے۔ یہ زینبؑ کی فوج کی وردی تھی۔ اس فوج کو لے کے جا رہی ہوں، یزید کو فتح کرنے حسینؑ۔ زینب گیارہ کو روانہ ہوگئی۔ فوج میں سپاہی کتنے تھے؟ چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے یتیم، جنہیں لے کے چلی ہے کربلا سے زینبؑ۔ چل دی کربلا سے۔ روانہ ہوگئی۔ ایک فقرہ کہہ کے آگے بڑھوں۔ چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس یتیم بچے، اڑتالیس بچے لے چلی کربلا سے۔

میرے بھائیو! میرے عزیزو! میرے بزرگو! میرے دوستو!

جب پہنچی ہے شام میں یزید کے سامنے تو بچے عورتیں سب مل کے کل بارہ تھے۔ یہ بتاؤ کہاں تلاش کریں؟ باقی کہاں گئے؟ ہماری چونسٹھ عورتیں کہاں گئیں؟ ہمارے بچے کہاں رہ گئے؟ یہاں سے وہاں تک اس راستے میں قبریں بنی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی جائے اس راستے سے جس سے اہل بیتؑ گئے تھے کہیں بچوں کی قبریں، کہیں خواتین کی قبریں، اس طرح پہنچی۔ کوفے کی منزل طے کی، شام کے ملک میں پہنچی۔ شام کے شہر دمشق میں

داخل ہوئی۔

جہاں جہاں بیٹھے ہو بھئی!

دمشق بڑا شہر ہے۔ پوری طرح آراستہ کیا گیا۔ اس شہر کو کہ آج زینب نے گزرنا ہے۔ شہر سجایا گیا، بازار آراستہ کیے گئے۔ حکومت کا حکم ہے کہ کوئی آدمی آج گھر میں نہ بیٹھے۔ عورتیں چھتوں پر، بازاروں میں، دکانوں کے تھڑوں پر، بچے بڑے، بیچ میں سے آل محمدؐ کا قافلہ گزرا۔ آگے آگے نیزوں پر سر، پیچھے پیچھے قیدی۔ کبھی اس بازار میں، کبھی اُس بازار میں۔ تقریباً ایک ہفتہ دمشق شہر کے مختلف بازاورں میں ان کو پھرایا گیا۔ اس ایک ہفتے تک یزید اپنا دربار بناتا اور سجاتا رہا۔ پنڈال بنایا گیا۔ قناتیں لگائیں گئیں۔ سائبان لگائے گئے۔ تمام دنیا کے سفیر اور امراء بلائے گئے۔ اپنی حکومت کے امراء بلائے گئے۔ سات سو کرسیاں بچھائی گئیں۔ نیچے فرش پہ آدمی بٹھائے گئے۔ جب دربار پوری طرح آراستہ ہوگیا تب حکم ہوا کہ قیدیوں کو لے کر آؤ۔ اب قیدی دربار میں آئے۔

سن رہے ہو نا بھئی!

قیدی دربار میں آئے اور اس مجلس میں جتنے سید بیٹھے ہیں، ان سے پوری معافی کے بعد۔ میں اب یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دربار میں زینبؑ کی طلب ہوگئی۔ زینبؑ کو دربار میں بلایا گیا۔ پنڈال بنا ہوا تھا۔ عظیم الشان پنڈال تھا۔ سات سو کرسیاں لگی ہوئی تھیں، سینکڑوں آدمی فرش پر بیٹھے تھے اور اس کے صدر گیٹ سے لے کر دو دو فرلانگ تک دو طرفہ قناتیں تھیں۔ ان قناتوں کے ساتھ اندر کی طرف ننگی تلواریں لیے سپاہی کھڑے تھے تاکہ بچے اور عورتیں جب ان سپاہیوں کے بیچ سے گزریں تو اتنے ڈر جائیں کہ جب یزید کے سامنے آئیں تو فوراً سجدہ کریں۔

بے سہارا عورتیں، سہمے ہوئے بچے، جب پہنچے امام زین العابدینؑ ان قناتوں کے قریب قافلہ کو لے کے اور یہاں سے وہاں سپاہی کھڑے ہوئے دیکھے تو آپؑ نے فرمایا: ''پوپھی اماں! کیا ارادہ ہے؟ زینبؑ نے کہا: بیٹا ڈرو نہیں۔ میں آگے آگے چلتی ہوں، تم

میرے ساتھ آجاؤ۔ زینبؑ آگے باقی کنبہ پیچھے، جس سپاہی کے قریب سے گذرتیں، وہ تھر تھر کانپتا، تلوار اس کے ہاتھ سے گر جاتی۔ یہ سارا قافلہ طے کیا۔ جب بالکل پنڈال کے دروازے پر پہنچے۔ اندر کی جھلک دیکھ کے کہتی ہیں۔ ''بیٹا! اب تو اندر جانے کی میری بھی ہمت نہیں ہے۔ مجھ سے اب نہیں جایا جاتا اندر، میں اب نہیں جاؤں گی۔'' امامؑ نے فرمایا: ''اماں! جو آپؑ کی مرضی۔'' زینبؑ رکی ہی تھیں دروازے پر کہ ایک شخص طشت میں حسینؑ کا سر لے کر گزرا۔ سر جو زینبؑ کے قریب سے گزرا۔ زینبؑ کو دیکھا۔ سر کے لب ہلے ''زینبؑ میری خاطر آؤ۔ کوئی بات نہیں میں جو ساتھ ہوں۔''

دربار میں چلی گئی۔ ایک طرف سر رکھ دیا گیا۔ ایک طرف قیدی کھڑے ہو گئے۔ بچے ہیں، بڑے ہیں، سب کھڑے ہیں۔ دو تین گھنٹے گزر گئے قیدیوں کو کھڑے کھڑے نہ ان سے کوئی بات کرتا ہے

مسلمانو! میری بات غور سے سننا!

جب دو تین گھنٹے کے بعد اپنے شغل سے فارغ ہوا تو یزید پوچھتا ہے: ''یہ ہیں قیدی؟'' کہا: ہاں! ''ان قیدیوں میں فاطمہؑ کی بیٹی کون سی ہے؟'' اس کے جواب میں کوئی اور نہ بولا۔ بس ایک دم فاطمہؑ کی بیٹی آگے بڑھی اور پورے جوش سے کہتی ہے: ''او ہمارے آزاد کردہ غلاموں کے ذلیل بچے، خبردار! اس نجس زبان سے میری ماں کا نام نہ لینا۔'' اتنا بڑا سخت جواب سن کر یزید گھبرا گیا۔ شہنشاہیت رخصت ہو گئی۔ چہرے پر پسینہ آ گیا، حواس گم ہو گئے، پریشان ہو گیا اور پریشان ہو کے کہتا ہے: ''زینبؑ! تم نے بڑے جوش میں بات کہی۔'' لعین! میں کیا کہوں، میرا تو سارا جوش و طاقت کربلا میں رہ گئی۔ مگر یاد رکھ! تیرے دربار میں آ کر مجھے حسینؑ کی موت بھی بھول گئی۔ یہاں وہ مصیبت مجھ پر گزری ہے۔'' یہ شریفوں کے سننے کی بات نہیں۔ یزید کہتا ہے: ''یہاں کیا مصیبت گزری ہے'' کہ ''اس سے بڑھ کر بھی کوئی مصیبت ہو گی کہ میں زینبؑ اور تجھ سے بات کروں۔ بتا اس سے بڑھ کے کیا مصیبت ہو گی؟ کہ میں تیرے ساتھ بات کر رہی ہوں۔'' اب تو وہ

بالکل ہی گھبرا گیا۔

یہ دو چار فقرے بی بی نے کہے:

دربار تھا دور تک لگا ہوا۔ دربار کے ادھر کونے میں رسولؐ کا وہ صحابی، نابینا وہ بھی بیٹھا تھا ایک کرسی پر۔ اس نے اپنے ساتھ والے سے پوچھا: بھائی میں تو نابینا ہو گیا مجھے سمجھ نہیں آتی یہ قصہ کیا ہے؟ یہ علیؑ کہاں سے آ گئے؟ یہ بالکل علیؑ کی آواز ہے۔ میں نے پہچان لیا یہ علیؑ بول رہے ہیں۔ اس کے ساتھی نے کہا: بابا یہ علیؑ نہیں کہ پھر علیؑ کا کوئی بیٹا ہو گا؟ حسینؑ ہے؟ عباسؑ ہے؟ کون بول رہا ہے؟ اس ساتھ والے نے دبایا ''بابا چپکا رہ علیؑ کا بیٹا نہیں، علی کی بیٹی ہے۔'' اب تو بڈھے صحابی نے بے چین ہو کر کہا: کون سی بیٹی؟ کہ علیؑ کی بڑی بیٹی زینبؑ'' ہیں۔

زینبؑ دربار میں کیسے آ گئی؟ وہ دربار میں کیوں آ گئی؟ تو ساتھی نے کہا: ''بابا صرف آئی ہی نہیں، ننگے سر بھی ہے اور ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں۔'' بس یہ سنتا تھا کہ رسولؐ کا صحابی بے چین ہو کے اپنی کرسی سے اُٹھا اور وہیں سے اس نے آواز دی: زینبؑ ڈرنا مت، میں آ رہا ہوں۔ بی بی گھبرانا مت، میں آ رہا ہوں۔ میں تیرے نانا کا صحابی ہوں بی بی۔ میں آ رہا ہوں بی بی، گھبرانا نہیں، میں آ رہا ہوں۔ میں تیرے نانا کا صحابی ہوں بی بی، گھبرانا نہیں۔'' یہ کہہ کر جو چلا بڈھا صحابی۔ چلا وہاں سے (نابینا تھا)۔ کرسیوں سے ٹکراتا ہوا، بیٹھنے والوں سے ٹکراتا ہوا، دربار کا نقشہ درہم برہم ہو گیا۔ لوگ اُٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ اس بڈھے کو آتا دیکھ کے جب سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ دربار منتشر ہو گیا تو بی بی آگے بڑھ کر ذرا اونچی جگہ کھڑی ہو گئی اور اونچی جگہ کھڑے ہو کر سر کو جھٹکا دیا۔

لو یہ میرے بیان کا آخری فقرہ ہے۔ دوستو!

اے دربار والو! اے ہمارے چاروں طرف کھڑے ہونے والو! یہ بتاؤ تم ہندو ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ او عیسائی ہو؟ مجوسی ہو؟ یہودی ہو؟ کیا ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ سات آٹھ سو آوازیں برابر آئیں ہم سب مسلمان ہیں۔ مسلمان

ہو؟ کس کا کلمہ پڑھتے ہو؟ کئی ہزار آوازیں بیک وقت آئیں کہ محمدؐ کا۔ ادھر انہوں نے محمدؐ کا نام لیا۔ ادھر بی بی نے کہا: محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والے۔ بے غیر! تو سامنے آ اور محمدؐ کی بیٹی کا تماشا دیکھو، آؤ محمدؐ کی بہو بیٹیو کا تماشا دیکھو، او بے غیر تو آؤ، محمدؐ کی بیٹیوں کے کھلے سر دیکھو۔ لوگ دیواروں سے سر مار رہے تھے۔ زینبؑ ہمیں پتہ نہیں تھا، ہمیں علم نہیں تھا اور اس کے بعد یزید کو دربار کرنا میسر نہ ہوا اس کا آخری دربار تھا۔ اتنی بڑی فتح حاصل کی جو آج تک فتح ہے۔ اب یہ سارے مجمع سے میں کہہ رہا ہوں بھائیو! تم محمدؐ کے بچوں کی عزاداری کے لیے آئے ہو۔ تم محمدؐ کے بیٹوں کی عزاداری کے لیے آئے ہو۔ تم محمدؐ کے بچوں کو رونے کے لیے آئے ہو۔ جس نے مجلس کی ہے اس کا شکریہ۔ اس نے صف ماتم بچھا دی محمدؐ کے بچوں کے لیے۔ آنے والو خدا تمہیں اجر عظیم دے۔ خدا تمہیں اس کا بڑا ثواب دے۔ تم رونے کے لیے آ گئے۔ دیکھو بیٹا ہنسنے بولنے کے لیے، تماشا کے لیے، سارا سارا دن گزار دینا اور بات ہے اور رونے کے لیے گھر سے آ کے بیٹھنا اور بات ہے۔

یہ تمہاری محبت کی دلیل ہے تم سے محمدؐ خوش ہیں۔ محمدؐ کا اللہ خوش ہے۔ اگر کوئی عمل نیک ہے تمہارے نامہ اعمال میں تو بس یہی رونا ہے یہی مجلس ہے۔ اللہ اسے قبول کرے۔ خدا اسے منظور کرے۔ خدا ان گھروں کو آباد کرے، جہاں فاطمہؑ کے اجڑے ہوئے گھر کا ذکر ہوتا ہے۔ سیدو! خدا شاہد ہے، ہمارا گھر ایسا اجڑا کہ دنیا میں کسی کا گھر ایسے نہ اجڑا۔ ہم ایسے برباد ہوئے اس دنیا میں کہ اس طرح کوئی برباد نہ ہوا۔ ہم ایسے ویران ہوئے، کوئی ایسا ویران نہ ہوا۔ ہماری قبروں سے قبریں نہ ملیں۔ گھر سے گھر نہ ملے۔ کوئی کربلا میں ہے کوئی کاظمین میں ہے، کوئی نجف میں ہے جب وہاں سمائی نہ ہوئی تو کوئی بی بی لاہور میں ہے۔ ہم اُجڑ گئے۔ برباد ہو گئے۔ ایسا کوئی گھر تباہ نہ ہو، جیسا ہمارا گھر تباہ ہوا۔ ایسا کوئی گھر برباد نہ ہو، جیسا ہمارا گھر برباد ہوا۔ فاطمہؑ کے گھر کی بربادی۔

رونے والو!

اللہ تمہارے گھروں کو آباد رکھے۔ اللہ تمہارے بچوں کو بڑی ترقی دے۔ اللہ

تمہارے بچوں کو سلامت رکھے۔ تمہیں سب کو خوش رکھے۔

بحق محمد و آل محمد

میں آپ حضرات کا ایک بار پھر شکریہ ادا کردوں۔ آپ تشریف لائے۔ آپ کے آنے کا میں بڑا شکر گزار ہوں۔ پولیس کے جوانو! تمہارے انتظام کا بھی شکریہ، فوج کے جوانو! تم لاریوں میں بیٹھ کے آئے ہو تمہارا بھی بہت شکریہ۔ بچو، بڑو جس طرح بھی تم آئے ہو تمہارا شکریہ۔ دیکھو بیٹا! سفید داڑھی کے بوڑھے کمر جھکی ہوئی، لکڑی ٹیکتے چلے آ رہے ہیں۔ بابا کہاں جا رہے ہو؟ کہ فاطمہؑ کے بیٹوں کو رونے جا رہا ہوں۔ عورتیں برقعہ پہنے ہوئے، بچے اُٹھائے ہوئے چلی آ رہی ہیں۔ بی بی کہاں جا رہی ہیں، بی بی کہاں جا رہی ہیں؟ کہ بی بی کے بچوں کو رونے جا رہی ہوں۔ اس سے بڑھ کر کے کوئی عبادت نہیں دنیا میں۔ اللہ تمہاری اس عبادت کو قبول کرے۔ اللہ اس سعی کو مشکور کرے۔ اللہ تمہارا اس مجلس کو قبول کرے۔

بحمد محمدؐ و آل محمدؐ آمین!

۱۹۵۵ء کے جلسہ یوم الحسینؑ منعقد
لاہور میں کی گئی تقریر

حسینؑ کا تعارف

(خطیب آلِ محمد مولانا اظہر حسن زیدی صاحب)

حضرات محترم! اس عظیم الشان جلسہ کے دوران میں حضراتِ منتظمین سے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں تقریر کرنے والوں کو آپ سے متعارف کرواتا رہوں۔ چنانچہ کل سے یہی کام سرانجام دے رہا ہوں۔ ہر خطیب و عالم کے بارے میں مجھ کو جتنا علم تھا وہ جناب کو معلوم ہوتا رہا۔ اب منتظم صاحبان نے اس عہدے سے ترقی دے کر حکم فرمایا ہے کہ اب تک مقرروں کا تعارف کرواتے رہے ہیں اب چند لمحوں کے لیے حضرت امام حسین علیہ السلام کی تعریف کا شرف حاصل کروں۔

غور فرمایا آپ نے حکم کی نوعیت پر؟

کیا عرض کروں؟

پھر ایسے علمائے کرام اور مقررین عظام کے سامنے۔ بھلا ان کی موجودگی میں کون کیا کہہ سکتا ہے اور کس سے کیا کہا جا سکتا ہے؟ لیکن جب حکم ہے تو حاضر ہوں۔ چند منٹ میں جو کہا جائے گا کہہ کر بیٹھ جاؤں گا۔

جو اُٹھا معلوم ہوا کہ کمال کو حدوں تک پہنچا دیا لیکن جب دوسرے کی باری آئی تو اس کے متعلق بھی یہی گمان ہونے لگا کہ اقلیم کمال کا فاتح تو یہ ہے مگر جب میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شخصیت کا تصور کرتا ہوں کہ یہ وہ شخصیت ہے جو ان تقاریر سے بلند تر مقام کی مالک ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے بھی کوئی کمال نہیں کیا۔ آپؑ کی شان ہی

آماجگاہ کمال ہے۔

ہمارے پاس جس قدر ذخیرہ ہے وہ نرا یہ کہ فلاں نے کیا کہا؟ لیکن حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے پاس کہا نہیں بلکہ ''کیا'' ہے۔ آپؑ کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ حضرتؑ نے یہ ''کیا'' ہے۔

اب ''کہا'' کو ''کیا'' سے کیسے نبھایا جائے؟

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے پاس نہ الفاظ ہیں نہ معانی جو حضرت امام حسین علیہ السلام کے بارے میں حقائق کی تصویر پیش کر سکیں۔ بہر حال حکم کی تعمیل کروں گا۔ ان ہی مقررین کی کہی ہوئی بات کہہ دیتا ہوں۔

دیکھیے سامنے کی بات ہے کہ موسلا دھار بارش کے بعد بھی ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہتی ہے۔ یہ بادل برس چکے۔ لیکن منظر کا سلسلۂ اثر پیشِ نظر ہے۔ آج جو بات سنی تھی اسی کو دھراتا ہوں۔ شاید اتنی دیر میں وقت پورا ہو جائے۔

معلوم نہیں کون بزرگ تھے۔ جنہوں نے فرمایا تھا کہ حضرت امام حسینؑ کربلائے معلیٰ میں شہادت کے لیے تشریف فرما تھے۔ بس میں اس کے متعلق کچھ عرض کر کے بیٹھ جاؤں گا۔

بات یہ ہے کہ دنیا کے وہ افراد جن کو اللہ نے انسان بنایا ہے۔ جیسے ہم، تم اور وہ اور فرشتہ نہیں بنایا۔ نہ حیوان بنا ڈالا، اگر خدا چاہتا تو فرشتہ یا حیوان بنا سکتا تھا۔ لیکن اس کا منشاء یہ ہے ہوا ہے کہ انہیں انسان ہی بنایا جائے۔ انسان بنانے کا مطلب کیا ہوا؟ یہ انسان اپنی زندگی میں انسان بن کر رہے، نہ حیوان۔ بعض کی تعریف میں مولوی صاحبان جو یہ فرما دیتے ہیں کہ فلاں صاحب تو فرشتہ ہیں تو حقیقتاً یہ تعریف نہیں ہوتی۔ صاف معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ یہ صاحب فرشتہ ہو گئے۔ گویا ان سے انسانیت رخصت حالانکہ فرشتہ ہونا کوئی کمال کی بات نہیں۔ فرشتے تو وہی تھے جو انسان کو سجدہ کر رہے تھے اور جس نے ہم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا وہ فرشتہ ہی نہ رہا۔

کائنات کی ہر شے انسان کی فرماں بردار ہے۔ تمام حیوان، سب فرشتے، کل اشیاء، انسانیت کے حلقہ بگوش۔ صاحب! ہم قدرت کے عجب شاہکار ہیں۔ واہ رے انسان۔ لوہے کو اکاش پہ اُڑایا، دانے کو دھرتی سے اُٹھایا، کشتی کو موجوں پہ چلایا، سمندر کی تہوں کو پایا، موتی کی آبرو کو بچایا، ہوا، فضا سب پر حکومت، لیکن بے بسی ہے تو ایسی کہ نہ آنے پر بس نہ جانے پر بس۔ کسی نے کہا: آؤ، آ گئے، جب کہے گا واپس جاؤ، رک نہ سکیں گے۔

یہ انسان تو کہتا تو یہ ہے کہ دنیا میں بے بس ہے۔ مگر عالم یہ کہ کہیں بس کرنے کو تیار نہیں۔ دس روپیہ کی نوکری مل گئی تو بس نہیں۔ پچاس روپیہ تنخواہ ہو جائے تو بس نہیں۔ ہزار روپیہ کی ملازمت ہاتھ آ جائے تو بس نہیں۔ غرضیکہ حضرت انسان نہ کسی منزل پر بس کرتا دکھائی دیتا ہے اور نہ کہیں اس کی ہوس کا سٹاپ نظر آتا ہے۔ بے بس ہو کر بس کرنا جانتا ہی نہیں۔ انسان کا دماغ کیا ہے۔ الٹا پیالہ، الٹے پیالے میں سمندر بھی انڈیل دیجئے تب بھی نامراد خالی ہی رہے گا۔ ہاں قبر میں جب کیڑوں سے پالہ پڑے گا تب جا کر کہیں بس کرے تو کرے۔ دنیا بھر کی ہوس بھری ہوئی ہے۔ ہر ایک شئے کو حاصل کرنے کے درپے ہے۔ علمائے کرام نہ ہوتے تو اس بات کو اور پھیلا کر عرض کرتا۔ مگر ڈر ہے کہ کہیں عرض میں طول نہ پیدا ہو جائے۔

ہاں! جہاں انسان کو خواہشوں کا سلسلہ لامتناہی وہاں دنیا کی ہر چیز اس سے پناہ مانگتی ہے۔ اس کو اس کی ''میں'' نے تباہ کر رکھا ہے۔ تکبر اور غرور اس میں موجود ہے۔ ٹھوکر کھا کر بھی باز نہیں آتا۔ ہوا بھرنے کے بعد خود ہی تباہ نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ میں انارکلی بازار گیا تو دیکھا کہ ایک دکان میں شیشے کی الماری میں ایک بڑا گیند جسے فٹ بال کہتے ہیں بند پڑا ہے۔ میں نے دکاندار سے پوچھا: یہ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: جناب ہاتھ نہ لگائیے گا۔ لیکن شام کے وقت یونیورسٹی گراؤنڈ جا نکلا تو دیکھتا کیا ہوں کہ وہی فٹ بال ٹھوکروں میں ہے۔ بھئی یہ کیا؟ اس کی یہ گت کیوں بن رہی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جب دکان میں تھا تو اس میں ہوا نہیں بھری ہوئی تھی۔ اب میدان میں آیا

ہے تو غرور کی ہوا لے کر بس۔ اسی لیے ٹھوکروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔

ہاں! تو ایسے عالم میں جبکہ انسان کی "میں" اسے حیران کیے ہوئے ہے۔ ضرورت ہے ایسے حاکم اور ایسی طاقت کی جو انسان کو ٹھیک کرے۔ اس کے بس اور بے بسی کو قابو میں رکھے۔ اس کے لیے ایسا قانون یا ضابطہ پیش کرے جو اسے تھامے رہے۔ اور ایسے دستور کی یقیناً ضرورت ہے۔ کیونکہ انسان کے ٹھیک رہنے سے ہی کل عالم کا نظام درست رہ سکتا ہے۔ بس۔

اچھا تو معلوم ہوا کہ تمام انسانوں کو مہذب اور منظم کرنے کے لیے ایک صحیح قانون اور اچھی حکومت کی ضرورت ہے۔ ان کے بگڑنے سے دنیا بگڑے گی اور ان کے سنورنے سے سارا جہان سنور جائے گا۔

انسانوں نے اپنے خیال کے مطابق قانون اور ضابطے بنائے لیکن چونکہ بنانے والے ہم انسان تھے اس لیے جو بنایا وہ اپنے لیے مفید اور دوسروں کے واسطے مضر۔ بس اسی نفسا نفسی نے اسے بگاڑ دیا۔ بالآخر خالق نے کہا: آؤ ایک قانون اور ضابطہ حیات میں پیش کرتا ہوں جو تمام خرابیوں سے پاک ہے، جو تمہارے موضوعات میں موجود ہیں۔ اس نے اس نظام کا نام اسلام رکھا اور لائحہ عمل کا نام قرآن۔ اس کے مطالب لَا رَیْبَ فِیْہ۔ اس کا بیان لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ اس کی حقیقت یہ ہے کہ بنایا، حق نے، اتارا، حق ہے اس کے مظاہر حق اس کے الفاظ، حق اس کے اشارات حق یہ کتاب حق سے اتنی بھری ہوئی کہ اب حق نہ رہا کسی کو کہ اس کو ناحق کہہ دے۔

تو جناب ایسی کتاب پیش کر دی اور فرمایا کہ اس کے احکام پر عمل کرو۔ اس نے سکھایا: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تمہارا مالک کون ہے؟ اللہ ہے شہنشاہ یا بادشاہ کون ہے؟ اللہ ہے۔ آپؐ نے سنا؟ آپ مسلمان ہیں؟ آپ کا مالک کون ہے؟ اللہ ہر شئے کا مالک ہے۔ اللہ، دنیا کی ہر شئے کا شہنشاہ اللہ ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی حکومت نہ حکم، تو یہ بتلایا اسلام نے۔

یہی وہ اعلان تھا جو قرارداد مقاصد کے پہلے فقرہ میں کیا گیا تھا کہ "تکوینی" و تشریعی حیثیت سے اصل حاکم اللہ رب العالمین ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے جو کچھ بتایا وہ یہی تھا کہ

کوئی مالک نہیں، مگر ایک اللہ۔ رسولؐ کے بعد اس کے جانشینوں نے جو کچھ بتایا، وہ یہ تھا کہ کوئی حاکم نہیں سوائے اللہ کے کوئی بادشاہ نہیں سوائے اللہ کے۔ ایک مسلمان کا حاکم صرف اللہ اس کا مالک صرف اللہ ہے۔

ہاں اسلام نے یہی اور صرف یہی بتایا تھا لیکن ۶۰ ھ میں شام کے علاقہ میں جو راجہ تخت پر بیٹھا۔ یزید اس کا نام تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے اعلان کر دیا کہ اب میں ہوں مالک۔ مسلمان اس کے خلاف سمجھے ہوئے تھے۔ مگر یزید حکم دیتا ہے کہ میں مالک ہوں۔ اب میرا حکم چلے گا اور یزید خدا کے قانون کا ہاشمیوں کا وضع کردہ سمجھتا تھا۔ پس دونوں مالکوں کے درمیان تصادم ہوا۔ ایک مالک تھا اصلی اللہ۔ ایک تھا نقلی مالک یزید۔ لہٰذا یہاں حضرت امام حسین علیہ السلام اور یزید کا مقابلہ نہ تھا بلکہ یزید خدا سے متصادم ہو رہا تھا۔ البتہ مقابلہ اگر حسینؑ سے ہوتا تو اس صورت میں ہوتا جب یزید یہ کہتا کہ میں امام ہوں۔ یا میں رسولؐ کا نواسہ ہوں۔ یا سید ہوں۔

معلوم ہوا کہ اس کا مقابلہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے نہ تھا بلکہ اللہ سے۔ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو مالک الملک کہا تھا۔

اب دونوں اپنی ملکیت کا فیصلہ کراتے ہیں۔ یزید سے کہا گیا کہ تم اپنی مالکیت کے گواہ لاؤ۔ اس نے رَے کی حکومت، جاگیریں، فوجیں اپنے دعوے کے جواب میں پیش کر دیں۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہمارے مالک الملک ہونے کی گواہی کون دے گا؟ کون تیار ہے؟ سناٹا چھا گیا کُل دنیا پر۔ کسی شخص کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر نوجوانانِ جنت کا سردار اپنی کمر باندھ کر اُٹھا اور پکارا:

''خداوندا! میں گواہی دیتا ہوں کہ تو مالک الملک لاشریک لہ ہے۔''

اسی لمحے جب امام سے کوئی پوچھتا ہے کہ میدانِ کربلا میں کیوں جا رہے ہیں تو آپ فرماتے ہیں ہم گواہی دینے جا رہے ہیں کہ خدا مالک الملک ہے۔ اس کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ گواہی کو عربی میں شہادت کہتے ہیں۔ پس کسی کو طاقت ہے کہ وہ اس مقدمہ

میں آ کر گواہی دے، سوائے اس کے کہ جس کی ماں بتولؑ ہو۔

جس نے آغوشِ رسولؐ میں پرورش پائی ہو اور جو سجدہ کی حالت میں نانا کے کندھوں پر جائے اور محسوس کرے کہ جانا جان سجدہ کو لمبا کر رہے ہیں۔ تو یہ طے کر لے کہ اس سجدہ کا بدلہ سجدہ ہی سے دوں گا۔ حضورؐ نے سجدہ سے سر اُٹھا لیا مگر میں ایسا سجدہ کروں گا کہ سر کو رکھ کر پھر کبھی نہ اُٹھاؤں گا۔

پس میں جا کر گواہی دوں گا کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہی مالک الملک ہے۔ اس لیے حضرت امام حسین علیہ السلام کو میدانِ کربلا میں جانا پڑا، تاکہ اس ظالم و تعدی تشدد و تعصب کے لیے گواہی دیں۔ آپ کو منادی کرنا پڑی کہ میں اپنی گواہی کو تسلیم کرانے جا رہا ہوں اور دستاویزات سمیت جا رہا ہوں۔ آپؑ بیٹے سے کہتے ہیں تم چلو۔ بھائی سے کہتے ہیں تم چلو، بچوں اور عورتوں کو ساتھ لے لیتے ہیں اور دوسری محرم کو میدان کربلا میں پہنچ جاتے ہیں۔ ساتویں تک مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ دسویں محرم کو گواہیاں پیش کرنا شروع کیں۔ جب تمام گواہیاں ختم ہو گئیں تو خود بہ نفس نفیس آگے بڑھے اور شہادتِ عظمیٰ کا انعام لینے کے لیے سر مبارک جھکا دیا۔

اللہ نے کہا کیا چاہتے ہو۔ نبوت تو ختم کر چکا۔ امامت پہلے دے چکا۔ عصمت تمہاری والدہ کا حصہ تھی وہ مل چکی۔ رضا تمہارے باپ کو حاصل ہوئی۔ اب ایک شئے میرے پاس باقی ہے اور وہ شہادت کبریٰ ہے۔ لو وہ تم لے لو۔ انعام دیا گیا اور فرمایا کہ آج سے جتنے میرے گھرانے حسینؑ اتنے ہی تیرے گھر۔ جہاں جہاں میرا تذکرہ ہو گا وہاں وہاں تیرا تذکرہ بھی ہو گا۔ چنانچہ یزید کے خلاف ڈگری ہوئی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا نام عالم میں مشہور ہوا اور یزید کا تخت و تاج چھین لیا گیا۔ حسینؑ کا آج سب کچھ باقی ہے اور موجود ہے لیکن یزید کا سب کچھ جاتا رہا۔ وہ برباد و ذلیل و خوار ہوا۔

آپ حضرات کے سامنے صبح کی بات پھر دہرا دی۔ لہٰذا اب ختم کرتا ہوں۔

والسلام

ورودِ کربلا

فضائل ..... زمزم کی کہانی

مصائب ..... ورودِ کربلا

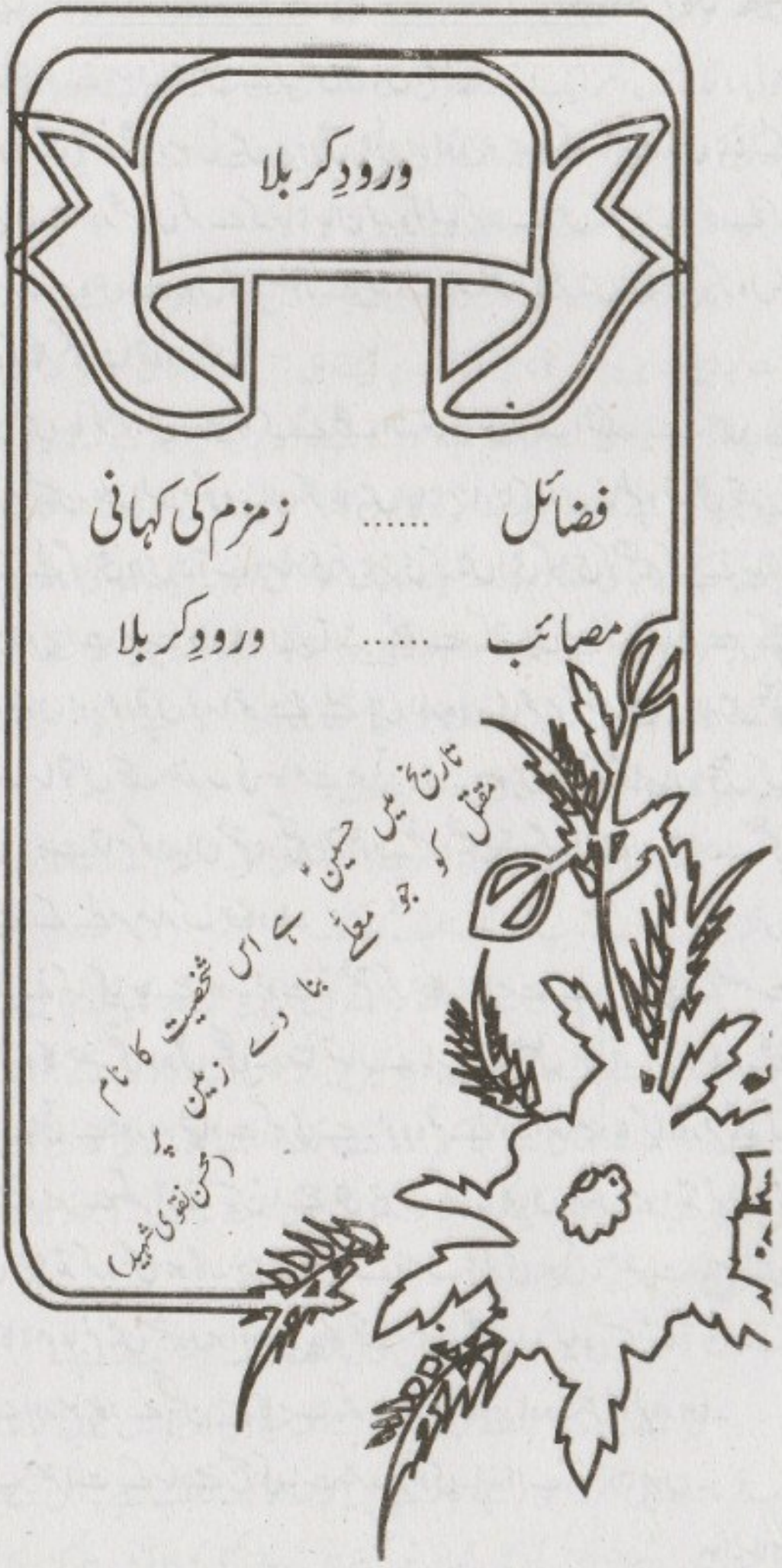

ورودِ کربلا

میرے محترم سامعین!

یہ ماہ عزا ہے اور دس دن یہ ہمارے مخصوص ہیں مجلس کے لیے۔ یہ ہمارے رونے کے، عبادت کے دن ہیں۔ آج غالباً محرم کی دوسری تاریخ ہے۔ زمانہ بہت جلدی جلدی گزر رہا ہے۔ وقت گزر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے میں نہ دیکھتا ہوں۔ مجھے نہ اندازہ ہو بہت سے حضرت ایسے ہوں گے جو سال گذشتہ ۲ محرم کو مجلس میں شرکت کرتے رہے ہوں گے۔ آج وہ موجود نہ ہوں۔ ہمیں نہیں معلوم، ہم آئندہ محرم دیکھیں گے بھی کہ نہیں، ہر مجلس میں یہ سمجھ کر آئیں کہ یہ زندگی کی آخری مجلس ہے۔ اس کے بعد شاید وقت ملے یا نہ ملے۔

حضور گرامی!

میں خدمت اقدس میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کا وہ آخری دین اور اللہ کا وہ آخری آئین جو اسلام کے نام سے دنیا میں موجود ہے اور کثرت تعبیر نے اس کے خواب کو پریشان کر رکھا ہے۔ یہ خدا کا آئین (اسلام نامی) جب دنیا میں آیا تو اسلام کا ذکر میں بار بار اس لیے کرتا ہوں کہ جب سے دنیا ہے اُس وقت سے اسلام ہے۔ میرا مطلب اس اسلام سے ہے جو، اب ہے جو آج کل دنیا میں رائج ہے جسے دنیا میں اسلام کہا جاتا ہے اس کا بانی جب دنیا میں تشریف لایا تو اللہ نے اس سرزمین کو اس کے قدموں سے مشرف اور سرفراز فرمایا اور اس سے زمین کی عزت بڑھائی، یہاں تک کہ قیامت تک کے کروڑہا مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا اور وہاں چلے جانا ایک عبادت بن گئی اور وہاں جا کر لوٹ آنا ایک خاص خطاب کا موجب بن گیا اور ایک نئے اعزاز کا باعث ہو گیا۔

میں نے تو دیکھا نہیں (یہ اس وقت کی تقریر ہے جب خطیبِ آلِ محمدؐ نے فریضہ حج ادا نہیں فرمایا تھا۔ مرتب) ممکن ہے کہ خدا وہ وقت کرے کہ میں بھی دیکھ سکوں۔ مجھے پتہ نہیں شہر مکہ (جن حضرات نے دیکھا ہے وہ جانتے ہوں گے ان کی نظروں میں ہوگا)۔ کیسا شہر ہے؟ کس قسم کی آبادی ہے؟ کیسا علاقہ ہے؟ یہ وہاں کے حالات جو حضرات دیکھ آئے ہیں، جانتے ہیں، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ حاجی صاحب جو آتے ہیں حج سے تو ہمارے لیے تھوڑا سا پانی لے آتے ہیں۔ جسے وہ ''آبِ زمزم'' کہتے ہیں۔ وہ ہمیں بطور تحفہ دیتے ہیں لاکر۔ اور ہم اسے سر پر رکھتے ہیں آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اس کا ذرا سا قطرہ گلاس میں ڈال کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔ اسے اپنے بکسوں میں رکھتے ہیں، اسے گھروں میں رکھتے ہیں، جتنا ممکن ہے اس پانی کا احترام کرتے ہیں، جو ہمیں چھوٹی سی شیشی حاجی صاحبان لا کر دیتے ہیں۔

جب ہم پوچھتے ہیں علماء سے کہ حاجی صاحب نے یہ پانی دیا ہے مجھے لاکر زمزم کا بادہ ہے، اس پانی کا شرف کیا ہے؟ اس کی کیا عزت ہے؟ وہ علماء جواب میں کہتے ہیں، اسے معمولی پانی نہ سمجھنا۔ دنیا کے پانی کی حیثیت اور ہے اس پانی کی حیثیت اور ہے۔ اس کو وہی شرف ہے باقی پانیوں پر جیسے باقی گھروں پر کعبے کو ہے۔ یہ بڑا با عزت ہے۔ بڑا با آبرو ہے۔ وہ فضائل اس کے ہیں کہ سبحان اللہ! صاحب ہے کیا شے؟ اس کی اتنی عزت کیوں ہے؟

اس میں یہ شرف کیوں ہے؟ حاجی صاحبان ہمیں سناتے ہیں کہ آج سے چھیالیس سو سال پہلے (تقریباً تاریخی حیثیت سے) حضرت ابراہیمؑ خلیل اپنی زوجہ محترمہ جناب ہاجرہؑ کو اپنے فرزندِ عظیم جناب اسماعیلؑ کو اس جگہ آباد کر گئے تھے جہاں آج آپ حج کرنے جاتے ہیں۔ یہ قصہ ہے جو ہمیں بتایا جاتا ہے۔

اسی طرح ہے نا قبلہ!

اور اس وقت اسماعیلؑ بالکل بچے تھے۔ ہاجرہؑ ان کی والدہ ساتھ تھیں اور حضرت

ابراہیمؑ انہیں آباد کر گئے تھے۔ وہاں نہ کوئی بستی تھی، کوئی آبادی یا مکان بالکل نہیں۔ ایسا جنگل تھا جو اس وقت تک قابلِ زراعت نہ تھا۔ وہاں کیا کیا؟ ابراہیم نے اپنی بیوی کو بٹھایا۔ اس کی گود میں اس کے بچے کو بٹھایا اور ''خدا حافظ'' کہہ کر چلے آئے۔ تصور یہ آتا ہے کہ کتنا ہولناک وقت ہوگا؟ چاروں طرف خشک پہاڑ ہیں جن میں نہ گھاس ہے نہ سبزہ۔ ایک لق و دق صحرا جو والی وارث تھا وہ چھوڑ کے چلا گیا۔ بٹھا کر ایک خاتون ایک ننھی سی جان اللہ نگہبان اور وہاں بیٹھی ہوئی۔ اب دل پہ کیا گزری ہوگی؟ خیال آیا ہوگا مگر کوئی تفسیر، کوئی کتاب، کوئی عالم، کوئی تاریخ بتانے سے قاصر ہے کہ کوئی گھبراہٹ ہوئی ہو، قطعاً نہیں۔ نہ کسی قسم کی وحشت، نہ کسی قسم کی پریشانی، بڑے آرام سے بیٹھی ہیں اور یہاں سے بنیاد پڑ رہی ہے اس بات کی کہ جب جنگل بالکل ویران ہو جائے تو چھوٹے بچے کی حفاظت کا کام ''خاتون'' کے سپرد ہوتا ہے۔ جب مرد نہ رہیں تو عورت کی ہمت بچوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اس بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہیں پھر دو تین دن کے بعد پانی ختم ہو گیا۔ بچے کو پیاس لگنے لگی۔ اب بچے کی پیاس ماں سے برداشت نہیں ہوتی۔ یہ ''زمزم'' کی کہانی سنائی جا رہی ہے۔

وہ چھوٹی پہاڑیوں کے بیچ میں ماں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ کوہِ صفا، کوہِ مروہ۔ سات مرتبہ دور کیا۔ پانی نہ ملا۔ اب کون ہے جو جا کر کہے کہ اس چھوٹی سی جگہ جس میں آپ دوڑ رہی ہیں اگر یہاں پانی نہیں ملتا ہے تو آپ چھوڑیں اس جگہ کو اور آگے جا کے دیکھ لیں، شاید کہیں مل جائے۔ مگر ہاں کہتی ہیں نہ بالکل نہیں۔ بچہ مرتا ہے تو بے شک مر جائے۔ پانی نہیں ملتا تو نہ سہی۔ تلاش کرنا حکم ہے۔ کوشش کرنا، یہ میں ضرور کروں گی۔ مگر گھر سے باہر نہیں جاؤں گی، کیوں بی بی گھر سے کیوں باہر نہیں جاؤ گی؟ کہا: تمہیں پتہ نہیں کہ میرا شوہر نبیؑ ہے اور جس بیوی کا شوہر نبیؑ ہو اور چلتے وقت کہہ گیا ہو کہ یہاں سے باہر نہیں نکلنا۔ بچہ مرتا ہے تو مر جائے پانی نہیں ملتا تو نہ سہی۔ میں نے اپنے شوہر کی عزت کو رکھنا ہے۔ مجھے حکم کو ماننا ہے۔ میں نے حد سے قدم نہیں نکالنا۔ مجھے حد میں رہنا چاہیے۔

کچھ گزر جائے اب جو اللہ نے خاتون کی ادا دیکھی کہ اپنے شوہر کی عزت کا اتنا خیال قدرت کو بھی رحم آ گیا اور اس نے کہا: ہاجرہؑ! شاباش! تم نے اپنے نبیؑ شوہر کی آبرو رکھ لی، ہم اس کا انعام دیں گے۔ پانی تو شے کیا ہے؟ تیرے بچے کو وہ رنگ لگیں گے کہ اس کی نسل دنیا میں آباد ہوگی۔ ساری روئے زمین اس کی نسل سے بھر جائے گی اور وہ ترقیاں دوں گا کہ دنیا میں کسی کو نہیں ملی ہوں گی۔ اس کے وطن کو قبلہ عالم بنا دوں گا۔ یہاں آباد ہوں گے کروڑہا انسان۔ اس کا رُخ کر کے نمازیں پڑھیں گے۔ یہ اولاد کا شرف نبی کی ایسی بیویوں کو ملتا ہے جن کو خیال ہو نبی کی عزت کا۔ خدا انہیں اولاد دیتا ہے، معاوضہ ملتا ہے۔

حضور والا!

اب جو واپس آ کے دیکھا تو جہاں بچے کو لٹا کر گئی تھیں یہ زمزم کی کہانی سناتے ہیں تو وہاں سے پانی جاری ہو گیا۔ ریتلی زمین جتنا پانی نکلتا وہ چشمہ کا پانی اتنا ہی ریت میں جذب ہو جاتا تو آپؑ نے حکم دیا پانی کو ''زم زم'' ٹھہرو، ایسا ٹھہرو کا حکم دیا کہ پانی تو درکنار یہ لفظ بھی ٹھہر گیا۔ وہ پانی ہے جو ہم لے کے آتے ہیں۔ وہ چشمہ ہے جہاں سے یہ پانی آتا ہے۔ جس کا ہم آپ سب اتنا احترام کرتے ہیں۔ اچھا تو یہ بات ہے تو پانی کی حقیقت کیا ہوگی؟ علماء کہتے ہیں: بھائی تم تنگ کرتے ہو ہر بات پر۔ یہ پانی ہے۔ یہ زم زم ہے۔ اس کی یہ عزت ہے۔ پانی تو ٹھیک ہے، مگر پانی ہے کیا؟

پانی، یہ سنو! اربعہ عناصر جو ہیں نا! ہمارے جن سے اجسام بنے ہیں ان میں سے ایک پانی بھی ہے۔ اچھا یہ کیا ہوا؟ اربعہ عناصر کیا ہوا؟ جناب علماء کی باتیں ہوتی ہیں وہ جاننا بڑی مشکل ہوتی ہیں۔ باتوں سے بات نکلتی ہے۔ اب یہ بھی ہمیں پوچھنا پڑتا ہے کہ قبلہ یہ کیا بات ہوئی۔ یہ آج کل کی بات ہے محرم کی کہ ایک مولانا صاحب وعظ فرما رہے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں جو کالے کپڑے پہنے پھر رہے ہیں؟ کیا یہ بھی مسلمان ہیں؟ محرم کا چاند دیکھ کے انہوں نے کالے کپڑے پہن لیے ہیں۔ کہا: لا حول ولا قوۃ اب میں بھی سن رہا تھا میری سمجھ میں تو آئی نہیں بات، آپ کی سمجھ میں آئی ہو تو مجھے سمجھا دیں اور

اس عالم نے بہت برا منہ بنایا اور کہا کہ یہ جو کالے کپڑے پہنے گا وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔

میں نے کہا: کیوں جناب؟ کیوں جائے گا؟ کالے کپڑے والا جہنم میں۔ انہوں نے کہا کہ فرمایا ہے کالی کملی والے نے۔ تو ہماری سمجھ سے باہر ہیں یہ باتیں۔ بہرنوع پانی ہے، ٹھیک ہے، یہ عناصر اربعہ میں سے ایک جز ہے، پانی۔ عناصر اربعہ

کیا بات ہے قبلہ؟

یہ چار حصہ نہیں ہوتے، ہیں، ٹھیک ہے۔ تم چار کو بھی نہیں جانتے جبھی ہی تو ہم کہتے ہیں تم بات کرنے کے قابل نہیں، تم نہیں جانتے۔ چار حصوں کی بات کیا ہے؟ آپ بتائیں نا! چار عناصر۔ کہنے لگے ایک پانی ہے، ایک مٹی، ایک آگ، ایک ہوا۔ ان چار عناصر سے تم بنے ہو۔ اچھا میرے جسم میں بھی یہ چار عناصر ہیں۔ کہا: ہاں! ہیں بالکل۔ پانی، ہوا، آگ، مٹی۔ اچھا تو اپنے جسم کو میں ''آبی'' کہہ سکتا ہوں اور آپ کو میں ''ناری'' کہہ سکتا ہوں؟ تو یہ باتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ تو پانی اربعہ عناصر میں سے ایک عناصر ہے، پانی۔ یہ ہمارے ہاں پانی ہے جسے ہم پیتے ہیں، استعمال کرتے ہیں۔ سمندروں کا، دریاؤں کا اور ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں۔ ہندوستان کے لوگ جو یہاں بیٹھے ہوں گے انہیں پتہ ہوگا کہ وہاں اتنا بہترین پانی تھا کہ اس سے بہتر پانی شاید ہی دنیا میں ہو۔ گنگا کا پانی۔ ''لوگ مرنے کے بعد بھی اس پانی کے عشق میں جلتے تھے۔'' اور اس کا نام بھی ''گنگا جل'' مشہور ہو گیا تھا۔

آپ نے سنا ہے نا!

گنگا کا نام۔ بڑا شیریں پانی، بڑا خوشگوار، بڑا صحت کے لیے مفید پانی۔

قبلہ! اس پانی سے بہتر ہے یہ زمزم کا پانی۔ بھئی تم کہاں مقابلہ کر رہے ہو؟ کجا زمزم؟، کجا گنگا؟ بھئی تمہیں بتا دیا زمزم بڑی شے ہے اور یہ گنگا۔ بھئی! یہ گنگا تو ہندوؤں کا دریا ہے۔ ہندوؤں کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور خرابی دماغ کی وجہ سے یہ گنگا کو ''اماں''

کہنے لگے ہیں اور ''اماں'' کہنے کی وجہ سے گنگا کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ کیوں دماغ خراب ہوگیا گنگا کا۔ کہا کہ بغیر ''اولاد'' کے جو ''اماں'' بن جائے تو دماغ خراب ہو ہی جاتا ہے۔ ہر چوتھے پانچویں سال اس میں سیلاب آ جاتا ہے اور ''اماں'' کہہ کے خدمت کرنے والوں کو یہ بہالے جاتی ہے۔ لاکھ بچے کہیں اماں ہم تیری اولاد ہیں، کیوں ہم سے ''لڑنے'' آ گئی۔ مگر کیا کیا جائے؟ گنگا کا پانی اتنا معزز ہونے کے باوجود بھی کوئی شے نہیں زمزم بڑی شے ہے۔ اور یہ میرا ایمان ہے کہ زمزم بڑی شے ہے اور جتنے ہم یہاں بیٹھتے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ زمزم بڑی شے ہے۔ اس میں کیا بات ہے؟

پھر ہمارے ایک مولانا صاحب نے سمجھایا کہ زیدی صاحب میں بتاتا ہوں کہ ایک ''نبی زادے کی ڈھائی گھنٹے کی پیاس کی یادگار ہے، یہ پانی۔'' یہ ایک یادگار ہے نبی زادے کی پیاس کی اس لیے اس پانی کو عزت ہے۔ اس لیے اس پانی کی شان ہے۔ بس اب سمجھ میں آ گئی یہ بات کہ ایک نبی دو گھنٹے پیاسہ رہا تو اس کی یادگار پانی زمزم آبِ شفا کہلایا۔ میں نے قیاس کر لیا کہ اگر کسی زمین کو یہ عزت مل جائے کہ وہاں ''اٹھارہ نبی زادے'' آ جائیں۔ ایک نبی زادے کی ڈھائی گھنٹے کی پیاس رنگ لاتی ہے۔ زمزم ہے وہاں، دنیا کی ہر شے ہے وہاں، ہر عزت کی شے ہے وہاں اور اگر کسی زمین کو یہ شرف مل جائے کہ ایک چھوڑ پورے ''اٹھارہ نبی زادے'' اس زمین کو گھر بنالیں، وطن قرار دیں تو وہ زمین کس شرف کی ہوگی؟ اس کی شان کہاں سے کہاں پہنچے گی؟

قبلہ! میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ جب مر جاؤں گا تو میری یہ بات آپ یاد کریں گے۔ میں ایک بات کہا کرتا ہوں کہ ''اٹھارہ نبیؐ زادوں'' نے ایک زمین پسند کر لی۔ جس کے متعلق وہ لوگ جو صدیوں سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ قبلہ یہ بڑی مصیبت کی جگہ ہے۔ قبلہ! اس زمین سے خطرہ ہے۔ جہاں سے ہر نبی نے تکلیف اُٹھائی ہو، جہاں ہر بڑے آدمی کو مصیبت آئی ہو، وہاں بیٹھ جانا ہر ایک کا کام ہے؟ مصیبتوں کی زمین پر بیٹھ کر انہیں آباد کرنا میرا کام ہے۔

میں یہاں قیام کروں گا۔ اس زمین کو خرید لیا اور بیٹھ گئے اور حضور والا! یہ جنگل بھی ایسا ہی ہے کہ بسنے کے قابل نہیں۔ وادیاں غیر زرعی زمین ہیں۔ اس زمانے کی ہاجرہؑ وہاں بیٹھی تھی۔ اس زمانے کی ہاجرہؑ یہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ یہاں بھی گودوں میں بچے ہیں، وہاں بھی گودوں میں بچہ تھا اور آپ حیران ہوں گے کہ ۲ محرم ہی تھی جب یہ قافلہ کربلا میں پہنچا۔ شام کو خیمے لگے۔ ابھی اہلِ بیتؑ خیموں میں گئے ہی ہیں کہ رات ہوگئی اور رات کا ہونا تھا کہ بہن نے بھائی کو بلایا۔ ابھی وہ خریداری والی بات نہیں ہوئی اور کہا کہ رات تو ہو گئی آج رات بھی سفر جاری رکھو۔ یہاں سے چلو کسی اور زمین پہ چل کے خیمے لگاؤ۔ بہن نے بات کی ہے؟ کہ جب سے خیمے میں قدم رکھا ہے مجھے خیمے سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ یہ بڑی خطرناک جگہ۔ کہا بہن کہ اب میں یہاں سے نہیں جاؤں گا، میں تو اب یہاں رہوں گا۔ ''میں تو یہیں رہوں گا۔''

اس لفظ کی تفسیر آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حسینؑ کا یہ لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا اور میری بہن بات یہ ہے کہ میرا سفر تو یہاں ختم ہوگیا۔ تیرا سفر یہاں سے شروع ہوگا۔ آخر زمین خرید لی، آباد ہونا شروع ہوگئے۔ میں اپنے طریقے سے ایک بات کہا کرتا ہوں قبلہ! جوانی میں اس بات کو گھنٹوں میں جا کے ختم کیا کرتا تھا اور اب مختصر کر کے کہے دیتا ہوں۔ یہ مسلمان کی ایک رسم ہے۔ آپ نے بھی شریف نامی شہر سنے ہوں گے۔ سینکڑوں شہروں کے ساتھ یہ لفظ لگا ہوا ہے۔ شریف اجمیر، شریف اور یاد نہیں رہے۔ ہائیں، پاکپتن شریف، کلیر شریف۔ آپ کو بہت یاد ہوں گے۔ پنجاب میں تونسہ شریف اور کئی ہزار شریف اور یا جہاں کوئی قبر نبی ہے اس شہر کے ساتھ شریف لگ گیا اور ان شریفوں کی بستیوں کی زیارت کر کے انسان نے کہا کہ چلو بھائی شریفوں کو دیکھ لیا۔ اب اس ملک سے ذرا باہر چلو تا کہ ان شریفوں سے جان چھوٹے۔ کراچی آئے۔ یہاں سے جہاز میں بیٹھ کر بصرہ جا کر اترے اور بصرے سے شام کو ایک ٹرین میں بیٹھے۔ صبح جو آنکھ کھلی تو ہم یہ سمجھے کہ شریفوں سے بڑی دور نکل آئے۔ کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو صاف لفظوں سے لکھا تھا

''بغداد شریف'' لو ہم اتنے دور آ گئے یہاں بھی شریف لکھا ہوا ہے۔ ٹھیک ایک دو دن بغداد میں گزارے۔ ایک ٹیکسی والے سے کار کرائے پر لی اور کہا کہ اس سے ہمیں نجف لے چلو۔ اس نے کہا: بسم اللہ چلو۔

اب نجف روانہ ہوئے۔ جب نجف رہ گیا پانچ چھ میل تو اس نے کار روک لی۔ کہا: اُترو۔ اُتر کے پانی ہو تو وضو کر لو یا تیمّم کر لو، تیاری کر لو۔ کہا: کس بات کی؟ تو وہ دیکھو! سامنے۔ اب جو نظر گئی سامنے، دوسرے سے ایک طلائی مینار نظر آیا، ایک طلائی گنبد نظر آیا۔ یہ کیا ہے؟ یہ شہنشاہِ کائنات کا حرم ہے۔ یہ مولائے کائنات کی قیام گاہ ہے۔ یہاں جبرئیل اردلی ہے۔ میکائیلؑ پہریدار ہے۔ یہاں فرشتوں کا جھرمٹ ہے۔ یہاں انبیاء کا جھمگٹ ہے۔ یہاں کوثر تقسیم ہوتا ہے۔ یہاں علم کی خیرات بٹتی ہے۔ یہاں کے گداگر سلمان و سلیمان ہیں۔ یہاں ادب سے جانا، احترام سے جانا۔ بس میں کار یہاں روکتا ہوں۔ پیدل چل کے جاؤ۔

سبحان اللہ! روانہ ہوئے۔ عادت پڑی ہوئی تھی منہ سے نکل گیا یہ ہے نجف شریف۔ خدّام ادب سے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہا: خبردار شریف کی حد بغداد میں ختم ہوگئی۔ یہاں شریف نہ کہنا۔ اسے کہنا نجفِ اشرف۔ شریف نہیں ہے یہ ہے اشرف۔ یہ ہے شریف گر۔ اس کے صدقے میں شریف، شریف بنتے ہیں۔ یہ نجف اشرف ہے۔

چنانچہ نجف اشرف جا کے سلام کیا۔ مولاؑ کا حرم دیکھا۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ خدا ہر ایک کو دکھائے اور ہر ایک مؤمن نجف اشرف جائے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے، ماں کی گود میں آ گیا۔ دنیا کی ہر مصیبت بھول جاتا ہے آدمی نجف اشرف۔ اچھا یہ شرف ہے۔ ہاں! وہاں کی زیارت کی۔ وہاں سے جناب ایک قافلہ جا رہا تھا اس کے ساتھ چلے گئے، مکہ۔ مکے کو کیا کہنا ہے؟ بھئی کیا یہ بھی مکہ شریف ہے۔ یہ ہے شائر اللہ۔ جن کی تعظیم کا حکم ہے۔ اس لیے اُسے کہو! مکہ معظّمہ، اچھا یہ معظّمہ ہے۔ وہاں سے مدینے گئے، جناب اسے کہیں مدینہ شریف؟ کہا: نہیں۔ تمہیں پتہ نہیں کہ نورِ خدا کا مکان ہے اور اسے کہو مدینہ

منورہ۔ بہت اچھا! ایرانی قافلے کے ساتھ مشہد آ گئے۔ اسے مشہد شریف کہیں کہ نہیں اس گل و بلبل کی زمین میں امامت کا آستانہ ہے۔ اس لیے یہاں کی مناسبت سے کہو! مشہد مقدس۔ یہ مقدس ہے۔ اب سب جگہ دیکھ آئے۔ کوئی معظمہ ہے، کوئی مقدس ہے، کوئی منورہ ہے، کوئی اشرف ہے، یہاں شریف تھے۔ سب سے نمٹ کے ہم نے کہا کہ چلو اسے بھی دیکھ آئیں۔ جسے سارا سال رویا کرتے تھے۔

کربلا پہنچے۔ یہاں سوچا کھڑے ہو کے کہ اشرف کہیں، معظم کہیں، مقدس کہیں، کیا کہیں؟ تو غیبی آواز آئی کہ سارے الفاظ وہاں ختم ہو چکے ہیں۔ یہاں کہنا کربلا معلیٰ، یاد رکھو! بس دو ہی جگہیں معلیٰ ہیں۔ عرشِ معلیٰ یا کربلائے معلیٰ۔ دو ہی معلیٰ ہیں: یا عرشِ معلیٰ یا کربلائے معلیٰ ہے۔ نانا کی معراج نے عرش کو معلیٰ بنا دیا تو نواسے کی معراج کی یادگار ہے کربلائے معلیٰ۔ اس سرزمین پہ آ کے آج اٹھارہ نبیؑ زادے بیٹھ گئے۔ خیمے لگ گئے۔ خیمے بسنے کے لیے نہیں، بلکہ خیمے لگ گئے جلنے کے لیے اور اُتر کے خیموں میں پہنچ گئے یتیم ہونے کے لیے اور مستورات اُتر کے بیٹھ گئیں قید ہونے کے لیے اور قافلہ آلِ محمدؐ کا اس زمین پہ آ کے دو محرم کو اُتر گیا۔

آج میں اپنی گفتگو کو یہیں ختم کیے دیتا ہوں صاحبان! اور آج دل بھر کے روئیں۔ اللہ جانیں کل کی مجلس ہمیں نصیب ہو کہ نہ ہو۔ آج کی مجلس میں کربلا والو! تم آ گئے کربلا میں آج۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمیں بھی بلا لو کربلا میں۔ آ گئے کربلا میں اور خیمے لگ گئے، نہر کے کنارے خیمے لگ گئے۔ اپنی خریدی ہوئی زمین پہ خیمے لگ گئے۔ خیمے لگنے کے بعد وہی زمیندار جن سے زمین خریدی تھی۔ وہ آ گئے سب اکٹھے ہو کر۔ مولاؑ کو سلام کیا۔ آپؑ نے پیار سے محبت سے کہا کہ بھائی کچھ کہنا چاہتے ہو۔ مولاؑ! ایک گزارش لے کے آئے ہیں وفد بن کے۔ بتاؤ! کہ ہم نے جب گھر جا کے کہا کہ ''حسینؑ آئے ہیں۔'' تو ہماری عورتوں نے مکان کی چھتوں پر کھڑے ہو کر حضور کو سلام کیا۔ زیارت پڑھی اور جب ہم نے گھر جا کے کہا کہ ''حسینؑ کے ساتھ زینبؑ بھی ہیں'' تو ہماری عورتیں بے چین ہو گئی

ہیں۔انہوں نے ہمیں بھیجا ہے آپؑ کے پاس کہ مولاؑ اجازت دیں تو ہم آ کے زینبؑ کو سلام کرلیں۔

قبلہ ہم درخواست دینے آئے ہیں عورتوں کی طرف سے۔آپؑ کی خادمائیں چاہتی ہیں کہ اگر اجازت ہوتو بی بی کی زیارت کرلیں۔تو آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے کہ اس سارے قافلے کا سالار، منتظم اعلیٰ میرا چھوٹا بھائی ہے۔آپؑ لوگ اس کے پاس جائیں اور سب زمیندار قمر بنی ہاشمؑ کی خدمت میں گئے اور جا کے کہا: اپنے وقت کے ''محمدؐ'' نے ہمیں اپنے وقت کے ''حیدرؑ'' کے پاس بھیجا ہے۔آپؑ نے فرمایا: میں تمہارا مقصد سمجھ گیا ہوں مگر احتیاط رکھنا اپنی عورتوں سے کہنا کہ وہ گھر سے دو رکعت نماز زیارت پڑھ کے چلیں۔گھر سے یہاں تک درود پڑھتی آئیں۔تمام اس انتظام کے ساتھ وہ خواتین آئیں، جب آئیں تو آپؑ نے فرمایا کہ جن کے گود میں بچے ہیں، انہیں یہیں بٹھا کے جاؤ۔بچے بٹھائے اور عورتیں سانس روکے ہوئے کھڑی آرام سے امامؑ کے پاس ہو کر بی بیؑ کے قدموں میں گئیں۔بی بیؑ کو ملیں، بی بیؑ کا اخلاق دیکھا۔بچے باہر بیٹھ گئے۔ان کے بچوں کے بیچ میں آ کے بیٹھ گئے۔بیس پچاس بچے جو تھے امامؑ اُن سے پوچھتے ہیں بچو تم مجھے جانتے ہو؟ نادان بچے کہتے ہیں قبلہ! خوب جانتے ہیں۔آپؑ ''ہمارے امامؑ ہیں'' اچھا مجھے سمجھتے ہو میں امامؑ ہوں۔ہاں قبلہ! ہم نے پہچان لیا۔آپؑ ہمارے امامؑ ہیں۔اچھا بچو! میرا ایک کام کرو گے؟ کہا: حکم کریں۔کہا کہ ابھی چند دن بعد اس زمین پر حملہ ہو گا۔تمہارے بڑے حکومت کے ڈر سے ہماری لاشوں کے قریب نہیں آئیں گے۔تم بچے ہو نادان ہو تم کھیلتے ہوئے آ جانا اور یہ کھیل کھیلنا کہ ریت اُٹھا اُٹھا کے اُن لاشوں پہ ڈال دینا۔اس طرح ہمارا پردہ رہ جائے گا۔

قبلہ! ختم کرتا ہوں۔

ابھی آرام کیا بھی نہیں تھا۔آرام سے بیٹھے بھی نہیں تھے کہ وہ بے حیا قوم اُٹھ کے آ گئی۔نہر سے خیمے اُٹھاؤ یہاں ہمارے خیمے لگیں گے اور وہ مشہور معروف قصہ آپ نے سنا

ہوگا۔ اب میں آپ کو کیا سناؤں۔ اُدھر انہوں نے کہا کہ نہر سے خیمے اُٹھاؤ۔ شہزادیاں بچوں کو گودوں میں لے کر خیموں میں سہم گئیں۔ یہ لڑائی کیسی؟ یہ جھگڑا کیسا؟ یہ کیا قصہ؟ مولاؑ کے ساتھی برہم ہو گئے کہ یہ نہیں ہوگا۔ سپہ سالار افواج حضور قمر بنی ہاشمؑ جو خیمے نصب کر کے خیموں کے اندر بچوں کے پاس بیٹھے تھے۔ باہر سے شور کی آواز سنی تو وہیں سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ کا لفظ اس انداز سے کہا کہ آئی ہوئی فوج ٹھہر گئی۔ ساتھیوں نے قمر بنی ہاشمؑ کو بتایا کہ یہ خیمے اُکھاڑنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ خیموں کا اُکھاڑنا کیسا؟ کیا ہے؟ مجھے یہ نہیں جانتے؟ یہ خیمے نہیں اُکھاڑوں گا، ایسا نہیں ہوگا، میں کہتا ہوں کہ نہیں ہوگا، ایسا نہیں ہوسکتا۔ امام اُٹھے اپنی کرسی سے چھوٹے بھائی کے قریب گئے۔ کمر پہ جا کے ہاتھ رکھا۔ مڑ کے دیکھا، بھائی میری خاطر ایسا کرلو، غصہ نہ کرو۔

قبلہ! ایک فقرہ کہتا ہوں ذرا یہ فقرہ یاد رکھیں!

سر جھکا لیا، مولاؑ! پھر غصہ نہیں، کوئی بات نہیں۔ حضور کے حکم کا تابع ہوں۔ بات اتنی سی ہے میں اس بے حیا قوم کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری ماںؑ سے میرے، باپؑ نے عقد کیوں کیا تھا؟ بات ہو رہی تھی کہ ایک دفعہ فضہؑ آ گئیں! کہا: شہزادہ عباسؑ میں فضہؑ ہوں! ہاں اماں تو کیوں آئی؟ کہا کہ بی بی دروازے میں کھڑی ہے کہتی ہے: عباسؑ واپس آؤ ورنہ میں آ رہی ہوں۔ خیمے اُٹھالو۔ اب قیامت تک اس کے علَم کو سلام ہوگا۔

اُدھر حاجی اسمٰعیلؑ کی پیاس کی یادگار زمزم لاتے ہیں اور ہم اُٹھارہ نبیؐ زادوں کی یادگار خاکِ شفا لاتے ہیں۔ ہمارے لیے یہی بیماروں کا علاج ہے، مغفرت ہے، یہی عزت ہے، یہی آبرو ہے اور آج زمینِ کربلا آباد ہوگئی۔ اُجڑا ہوا بن بس گیا۔ اس کا معلیٰ نام ہے اور اب حسینؑ آباد ہے اور جن حضرات نے دیکھا ہو وہ تصور میں لا کے دیکھیں کربلا کو، کس شان سے آباد ہوا ہے۔ میرا حسینؑ خداوند توفیق دے سب کو وہ زمین دیکھیں۔ مرنے کے بعد تو ہم یقیناً وہاں جائیں گے، وہ جگہ جا کے دیکھیں جہاں فاطمہؑ کا دودھ خون بن کے بہا ہے۔ جہاں اٹھارہ نبیؐ زادے ہیں اللہ آپ کی مجلس قبول کرے۔

قلم

فضائل ..... قلم

مصائب ..... داخلہ کوفہ

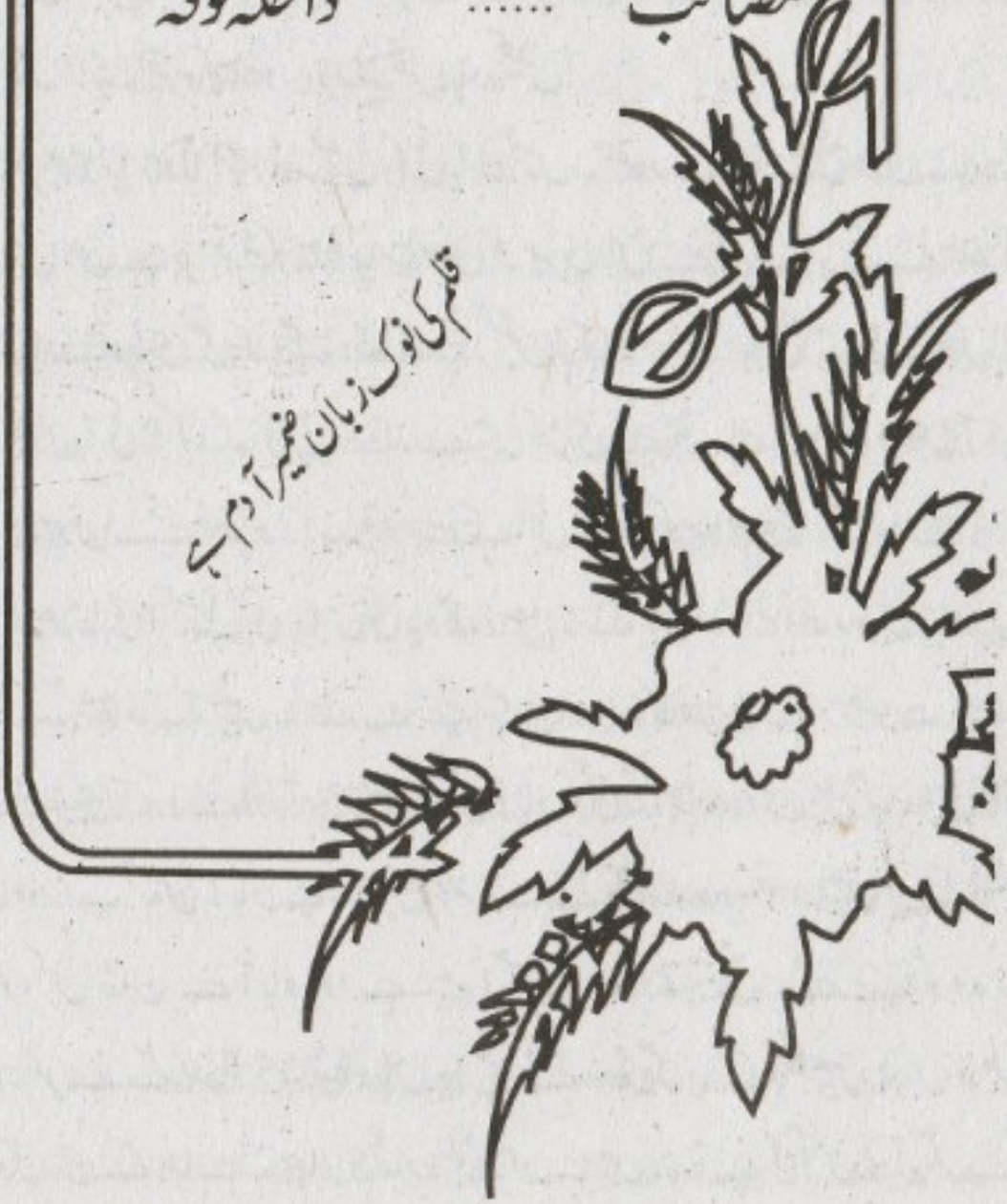

قلم

آج مؤمنین نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ آج کی گفتگو میں ذکرِ امیر المؤمنین کروں اور میں ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ میں سوائے ذکر امیر المومنینؑ کے اور کوئی ذکر کرتا ہی نہیں، کیونکہ ہر ذکر ہے ہی ان کا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہماری ہر مجلس جو ہم منعقد کرتے ہیں وہ عام حیثیت کی حامل نہیں ہوتی۔ نہ کوئی جلسہ ہے نہ کوئی یہ اجتماعِ عام ہے، بلکہ یہ ہماری بہت بڑی عظیم عبادت ہے۔ ہم عبادت کے طور پر یہاں جمع ہوتے ہیں اور یہ ہم عبادت کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس عبادت میں جو خصوصیات ہیں وہ کسی اور عبادت میں پائی ہی نہیں جاتیں۔

سب سے بڑی خصوصیت جو مجلس والی عبادت میں ہے، یہ ہے کہ باقی عبادتیں جو آپ کریں۔ مثلاً نماز پڑھیں، عبادت ہے۔ روزہ رکھیں، عبادت ہے اور زکوٰۃ دیں، خیرات کریں یہ سب چیزیں عبادت ہیں۔ لیکن اگر نماز اس نیت سے پڑھی جائے کہ لوگ مجھے دیکھیں گے کہ میں نمازی ہوں تو کیا پھر بھی نماز عبادت ہے؟ اگر نمازی کی نیت دکھاوا ہو نماز پڑھتے میں کہ لوگ دیکھیں گے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں اور دیکھ کر پھر اس سے مرعوب ہوں، متاثر ہوں، مجھے دیکھ رہے ہوں، کیا پھر بھی نماز عبادت ہے؟

اگر اس میں دکھاوا آ جائے، بناوٹ آ جائے، پھر بھی نماز عبادت ہے؟ اگر میں نماز پڑھ کر اس بات کو دل میں رکھوں نماز پڑھتے کہ کوئی دیکھ بھی رہا ہے کہ نہیں اور اس کا ثبوت اس طرح ملے کہ اُدھر میں نماز پڑھوں ادھر میں دیکھ لوں کہ کوئی دیکھ بھی رہا ہے یا نہیں؟ بتاؤ یہ کوئی نماز ہے؟ یہ کوئی عبادت ہے؟ یہ سب کچھ دکھاوے کی چیزیں ہیں۔ اسی طرح آپ

اور سوچیں کہ جتنی بھی عبادتیں ہیں اس میں بناوٹ آ جائے تو پھر وہ عبادت نہیں رہتی۔ ریا جس چیز کا نام ہے دکھاوا وہ ضائع کر دیتا ہے عبادات کو اور اللہ نے ایسا انتظام کیا ہوا ہے کہ وہ عبادت میں ذرا سا نقص آیا نہیں ہماری کسی خرابی کی وجہ سے اور اللہ اس کو معاف ہی نہیں کرتا۔ اس وقت فوری طور پر ہمارے نقص کی سزا دیتا ہے۔ اسی وقت کیا مجال جو معاف کرتا ہو اور باتیں تو معاف کر دیتا ہوگا۔ عبادت میں جہاں ہم نے مداخلت کی نہیں، اللہ نے اسی وقت سزا دے دی۔ اسے معاف ہی نہیں کرتا۔ نماز عبادت ہے، ٹھیک ہے۔

مولانا صاحبان علماء کرام تشریف فرما ہیں مجلس میں۔ یہ حضرات ہیں! ہماری درسی کتابیں لکھی ہیں: نماز، روزے کے مسائل بھی ہیں۔ اس میں یہ تمام مسلمانوں میں ہیں، ہمارے فرقے میں بھی ہیں۔ بڑی بڑی معتبر کتابیں ہیں تو ہمارے یہاں حضور تحفۃ العوام سے شروع کریں آپ اور چلتے چلتے اس سلسلے کی آخری کتاب تک پہنچ جائیں اور اسی طرح پکی روٹی سے لے کر آپ پہنچ جائیں جہاں تک چاہیں۔ سب نے یہی لکھا ہوا ہے کہ جو نماز قبول نہیں ہوتی اللہ اسے نمازی کے منہ پر دے مارتا ہے۔ یعنی وہ نماز نمازی کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔ جو نماز اللہ کو قبول نہیں ہوتی، کیوں منظور نہیں ہوتی جب میں پڑھا کرتا تھا ناں! یہ فقرہ ''نماز منہ پر ماردی جاتی ہے'' تو پوچھتا تو نہیں تھا کسی سے بلکہ دل میں سوچتا تھا کہ نماز کوئی اینٹ ہے؟ پتھر ہے؟ کیا شے ہے؟ جو منہ پر ماردی جاتی ہے اس لیے اور کوئی لفظ کیوں نہیں کہا گیا۔

بھئی! نماز قبول نہیں ہوتی مسترد ہو جاتی ہے، اور کوئی بات ہو جاتی۔ یہ کیوں! یہ جو منہ پر ماردی جاتی ہے۔ بچپن کی بات تھی یہ فقرہ یاد تھا، نماز منہ پر ماردی جاتی ہے تو میں ہر نمازی کا منہ دیکھتا رہتا تھا۔ اگر نماز پڑھ کر اس کا منہ ٹھیک رہا تو سمجھتا کہ نماز قبول اور اگر دیکھا کہ منہ اِدھر اُدھر ہو گیا تو سمجھتا کہ نماز منہ پر ماردی گئی ہے تو اللہ معاف نہیں کرتا ذرا سی بھی غلطی کو۔ روزہ ہے۔ آپ روزہ رکھیں اللہ کہتا ہے کہ بہترین عبادت ہے اور روزہ ایسی نیک نیت عبادت ہے کہ جس میں دکھاوا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارا کمرے کے اندر بھی روزہ

ہے۔ باہر بھی۔ اس میں دکھاوا ہو ہی نہیں سکتا مگر اس میں ہم نے سارا دن محنت کی۔ روزے میں اور روزہ رکھا کہ سبحان اللہ قرآن بھی سارا دن پڑھا اور روزہ بھی رکھا۔ شام کو افطار کا وقت آیا تو اس ڈر سے کہ کہیں ہمارا روزہ نامنظور نہ ہو جائے۔ اس خیال سے، ویسے بھی نیک کام میں جلدی کرنے کا حکم ہے۔ ہم نے نیک کام میں جلدی کی اور چند منٹ پہلے افطار فرمالیا، ہم نے روزہ کو۔ اللہ نے کہا: اچھا یہ حرکت ہے۔ تم نے چند منٹ پہلے افطار کیا ہے۔ اس کے بدلے میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ رات کو دو گھنٹے کھڑے رہو۔ اگر حوصلہ چند منٹ کرلیا ہوتا تو آرام سے سوتے۔

یہ عبادتیں ہیں۔ ان میں اگر ذرا سی بھی خرابی آ جائے تو وہ خراب ہو جاتی ہے۔ ان عبادتوں میں یہ لمبی تشریح طلب باتیں ہیں۔ چونکہ مجالس محرم ہیں حضور! یہ مجالس آپ کے لیے ہیں۔ اس لیے بات کروں گا آپ ہی سے، جن عبادتوں میں دکھاوا ہوتا ہے وہ عبادتوں کو ضائع کر دیتا ہے اور یہ جو مجلس ہے ہماری خداوند عالم! ہر مومن کو اس عبادت کی توفیق عطا فرمائے۔ اس عبادت میں یہ کمال ہے کہ دل سے ہو تب عبادت، بے دلی سے ہو تب عبادت۔ اس میں دکھاوا بھی عبادت، رولو تب عبادت، رلاؤ تب عبادت اگر دکھلاوا ہی ہو تو رونے کی شکل بنادو، تو بھی عبادت، یہ ہر حالت میں ہر طرح سے عبادت ہے۔

آپ حضرات کو یہ بھی تجربہ ہوگا کہ نماز میں بھی ذہن میں دو چار خیال آ جاتے ہیں۔ دو رکعت ہو تو بھی چند خیال آ جاتے ہیں۔ یہ ایسی عبادت ہے جس میں ہم بیٹھے ہیں۔ جتنی دیر ہم بیٹھے ہیں بس خیال ایک ہی رہتا ہے۔ اب اگر پڑھنے والا یہ سمجھے کہ میرا کمال تو غلط ہے۔ اس میں نہ پڑھنے والے کا کمال ہے، نہ کسی بولنے والے کی خاصیت ہے۔ یہ سب اسی کا اقبال ہے جس کا ذکر ہو رہا ہے۔ بات یہاں ہو رہی ہوتی ہے مگر تصور یا خیال وہاں ہی پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ یہ سب اقبال ہے اُس کا اور جو ہم مجالس کرتے ہیں خواہ وہ سال بھر میں ہوں یا محرم میں ہوں اُس کے دو جُز ہیں۔ پہلے ہم فضائل بیان کرتے ہیں بعد میں اپنی داستان سناتے ہیں۔

بھئی! پنجاب میں کئی مرتبہ میرے ساتھ ایسا ہوا ہے میں نے معافی مانگی ہے مومنین سے کہ سامعین مجھے معاف کرنا میرا دل نہیں چاہتا کہ آپ روئے جائیں۔ میرا دل آپ کو رُلانے پر خوش نہیں، مگر کیا کروں کہ ہماری کہانی ہی ایسی ہے۔ پہلے ہم تھوڑے سے فضائل بیان کرتے ہیں۔ فضائل ہم کیا بیان کریں گے اُن کے، ہمیں تو ان کے فضائل کا علم ہی نہیں۔ اس کے بعد مصائب بیان کرتے ہیں۔ یہ دو جز ہیں مجلس کے، فضائل اور مصائب۔ فضائل میں اکثر مجالس میں فضائل امیر المؤمنین بیان کرتے ہیں اس کے بعد مصائب ہوتے ہیں۔ یہ ذکر امیر المومنینؑ ہم کیوں کرتے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے میرے ذہن میں، ہر مجلس میں امیر المومنینؑ کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔ ہم اُن کی زندگی کے کس گوشے کو بیان کرتے ہیں۔ اب اگر وہ فضائل بن جائے تو یہ الگ بات ہے۔

ہم کہتے ہیں بیٹھے تھے۔ یہ کون سی بات ہے کہ اب اگر اُن کا بیٹھنا فضائل بن جائے ہم کہہ دیں کہ وہ جا رہے تھے۔ اب اگر اُن کا جانا فضائل بن جائے تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے کہا کہ ایک رات بھائی اس نے دیکھا کہ وہ سو رہے تھے، اب بتاؤ ان کا سونا اگر فضائل بن جائے تو اس میں میرا کیا قصور؟ کوئی گوشہ ان کی زندگی کا ایسا نہیں جس پر ان مجلسوں میں ہم تبصرہ نہ کرتے ہوں اور ساری زندگی اس انسان کی جسے آپ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کہتے ہیں ساری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے ہے۔ ایک سیکنڈ بھی ان کی زندگی کا لوگوں کی نظروں سے اُوجھل نہیں۔

آپ کسی بھی اسلامی ممدوح کی زندگی لے آئیں دس سال ان سے غائب رہا، پھر آ کے ملا، کوئی بیس سال بعد ہم سے آ کے ملا، کوئی چالیس سال بعد ہم سے آ کے ملا، یہ وہ انسان ہے جس کی زندگی کا ایک سیکنڈ بھی ہماری نظروں سے غائب نہیں۔ ایک سیکنڈ بھی۔ کوئی گوشہ چھپا ہوا ہے نہیں دنیا کی نظروں سے۔ بالکل صاف کھلی زندگی آپ کے سامنے۔ جس دن سے دنیا میں پہلا قدم رکھا ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں آیا کہ دنیا کی نظروں سے غائب

زندگی گزاری ہو۔ مثلاً جنہیں آپ سے میں دس سال بعد ملا ہوں۔ اب میں یہاں بیٹھا ہوں آپ کے سامنے کراچی۔ جب سے پاکستان بنا ہے اس سے پہلے بھی میں آتا تھا اور آپ حضرات سے تعارف ہے ہی۔ بہت سے حضرات تو ایسے ہیں جو سچ مچ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بڑا پیار کرتے ہیں اور آپ سب حضرات سید الشہداءؑ کے ذکر کرنے کے اعتبار سے میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ اب اگر میں اکڑ جاؤں کہ میرا یہ اعزاز ہے کہ میں سب سے بڑا ہوں۔ اگر یہاں کراچی میں خدانخواستہ کیس بن جائے تو گورنمنٹ تصدیق کرے کہ اس کا چال چلن ٹھیک ہے۔ اس نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔ میں سارے کراچی والوں کو لے جاؤں کہ ان سے پوچھ لیں۔ گورنمنٹ کہے گی کہ کراچی کی بات نہیں بات لاہور کی ہے۔ تو آپ کہیں گے کہ ہم تو اس وقت سے جانتے ہیں جب سے آئے ہیں یہ کراچی میں۔ فیصلہ ہو گیا کہ ''یہاں'' کے ساتھ ہونے والوں کو ''وہاں'' کا کیا پتہ؟ میری زندگی کی گواہی وہی دے سکتا ہے جو وہاں سے آیا ہو جہاں سے میں آیا ہوں۔ جو ساتھ ساتھ رہا ہو وہ کہہ دے گا کہ ساتھ رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں اکٹھے رہتے تھے۔ مکان ساتھ تھا۔ جی نہیں ایک ہی مکان میں میرا اصلی گواہ وہی بن سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جس کی زندگی پوشیدہ رہی ہو لوگوں سے وہ ممدوح نہیں ہو سکتا اور ایک بات کروں میں آپ لوگوں سے، اللہ سے دوسرے نمبر مشہور ہے علیؑ، یہ میں نے، اللہ ادب سے کہہ دیا ہے۔ ورنہ اللہ سے زیادہ مشہور ہے۔ خدا گواہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے نا! تو اللہ کے سوا کسی کا نام لینے کو بدعت کہنے والے شور مچا مچا کے ''یا علیؑ'' کہتے ہیں۔

میں مولاؑ سے کہتا ہوں کہ مولاؑ آپ بالکل مدد نہ کریں ان کی، جب ان کا کام ہو جائے گا یہ پھر مکرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ اب آپؑ کو پکارنے بیٹھے ہیں تو مولاؑ مجھ سے کہتے ہیں کہ فکرمند کیوں ہو، ضد نہ کرو، مجھ سے ان کا تعلق ہی اتنا ہے کہ عیش میں جسے چاہیں پکار لیں، آرام میں جسے چاہیں پکار لیں۔ سید نے کب اعلان کیا ہے کہ میں ''راحت کشا'' ہوں۔ میرا تو اعلان ہی یہ ہے کہ میں مشکل کشا ہوں۔ مجھے کیونکہ وہ بلاتے ہی مشکل میں

ہیں اور یہ میرا فرض ہے۔ امیر المومنینؑ کی ساری زندگی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ خیر! اب اللہ ایک ہے، ہے ناں! اللہ بھی ایک، علیؑ بھی ایک اور اگر میں یہ فقرہ کہہ دوں کیا کروں میرے پاس اس کے علاوہ الفاظ نہیں ہیں کہ میں اسے ادا کر سکوں۔ بوجہ میرے جاہل ہونے کے۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ اللہ ایک نہیں تو سب کہہ دیں گے کہ دیکھو جی! یہ پاگل مولوی منبر پر کہہ رہا ہے کہ اللہ ایک نہیں ہے حالانکہ میرا ایمان یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ بچپن میں معلم نے ہمیں سبق دیا ہم یاد کرنے بیٹھ گئے کہ ایک دو تین چار۔ انہوں نے کہا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ کہا کہ گنتی یاد کر رہے ہیں ایک دو تین چار۔ انہوں نے دریافت کیا کہ یہ ایک کیا ہے؟ ایک کسے کہتے ہیں؟ کہ جی ایک ''ایک'' کو کہتے ہیں تو جو انہوں نے ایک کے معنی بتائے تو وہ یہ تھے۔ فرمانے لگے کہ ایک کے معنی یہ ہیں کہ دو آدھوں کا مجموعہ۔ علم ہندسہ میں ایک کے معنی یہ لکھے ہوئے ہیں: دو آدھوں کا مجموعہ۔ کیا ہوا ایک؟ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اللہ ایک ہے؟ یہ بتاؤ کہ اللہ ایک ہے؟ دو آدھوں کا مجموعہ کیا بنا؟ ایک۔ اب بتاؤ کہ اللہ ایک ہے؟ بولو! دو، کا آدھا کیا ہوا؟ ایک۔ اللہ ایک؟ پہلے تو آدھے آدھے تھے اب ایک میں عرض کرتا ہوں اللہ ایک ہے۔ ایک کے لیے آئے گا ''واحد'' اور اللہ کہتا ہے کہ میں ہوں ''احد'' تو خدا ہے احد۔ ''احد'' کہتے ہیں ایک کے خالق کو، ایک کا پیدا کرنے والا، تو گویا معلوم ہوا کہ اللہ نے جو پہلی شے بنائی ہے وہ ہے ایک۔ پہلی مخلوق خدا جو ہے وہ ہے ''ایک''۔ اب ایک کے معنی کر دو آدھوں کا مجموعہ۔ پہلی مخلوق نبی وہ ہے دو آدھوں کا مجموعہ۔ جب یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ کسی طرح کہ دو آدھوں کا مجموعہ ایک ہے۔ اب ہمیں سمجھانے والے ہمیں بنانے والے نے ہمیں بتایا کہ سب سے پہلے قلم بنایا یہ حدیث بھی ہے کہ:

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَم

''اللہ نے سب سے پہلے قلم بنایا۔''

''قلم'' جو بچوں کے پاس عموماً ہوتا ہے لکھنے کے لیے۔ یہ ''قلم'' ہمیں جو کان سے

بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں ویسے شگون نیک ہے۔ مولانا صاحبان کہتے ہیں نوجوانوں سے کہ داڑھی رکھو اب یہاں تک کہ تو آ گئی ہے.....

سب سے اللہ نے بنایا۔ قلم کا نام آتے ہی ذہن میں آتا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے ایک بنایا، قلم بنایا یعنی ایک بنایا۔ اب آپ قلم بنا کے دیکھ لیں۔ میں پہلے بھی کہتا تھا کہ آج بھی کہتا ہوں پہلے کسی اور لہجے میں کہا تھا آج کسی اور لہجے میں کہتا ہوں۔ بات کرنی پڑتی ہے میری عمر کے، یا جو مجھ سے بڑے ہیں وہ قلم بنانا جانتے ہیں۔ اب تو بازار سے بنا بنایا قلم مل جاتا ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں قلم کسے کہتے ہیں؟ اور قلم بھی ایسا جس میں دوات بھی ساتھ ہو۔ ایسے ڈرے ہوئے ہیں قلم و دوات سے کہ اب ایسا قلم لیتے ہیں جس میں دوات بھی موجود ہو۔ انہوں نے قلم بنایا ہی نہیں، قلم بنانے والے جانتے ہیں قلم بنانا کیا ہے؟ کہ چھیل دیا چاقو سے ''کانا'' کو تو کیا قلم بن گیا؟ نہیں بنا۔

کیوں بھئی! کیسے نہیں بنا کہ جب تک ''ایک'' کے دو نہ ہوں قلم نہیں بنا۔ قلم کہتے ہی اسے ہیں کہ جو ہوا ایک، مگر ہو جائے دو۔ قلم کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایک ہو دو ہو جائے اور دو کس طرح؟ ایسا دو نہیں کہ دو ہو کر بالکل علیحدہ علیحدہ ہو جائے۔ دو ہونے کے باوجود حرف ایک اور اگر معمولی سا ''ریزہ'' بھی آ جائے ان دو کے درمیان تو قلم کو کچھ نہیں ہوگا۔ ''قلم'' ہی رہے گا۔ اگر اس کے بیچ میں کچھ بھی آ جائے ہمارا لکھا بگڑ جائے گا۔

اب ایک بات تو آپ حضرات سے کہنی باقی رہ گئی۔ لو جی یہ دو بھی ہو گیا تو کیا کام بن گیا؟ دو ہو گیا اب اس کو لگایا ''قط'' اب جو قط لگایا تو کیا بالکل سیدھا لگایا قط سیدھا لگایا۔ ٹیڑھا۔ کیا کہا؟ سیدھا بھی غلط، بالکل ٹیڑھا بھی غلط، معمولی سا ترچھا، کیا بن گیا؟ فقط ذرا سا ٹیڑھا۔ اس طرح کہ ایک حصہ ذرا بڑا بن گیا اور ایک حصہ چھوٹا ہو گیا۔ ایک ذرا بڑا ہے ایک ذرا چھوٹا ہے۔ اس طرح اللہ نے ایک بنایا تھا اور میں بیان کو اس طرح ختم کرتا ہوں۔

خداوند عالم آپ کو مع اولاد عزیز و اقارب کے خوش رکھے سلامت رکھے۔

کسی کے دو بیٹے ہوں نا! ایک بڑا ایک چھوٹا۔ دونوں ایک ہی ماں باپ کے بچے مگر بڑا ذرا خاموش ہے اور چھوٹا بات بات پر ضد کرتا ہے اور والدین کو ناز برداریاں کرنی پڑتی ہیں دونوں بیٹوں کی۔ میں نے محرم کی مجالس میں دیکھا کہ گھر میں مجلس پر چلتے ہوئے گھر میں بزرگ بات کرتے ہیں کہ بچے ذرا سا سو جائیں تو مجلس پر چلتے ہیں۔ یہ رات کی مجلسوں میں عموماً ہوتا ہے۔ مجلس میں جا کے یہ سو جائیں گے اور ہمیں اُٹھا کے لانا پڑیں گے۔ یہ سو جائیں تو چلیں گے۔ بڑے سے کہا کہ تم ساتھ چلے چلو۔ چھوٹے کو سو لینے دو۔ اسے سلا دو! اب بڑا ساتھ جا رہا ہے۔ جب چلنے لگے تو بڑے کو دیکھ کر چھوٹے کی آنکھ کھل گئی۔ ابا میں بھی، ابا مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ اب سوچا کہ یہ وہاں جا کر سو جائے گا۔ وہاں جا کے اور گود میں اُٹھا کے لانا پڑے گا۔ یہ یہیں رہ جائے تو اچھا ہے۔ اسے کہا کہ تم یہیں رہو اور ضد کر بیٹھا کہ بڑا جو جا رہا ہے میں بھی جاؤں گا۔ بھئی کیوں؟ اسلیے کہ مجلس میں جانا تو مؤمن کی معراج ہے۔ جب بڑا بھائی معراج میں جائے تو کیوں پیچھے رہ جاؤں؟ جب بڑا جائے تو چھوٹا کیوں نہ جائے۔ اب باپ کو یہ کہہ کر سمجھانا پڑا کہ بیٹے تم یہیں سوئے رہو جو بڑے کو وہاں جا کے تبرک ملے گا تمہیں یہیں ملے گا۔ یہ کہہ کر چل دیے۔ اب وہاں جا کے بڑا کیا دیکھتا ہے کہ چھوٹے برخوردار پہلے ہی سے وہاں موجود ہیں۔ تو یہ سادہ سی بات تھی جو میرا طریقہ ہے گفتگو کرنے کا۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ سب سے پہلے اللہ نے قلم بنایا، قلم۔

معاف کرنا حضور بات ختم کر رہا ہوں کہ آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاءؐ سبحان اللہ! کیا مجال جو کسی نبیؑ کی نبوت میں بھی ذرا سا بھی شک ہو۔ معاذ اللہ! شک آیا نہیں اور اسلام سے گیا نہیں اور اگر کسی سے کسی کی زبان سے ذرا بھی شک کا لفظ نکلا نہیں نبیؑ کے معاملے میں تو ''محفل'' میں رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب دیکھیے نبیوں پہ ہمارا ایمان ہے۔ ان کے فضائل بیان کرنے پڑیں تو انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔ تو ایک بات بتاتا ہوں کہ کمالات انبیاء اگر سمٹ جائیں تو علیؑ اور کمالاتِ علیؑ اگر بکھر جائیں تو انبیاء۔ اب اس کے فضائل سنانا، اس کا ذکر سنانا، میرے بس کی بات نہیں۔ ویسے بھی آج میں آپ کو

فضائل سنانے نہیں آیا۔ آج میں اس لیے آیا ہوں یہاں کہ یہاں مجلس تک تو گھر سے آ ہی گئے ہو اب تصور کی دنیا میں چلیں۔ فضائل تو سارا سال آپ سنتے ہیں تو آج ہم مولا کے حضور صرف اس لیے حاضر ہوئے ہیں۔ اس لیے آئے ہیں کہ مولا ہم سے پرسہ لو۔ ہمارا پرسہ قبول کرو۔

مولا! ہم ساری رات صرف اس لیے نہیں سوئے کہ آپؑ کے بچے رات نہ سو سکے تھے۔ ویرانے جنگل، بیابان علاقے پریشانی کا عالم اور آلِ محمدؐ کا خاندان۔ تصور کی دنیا میں حضرت امیر المومنینؑ کو دیکھا۔ مولا! آج ہم سب غلام چل کے آئے ہیں۔ ہم حاضر ہوئے ہیں آپؑ کو پرسہ دینے کے لیے۔ کہیے حضورؑ مزاج تو بخیر ہیں آپؑ کے۔ مولا! آنکھوں کو کیا ہو گیا، کیا جاگتے رہے ہیں؟ کہا: ہاں! میرے بچے رات بھر سوئے نہ تھے۔ مولا خیر تھی؟ کہا: ہاں کہ اور تو سبھی ابھی زندہ ہیں ایک بیٹی بیوہ ہو گئی ہے۔ قبلہ کس کا انتقال ہو گیا؟ کون چل بسا؟ کہا کہ میرے بھائی عقیلؑ کے بیٹے، مسلمؑ کا۔ میرا داماد تھا، میری بچی بیوہ ہو گئی ہے۔ کہا: مولا کہ ہم کراچی کے تمام غلام حاضر ہیں، چلیں آپؑ کے داماد کے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے۔ حضور والا کہتے ہیں کہ جنازہ اُٹھتا تو شرکت کرتے۔ جنازہ کیسے اُٹھتا کہ دنیا بھر کے مسلمان عید منا رہے تھے۔ لوگ کپڑے بدل بدل کے عیدگاہ کو جا رہے تھے۔ بیٹوں کو عیدی دی جا رہی تھی اور ہمارے مسلمؑ کے پاؤں میں رسی بندھی ہوئی تھی، یہ حالت تھی۔ لاش بازاروں میں گھمائی جا رہی تھی اور منادی ندا دے رہا تھا نماز پڑھنے کے لیے جانے والو! محمدؐ کی سکھائی ہوئی نماز پڑھنے والو! یہ محمدؐ کے خاندان کی فرد ہے۔ کسی مسلمان نے نماز تک نہ پڑھی اور سر کو بھیج دیا گیا دمشق اور لاش کوفے کے بازاروں میں۔

بس صاحبان ذوق!

آج دو جملے کہنے ہیں آپ کی مجلس میں۔ مولا سے کہنا کہ مولا ہمارا پرسہ قبول کرو۔ یہ لاش زخمی بھی ہوئی۔ اس لاش کے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کوفہ کے بڑے دروازے پر

لٹکا دیا گیا۔ بڑا دروازہ کوفے کا جو بھی گزرتا پوچھتا کہ یہ کون تھا؟ کہا جاتا سنا ہے محمدؐ کا رشتہ دار ہے۔ لاش رہی دروازہ پر۔ محرم کی چودہ آ گئی۔ ایک مہینہ اور پانچ دن ہو گئے لاش کو وہاں رکھے ہوئے۔

بڑے غور سے سننا بھئی یہ بات!

اور چودہ محرم کو کاروانِ آلِ محمدؐ پہنچا کوفہ میں۔ میں کھل کے بات نہیں کرتا۔ میں خود بھی سید ہوں اور بھی سید ہوں گے برا مان جائیں گے یہ جملہ سن لیں۔ بس امت نے اپنے نبی کی بیٹیوں کے ہاتھوں میں زیور پہنائے ہوئے تھے۔ سر نیزوں پر ہیں کہ دروازہ سے قافلے کا گزر ہوا دروازے سے آواز بلند ہوئی کہ ''اے اہلِ بیتِ رسولؐ! میرا اسلام قبول ہو۔'' اے فرزند رسول! اکبرؑ کا پرسہ قبول کر، اسیروں میں کہرام مچ گیا۔ قافلے سے جو دو بچیوں نے جو لاش دیکھی تو بے ساختہ منہ پیٹ لیا، بابا! ہمارے بھائی کہاں ہیں؟ ہمیں بھائی سے ملا دو۔

مؤمنین! اللہ آپ کی مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔ بحق محمدؐ و آل محمدؐ

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

امام بارگاہ شاہِ خراسان، کراچی

ذکر

فضائل ...... علی علیہ السلام

مصائب ...... زمزم کی کہانی

ورود کربلا

خطابت جو دربار کے زینب

یا کوفہ کے منبر پہ علی بول رہے ہیں

(انور عباس زیدی)

ذکرِ علیؑ عبادت ہے

خداوند عالم آپ کی یہ مجلس قبول فرمائے۔ اللہ آپ کا مجلس میں آنا قبول کرے اور مرے انتہائی پیارے عزیزوں نے جو مجلس کی ہے، اللہ ان کی سعی کو قبول فرمائے۔ مجھ سے پہلے میرے محترم شبیہ الحسنین صاحب محمدی کہہ رہے تھے کہ ''علیؑ کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔'' یہ انہوں نے کہا تھا کہ علیؑ کے چہرے کا دیکھنا عبادت ہے۔ یہ ان کی خاندانی بات ہے۔ انہوں نے اپنے خاندان کی بات کہی ہے۔ آپ کو پتہ ہے یہ محمدی ہیں۔ حضرت محمد بن ابی بکر کی اولاد ہیں۔ حضرت ابوبکر کے صاحبزادے محمد کی یہ اولاد ہیں۔ ان کے دادا حضرت ابوبکر راوی ہیں اس روایت کے کہ ''علیؑ کا چہرہ دیکھنا عبادت ہے۔'' یہی ایک بات کہہ کے وہ صدیق کہلاتے ہیں۔

یہ انہوں نے فرمایا اور ان کی تائید و تصدیق ہم مؤمنوں کی ''اماں'' نے بھی کی ہے کہ میرے ابا نے بالکل ٹھیک کہا کہ واقعی علیؑ کے چہرے کا دیکھنا عبادت ہے۔ چاہے کسی عالم میں بھی دیکھا جائے۔ اس کے چہرے کا دیکھنا عبادت ہے۔ انہوں نے یہ اپنی خاندانی حدیث پڑھی ہے کہ علیؑ کے چہرے کا دیکھنا عبادت ہے۔ حضرت ابوبکر کا فرمان ہے یہ: ''علیؑ کا چہرہ دیکھنا عبادت ہے، علیؑ کا منہ دیکھنا عبادت ہے۔'' مگر معاف کرنا یہ ''منہ دیکھی'' بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا چہرہ دیکھنا ہی عبادت نہیں، بلکہ اس کا تصور بھی عبادت ہے۔ اس کا خیال بھی عبادت ہے۔ اگر علی کا ذکر کروں تو وہ بھی عبادت ہے۔ کیا ذکر کرو گے علیؑ کا، کیا تذکرہ کرو گے علیؑ کا، جہاں سے شروع کرو، علیؑ کا ذکر عبادت بن جائے گا۔ کہیں سے شروع کر دو علیؑ کا ذکر عبادت بن جائے گا۔ میرے کندھے پر دو فرشتے

اللہ نے بٹھائے ہوئے ہیں۔ اب یہ پندرہ بیس فرشتے (ٹیپ ریکارڈر) سامنے آ کے بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ جو کہو یہ نوٹ کر لیتے ہیں۔ میں تو ایمان سے مجلس میں آ کے گھر جاتا ہوں۔ ایک طرف یہ حضرات! ایک طرف ذات شریف۔ ان سے ذرا اِدھر اُدھر منہ کروں پھر معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔ کندھے والے، یہ میرے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ یہ میرے صحابی ہیں جہاں جاؤں ساتھ جاتے ہیں۔ یہ میری عبادت کے راوی ہیں۔ صحابی بھی ہیں۔ میری بات کو دور دور تک پہنچانا بھی انہی کا کام ہے۔ یہ اگر بگڑ جائیں تو کام بگڑ جائیں لہٰذا ٹھیک رہیں تو کام ٹھیک رہے۔ ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ہر لمحہ میرے ساتھ ہیں۔ کئی دفعہ میں نے کہا ہے کہ میری طبیعت ذرا خراب ہے تم میری جگہ جا کہ پڑھ آؤ۔ اتنی دیر سے میرے ساتھ رہے ہو میری جگہ نہیں آ سکتے۔ یہ کہتے ہیں کہ آپ کی جگہ کیسے جائیں تو کرائے پر۔ یہ کرائے کا ساتھی کام نہیں دیتا۔ ایک یہ بزرگ (ٹیپ ریکارڈر) میری جان نہیں چھوڑتے۔ اب کیا کہیں میں گھر گیا ناں! بیچ میں تو علیؑ کا ذکر جہاں سے تم شروع کر دو، کہیں سے بھی تم شروع کر دو، عبادت بن جائے گا۔

اگر کوئی کہے علیؑ کی پیدائش کا ذکر کر دو تو عبادت بن جائے گا۔ علیؑ کی پیدائش کے ذکر کا کسی نے کہا یہاں سے ذکر شروع کرو ہاں بھئی کر دو! اچھا بھئی کہاں پیدا ہوئے؟ کعبہ میں، بیت اللہ میں۔ کہاں پیدا ہوئے؟ اللہ کے گھر۔ اللہ کا نام آیا نہیں عبادت بنا نہیں۔ اللہ کے گھر پیدا ہوئے؟ ہاں بھئی! اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ اللہ کے گھر خوشامد کر کے پیدا نہیں ہوئے۔ اللہ کی خوشامد نہیں کی تھی، بلکہ زور سے پیدا ہوئے۔ دیواریں توڑ کے پیدا ہوئے۔ یہ عبادت ہو گئی اور ماں کے ساتھ تین دن اللہ کے گھر رہے۔ فاطمہ بنت اسدؑ کے ساتھ تین دن اللہ کے گھر میں رہیں۔ تین دن کے بعد آپ کے رسول کو حکم ہوا جاؤ لے کے آؤ۔ تیسرے دن رسولؐ نے کہا: قبلہ! قرآن تو میرے گھر خود آیا ہے۔ کہا: وہ اور بات ہے یہ اور بات ہے۔ دیکھو نا! میں آپ کو خط لکھوں تو خط کو ڈاکیا آپ کے گھر تک پہنچا جائے گا یا نہیں؟ اور جو میں خود آ جاؤں تو مجھے لینے جاؤ گے۔ یہ قرآن اس کا خط تھا۔ اسے

پوسٹ میں لے جاتا تھا۔ اسے خود لینے جاؤ۔ اب جو رسولؐ پہنچے لینے دروازے پر۔ دروازہ پھر کھلا اور بنت اسدؑ یا ام اسدؑ، اسدؑ کی ماں بھی اسدؑ کی بیٹی بھی بچے کو گود میں لے کر آئی۔ رسولؐ نے گود میں لے لیا۔ قصہ مختصر عبادت بنی جا رہی ہے۔ اماں مبارک! ماشاء اللہ بڑا سوہنا بچہ ہے۔ ماں نے کہا: محمدؐ بچہ جئے گا نہیں۔ اس میں جینے والی کوئی بات نہیں۔ تین دن ہو گئے نہ اس نے دودھ پیا نہ اس نے آنکھ کھولی، نہ یہ رویا، تو یہ جئے گا کیسے؟ کیونکہ اس نے آنکھ نہیں کھولی تھی۔ کیا نہیں۔ کہا: اے، اے لو! یہ کھول دی۔ آنکھ کھل گئی اور یہ بتاؤ کہ تم نے دودھ کیوں نہیں پیا، روئے کیوں نہیں؟ کہا: اس میں ضد کی کیا بات ہے؟ قبلہ خدا کا گھر تھا، کعبہ۔ اس میں ماں تھی اکیلی۔ ساتھی ہو کے رونا کوئی شرافت ہے؟ دودھ نہیں پیا؟ کہا: بڑی بھوک لگ رہی ہے مگر ماں کا دودھ کیوں نہیں پیتا؟ آپ نے اللہ سے درخواست دے کر مجھے بطور گواہ بلایا ہے۔ میں گواہ ہو کے آیا ہوں۔ آپ نے ''طلبانہ'' داخل کروایا ہے تو آیا ہوں۔ آپ ہیں مدعی اور میں ہوں گواہ۔ پھر میں اپنی ماں کا دودھ کیوں پیوں؟ گواہ کا خرچہ خود مدعی کے ذمے ہے۔ رسولؐ نے زبان دی تو اس میں سے دودھ جاری ہوا۔

بقول پنجابیوں کے ''رج کے پیا'' خوب پیا۔ پیٹ بھر گیا۔ چھوٹے چھوٹے ننھے ہونٹوں میں زبان مضبوطی سے پکڑ لی۔ بھئی چھوڑو بھئی! اسی طرح گھر تک پہنچے۔ رسولؐ کی گود میں علیؑ ہیں۔ گھر والے سب اکٹھے۔ ابی طالبؑ بھی ہیں۔ بچے نے آنکھوں آنکھوں میں سب بزرگوں کو گواہ بنایا کہ محمدؐ پیدا ہوتے ہی مجھے زبان دے چکے ہیں۔ اب اس ذکر سے بھی ہماری عبادت ہو گئی۔ اب تمام لوگ پوچھنے لگے محمدؐ بچہ کس شکل کا ہے۔ محمدؐ خاموش۔ آ کر گھر کے مالک نے وحی کے ذریعے بتایا۔ محمدؐ کہہ دو ہاتھ ید اللہ ہے۔ آنکھ عین اللہ ہے۔ زبان لسان اللہ ہے، جسم جسد اللہ ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ علیؑ کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ، علیؑ کا چہرہ اللہ کا چہرہ، علیؑ کا چہرہ اللہ کا چہرہ، علیؑ کا جسم اللہ کا جسم، علیؑ کی زبان، اللہ کی زبان تو اربابِ ذوق کے لیے ایک فقرہ کہتا ہوں کہ الگ الگ اجزاء کرو تو اللہ اور اتنے اللہ اکٹھے

ہو جائیں تو علیؑ۔ عجیب بندہ آ گیا جسے آج تک علیؑ والے اللہ کہتے ہیں اور اللہ والے علیؑ کہتے ہیں۔ سمجھ میں آیا کہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ ایسے کا ذکر عبادت ہے کہ نہیں، تو میں عرض کر رہا تھا علیؑ نے محمدؐ کی زبان سے دودھ پیا، جو علیؑ سے بچ رہا تھا۔ وہ بچوں نے باپ کا مال سمجھ کے پیا۔ بچوں کی بات اور تھی علیؑ کی بات اور تھی۔ علیؑ ایک دفعہ دوشِ رسولؐ پر سوار ہوئے اور تم نے کہا سبحان اللہ! اور بچوں نے اس کو کھیل کا میدان بنا دیا۔ جب دیکھو کاندھے پر سوار رسولؐ مسجد میں جا رہے ہیں۔ یہ کاندھے پر سوار مگر وہ بچے تھے ہی اس قابل کہ بچے راکب بنیں اور رسولؐ مرکب بنیں اور وہ کہیں مہار چاہیے۔ رسولؐ نے زلفیں پکڑا دیں۔ بیٹا یہ باگ ہے۔ اب بچوں کے ہاتھ میں رسولؐ کی زلفیں نہیں تھیں بلکہ باگ تھی اور باگ کے معنی یہ ہیں جدھر موڑ دیں مڑ جائے۔ جدھر پھیر دیں پھر جائے۔ رسالت کی باگ ان بچوں کے ہاتھ میں تھی اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اتنی بڑی رسالتوں کی باگیں سنبھالنا تو ان کے بچوں کا کھیل تھا، یہ بچوں کی شان تھی۔ اس انداز سے پرورش پائی تھی بچوں نے۔ جس طرح پلے تھے یہ بچے۔ تین چار سال کے ہوئے تو رسولؐ گود میں لے کر بیٹھ گئے۔

بچو! عزیزو!

میں نے تمہیں بڑے پیار سے پالا ہے۔ بڑی محبت سے پالا ہے، جی ہاں! قبلہ۔ آپ نے بڑا پیار کیا ہے۔ اگر میرے دین پر کبھی وقت آ گیا تو کیا کرو گے؟ اب بچوں کے تیور دیکھنے کے قابل تھے۔ رسولؐ بھی رو پڑے دیکھ کر۔ بچوں نے کھڑے ہو کر انگڑائی لی تو قبا کے بند ٹوٹ گئے۔ نانا پروانہ کر، گھر لٹا دیں گے، بچے کٹا دیں گے، تیرے دین پر حرف نہیں آنے دیں گے اور ہمارا یقین نہ آئے تو تم خود جنت سے آ کر دیکھ لینا۔

مومنین! آج محرم کی آٹھ تاریخ ہے اور رسولؐ جنت سے کربلا آئے ہوئے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ بچوں نے کیا کرنا ہے؟ آج انہوں نے دیکھنا ہے بچوں نے کیا کیا؟ وہ فرض ادا کر رہے ہیں۔ رسولؐ دیکھ رہے ہیں مگر حسینؑ چاہے کچھ بھی کریں آخر رسولؐ کے

نواسے ہیں۔ آخر علیؑ کے بیٹے ہیں، آخر فاطمہؑ کے بیٹے ہیں۔ حسینؑ کی بات تو حسینؑ کے ساتھ رہی اگر زینبؑ کا کوئی کمال ہے تو زینبؑ کی بات قبلہ زینبؑ کے ساتھ ہے۔ کہاں فاطمہ کی بیٹی، کہاں علیؑ کی بیٹی۔ اس کی شان بھی یہی تھی جو اس نے کیا۔ میں تو کہتا ہوں حسینؑ ایسا عظیم پارس ہے جو اس سے چھو گیا اسے حسینؑ بنا دیا۔ حسینؑ نے بہتر (۷۲) حسینؑ بنا دیے۔ خاندان کی نہ پوچھو: حسینؑ کی اور زینبؑ کی نہ پوچھو۔ غیروں کو دیکھو۔ ان کے جذبے کیا تھے؟ انہیں دیکھ دیکھ کر رسولؐ قربان ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھ کے رسولؐ فدا ہو رہے تھے۔

میرے بھائیو! میرے عزیزو!

حسینؑ کے ساتھ غیر بھی تھے نا؟ ایک صحابی شہید ہو گیا۔ ''جنادہ'' اس کا نام تھا۔ حسینؑ لاشے پہ گئے۔ اُٹھا کے گنج شہیداں میں رکھا۔ خیمے کی طرف جو دیکھا تو خیمے کا پردہ اُٹھا۔ ایک نو دس سال کا بچہ دوڑتا ہوا نکلا۔ حسینؑ نے آواز دی: آلِ محمدؐ اس بچے کو روکو۔ یہ میدان میں کہاں آ رہا ہے؟ اتنے میں وہ بچہ میدان کے قریب آ گیا۔ کمر سے تلوار بندھی ہوئی۔ بچہ چھوٹا تھا، تلوار تھی بڑی۔ وہ گھستی ہوئی آ رہی تھی۔ حسینؑ نے بڑھ کر بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کہاں جا رہے ہو؟ قبلہ! مرنے جا رہا ہوں۔ میں دشمنوں سے لڑوں گا۔ میرے بیٹے تم کس کے بیٹے ہو؟ مولاؑ اسی ''جنادہ'' کا، جو ابھی مرا ہے۔ تمہارا باپ مرا ہے تو یتیم ہوا ہے۔ اپنی ماں کے پاس جا کے بیٹھ، تو بچہ کہتا ہے: یہ کمر اماں نے باندھی ہے۔ یہ تلوار میری اماں نے خود باندھی ہے۔ میری اماں نے کہا ہے: بیٹا جا کر مر جاؤ۔ یہ سن کر قربان ہو گئے حسینؑ پر۔ یہ غیروں کے عزائم تھے۔

قبلہ! میں نے تمہیں ہر مجلس میں حسینؑ کے دوستوں کی ادائیں سنائی ہیں۔ یہ غیروں کی ادائیں تھیں۔ اگر مناسب سمجھو تو بات کہہ دوں اپنوں کی۔ آلِ محمدؐ اُجڑ گئے، سب کچھ لٹ گیا۔ خیر!

میرے نوجوانو!

آج آلِ محمدؐ بے سہارا ہیں، جو لوگ حسینؑ کے خاندان کے نہ تھے مگر حسینؑ کے پاس آ کر حسینیؑ بن گئے۔ خدا گواہ ہے کمال کر دیکھایا ہے۔ کہوا کبرؑ کی ماں، سیدانی تو نہیں تھی، مگر ایمان سے کمال کر دیا۔ حد کر دی۔ اکبرؑ کی لاش آئی ہوئی ہے اور حسینؑ کہتے ہیں: اس کی ماں کو بلاؤ۔ اپنے بچے کی لاش پر آئے تو پہلا جواب یہ ملا کہ قبلہ! نماز پڑھ رہی ہے۔

امام نے پوچھا: لیلیٰ کیا نماز پڑھ رہی ہے؟

کہا: مولا شکرانے کی نماز پڑھ رہی ہے۔

میری کمائی نیک راہ میں لٹ گئی۔ آ لیلیٰ اپنے بیٹے کی لاش کو آ کر دیکھ۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ خیمے سے لیلیٰ نہیں آئی۔ اب جو گئے نا دیکھنے، دیکھا کہ لیلیٰ خیمے میں گھوم رہی ہے۔ زینبؑ نے آواز دی: اکبر کی ماں، باہر آؤ۔ کہا: حسینؑ کی بہن مجھے خیمے کا دروازہ نظر نہیں آ رہا۔ مجھے در نظر نہیں آتا۔ ہاتھ پکڑ کے لائے۔ قاسمؑ کی ماں تو سیدانی نہیں تھی۔ یہ غیروں کا کمال تھا۔

دو چار فقرے سن لو۔ میرے جوان بیٹو!

میں تمہیں روتا نہیں دیکھ سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت خوش رہو، مگر معاف کرنا۔ میری کہانی ہی ایسی ہے۔ اس لیے میں تمہیں جان کے نہیں رُلاتا۔ ربابؑ بھی اسی گھر میں ہے۔ غیر خاندان کی ہے نا! یمن کے رئیس کی بیٹی ہے۔ سیدانی نہیں ہے۔ غیر خاندان کی ہے۔ ساری شہادتوں کے بعد حسینؑ خیمے میں آئے۔ بہن زینبؑ میری ساری قربانیاں قبول ہوگئیں، کسی کے بدلے دنبہ نہیں آیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی نذرانہ پیش کروں اللہ کے سامنے۔ کوئی نذرانہ پیش کرنے کے لیے کوئی شے ہے؟ زینبؑ نے کہا: میرے پاس تو دو ہیرے تھے ختم ہو گئے۔ لیلیٰ نے کہا: میرا تو اٹھارہ سال کا شبِ چراغ تھا، گل ہو گیا۔ فروہ نے کہا: میرا سہارا تو قاسم تھا۔ وہ بھی "تقسیم" ہو گیا۔ ہم سب خالی ہاتھ ہیں۔ ایک کونے میں سے ربابؑ کی آواز آئی، ذرا سی۔ نیلم کی کنی میرے پاس ہے۔ ایک نیلم کا نگینہ ہے میرے پاس۔ اگر تیرے کام آئے تو اسے لے لے۔ کہا: ربابؑ اسے

لے جاؤں۔ کہا: لے جاؤ۔ جہاں جہاں صاحبان ہو میری بات سنو!

حسینؑ چلے گئے۔ آگے آگے حسینؑ پیچھے پیچھے ربابؑ۔ جب خیمے کے دروازے پر پہنچے تو ربابؑ نے کہا: مولاؑ ذرا ٹھہرنا! ذرا یہ بچہ مجھے گود میں دینا۔ ربابؑ نے دو منٹ گود میں لیا اور اصغرؑ کی بہن سکینہؑ کو ساتھ لیا۔ دونوں کو لے کے خیمہ میں آ گئی۔ وہاں جہاں زینبؑ تھیں۔ حسینؑ و زینبؑ کو دیکھ کر کہا: سن حسینؑ! سن زینبؑ! تم فاطمہؑ کے بیٹا بیٹی ہو۔ میں غیر خاندان کی ہوں۔ تمہارے گھرانے آئی تو فاطمہؑ کی بہو کہلائی۔ تم نے مجھے بڑی عزت بخشی۔ تمہارے گھرانے سے مجھے یہ دو لعل ملے۔ ایک سکینہؑ اور دوسرا اصغر۔ میں تھوڑی دیر میں لاوارث ہو جاؤں گی، نہ میکے ہوں گے، نہ سسرال۔ میں تمہاری امانت سنبھال نہیں سکتی، لہٰذا یہ تمہارے سپرد۔ یہ کہہ کر سکینہؑ کو بٹھا دیا زینبؑ کی گود میں۔ اصغر کو دے دیا حسینؑ کی گود میں۔ زینبؑ تو جانے اور سکینہؑ جانے۔ حسینؑ تو جانے اور اصغرؑ جانے۔ دونوں کو سپرد کر دیا۔ حسینؑ اصغرؑ کو لے گئے۔ سکینہؑ کو زینبؑ لے گئی۔ سکینہؑ پر وہاں کیا گذری؟ اس پر کیا گذر گئی؟

اگر ہمت ہے تو سن لو۔ دو چار لفظ کیوں بھئی، نوجوانو! تم میں ہے ہمت اس قصے کو سننے کی۔ میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں، میں تو پڑھ لیتا ہوں، جوانوں کے خون میں گرمی ہوتی ہے۔ حیدر آباد (سندھ) میں، میں نے سکینہؑ کی شہادت پڑھی تھی کئی نوجوانوں نے چاقو مار لیے تھے۔ بچو!، بھائیو! سکینہ زینبؑ کے ساتھ اور تیرہ محرم ہے اور ابن زیاد کے دربار میں کھڑی ہے۔ ابن زیاد نے پوچھا: کہ یہ بچی کون ہے؟ بتایا گیا کہ حسینؑ کی بچی ہے۔ حسینؑ سے اسے بڑا پیار ہے۔ کہنے لگا: بچی آگے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ بچی نے بھائی کو دیکھا، پھوپھی کو دیکھا۔ نامحرم سے بات کی اجازت ہے؟ پھوپھی نے بھائی نے اجازت دی۔ بچی نے بات کی۔

سنو گے بھائی! بات اس طرح کہ لب ہل رہے تھے۔ آواز نہیں آ رہی تھی۔ بڑی دیر تک ہلتے رہے۔ آواز نہیں آئی۔ ابن زیاد کہتا ہے کہ مجھے آواز نہیں آ رہی۔ تو امام زین

العابدینؑ نے فرمایا: بچی تو بول رہی لیکن اس کا گلا اتنی مضبوطی سے بندھا ہوا ہے کہ آواز نہیں نکل رہی۔ اس کا گلا کھلوایا گیا۔ پانچ منٹ تک بچی گلے کو سہلاتی رہی۔ جب حواس ٹھیک ہوئے تو ابنِ زیاد نے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ کہا: فاطمہؑ نام ہے۔ مگر باپ مجھے پیار سے سکینہؑ کہتے تھے۔ بچی اگر حسینؑ زندہ ہوتے تو تجھے اس وقت کیا کھلاتے؟ بچی نے کہا: بابا مجھے تازہ خرمے کھلایا کرتے تھے۔

سنو گے نا! میرے بھائیو! اجازت ہے کہہ دوں لفظ۔ اجازت ہے، اجازت ہو تو بتاؤں۔ وہ بے حیا خبیث کہتا ہے: بچی میں نے تازہ خرمے منگوائے ہیں کھائے گی؟ اس پر بچی نے بھائی کو دیکھا، پھوپھی کو دیکھا۔ اشارہ کیا: کہہ دو ہاں! کہا: لے آؤ۔ بچی کے آگے طشت لایا گیا۔ رومال اُٹھایا گیا۔ کوفہ میں زلزلہ آ گیا۔ بچی ہائے بابا کہہ کر گر پڑی۔ ابھی بات ختم نہیں۔ سکینہ تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تمہارا خاندان معجز نما ہے میں تو تب مانوں کہ حسینؑ کا سر خود تیری گود میں آئے۔ یہ سننا تھا کہ جوش آ گیا، جلال آ گیا حیدرؑ کی پوتی کو۔ سر کو چھوڑ کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور پھٹا ہوا کرتا پھیلا دیا۔ بابا جان! میری محبت کا واسطہ پھوپھی زینبؑ کی قید کا واسطہ! بابا میری عزت کا سوال ہے مجھے دربار میں شرمندہ نہ کرنا۔ حسینؑ کا سر اُڑ کر سکینہؑ کی گود میں آ گیا۔ کوفہ کے بام در لرز گئے۔ زلزلہ آ گیا۔

آج کی مجلس کو میں اپنی طرف سے آپ کی طرف سے بانیانِ مجلس کی طرف سے، حضرت سکینہؑ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ شہزادیؑ ہماری حاضری کو قبول فرما۔ شہزادیؑ اگر ہم کربلا میں ہوتے تو تجھے قید نہ ہونے دیتے۔ دربدر نہ ہونے دیتے۔ اپنے باپؑ اور دادا سے ہماری شفارش کرنا کہ خدا ان گھروں کو آباد رکھے جن میں سادات کے اُجڑے گھر کا ماتم ہوتا ہے۔ خدا تم سب کو سلامت رکھے۔ بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ۔

موت وحیات

فضائل ..... موت وحیات

مصائب ..... رونے کا ثواب

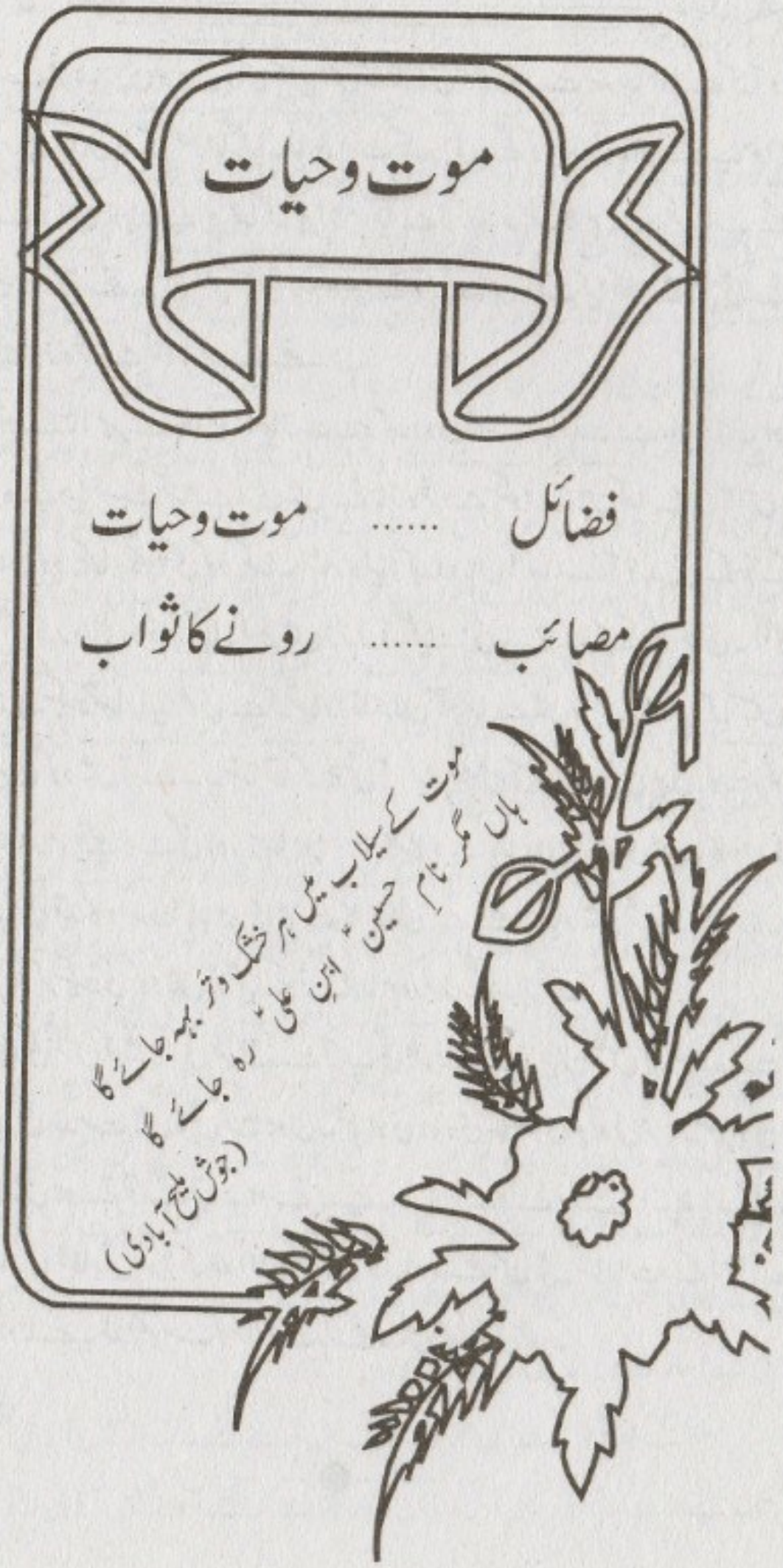

موت وحیات

حضرات محترم!

عزیزانِ گرامی نے مجھے بتایا ہے کہ مرحوم سید کی فاتحہ کی مجلس ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ میری اپنی حالت یہ ہے کہ میرے کان بہرے ہو چکے ہیں۔ ویسے میرے کان ٹھیک ہیں ان کے اندر زخم ہو گیا ہے اور زخم کی وجہ سے کچھ نہیں سن سکتا۔ علاج کروا رہا ہوں۔ شاید ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس وقت میں کچھ نہیں سنتا۔ تو جب میں کچھ نہیں سنتا کسی کی بات تو یہ انصاف کے خلاف ہے کہ میں تو سنوں نہ آپ کی بات اور آپ میری بات سنیں۔ کیوں سنیں؟ انصاف کی بات ہے نا! انسان کی جو زندگی ہے میری آپ کی زندگی اس کے لیے آپ کو گھر جا کر نہ کسی کتاب کو دیکھنے کی ضرورت ہے، نہ کسی مولوی صاحب سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ آپ خود اپنی زندگی پر غور کریں تو آپ کو خود پتہ چل جائے گا کہ واقعہ ہے کہ نہیں، جو میں کہہ رہا ہوں۔ انسان کی جو زندگی ہے وہ ہر روز بدلتی رہتی ہے۔ آپ کو بدلنے کا اندازہ نہیں ہے جو آپ کل تھے وہ آپ آج نہیں ہیں، جو آج ہیں وہ کل نہیں ہوں گے۔ انسان کی زندگی روز بدلتی رہتی ہے۔

ہر روز اس میں انقلاب ہوتا ہے۔ یہ انقلاب تو ہمیں محسوس نہیں ہوتا، جو ہمیں محسوس ہوتا ہے وہ انقلاب یہ ہے کہ ایک وقت وہ تھا ہمارا جب ہم دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کو یاد ہے جب آپ تشریف لائے تھے؟ یاد ہے؟ اگر وہ وقت آپ کو یاد ہوتا تو آپ بہت اچھے رہتے۔ آپ یقین فرمائیں اس دنیا میں آنے سے ہم خوش نہیں تھے۔ ورنہ ہم خوش ہوتے تو ہم آتے ہی ہنستے۔ ہم تو روئے تھے آ کر، روئے تھا نا؟ آپ کو وہ رونا یاد ہے

اپنا۔ اگر وہ آتے ہی رونا یاد ہوتا تو کبھی زندگی میں رونے کو برا بھلا نہ کہتے۔ جب آ کر روئے نہیں تھے کسی گھر والے کو آپ کے زندہ رہنے کا یقین نہیں تھا۔ اب روئے۔ مبارک بادیں ہونے لگیں، بچہ جئے گا۔ معلوم ہوا کہ رونا زندگی کی علامت ہے۔ روتا وہی ہے جو زندہ ہے۔ مردے نے کیا رونا ہے۔ زندہ روتا ہے ہمیشہ۔

سمجھے ناصاحبان! آپ میری بات پر غور کر رہے ہیں نا؟ ہم آ کے روئے۔ وہ ہمارا ایک زمانہ تھا اور لطف یہ تھا آپ کو یاد نہیں۔ بھوک لگی، رونے لگے، پیاس لگی، رونے لگے، کوئی آرام ہوا رونے لگے۔ غرض ہر کام رونے سے لیتے تھے جب سوائے رونے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس وقت ساری دنیا کا فیصلہ تھا کہ یہ معصوم ہے اگر رونا گناہ ہوتا تو اس وقت معصوم نہ ہوتا۔ اس وقت ہم معصوم تھے۔ جوں جوں رونا کم ہوتا چلا گیا وہ معصوم والی بات ختم ہوتی گئی۔ ٹھیک ہے یا نہیں۔

آہستہ آہستہ رونے کا زمانہ ختم ہوا، پھر بچپن آ گیا۔ بچپن کا وقت گزر گیا۔ خوب کھیلے کودے جو بچپن میں کھیلتا نہ ہو وہ بچپن کی توہین کرتا ہے۔ بچپن کے معنی ہیں کہ خوب شرارتیں کیا کرو۔ خباثت عیب ہے۔ شرارتیں عیب نہیں ہے۔ چوری کرنا، گالیاں بکنا یہ چیز عیب ہے۔

میرے پیارے بچو!

تمہارے اندر پانچ خوبیاں ایسی ہیں جو اس کے بعد باقی نہیں رہتیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ تم لڑتے ہو مگر دل میں کینہ نہیں حسد، نہیں ہے یا نہیں؟ تمہیں کوئی شے دے دے کل کے لیے اُٹھا کے نہیں رکھتے۔ تمہاری بے نیازی کی علامت ہے، ہے یا نہیں؟ تم کھلونے بناتے ہو توڑ دیتے ہو۔ خود بنایا خود توڑ دیا۔ دانائی کی بات کا ثبوت ہے، ہے یا نہیں؟ بے تکلف زمین پر لیٹ جاتے ہو تمہارے مزاج کی انکساری کا تعلق ہے۔ اسی لیے تو تم معصوم کہلاتے ہو۔ آہستہ آہستہ یہ باتیں ختم ہو جاتی ہیں زندگی کے ساتھ ساتھ۔ یہ بہت اچھی زندگی ہے۔ ماشاء اللہ! بڑی تفصیلی گفتگو تھی۔ میں نے اس بچپن کی زندگی کے موضوع پر پورے عشرے پڑھے ہیں کسی زمانے میں۔ اب تو طاقت نہیں رہی۔

بہرنوع! یہ بچپن کی زندگی ختم ہو جاتی ہے تو پھر کون سی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ شباب، سبحان اللہ! جوانی شروع ہوتی ہے سمجھے بچوں والی باتیں ختم ہوگئی۔ اب جوانوں سے بات ہو رہی ہے۔ اب وہ بچپن گیا۔ اب آ گیا شباب، شباب آ گیا۔ یہ زندگی جو شباب کی ہے اس کو لوگ ''حاصلِ زندگی'' سمجھتے ہیں۔ یہی زندگی کا حاصل ہے۔ یہی زندگی کی اصل عمر ہے۔ یہ انسانی زندگی کا دوسرا دور ہے، جسے جوانی کہتے ہیں۔ پہلا دور بچپن تھا گزر گیا۔ یہ دوسرا دور ہے۔ مزاج میں غصہ، طبیعت میں تیزی، توڑ پھوڑ کی عادت، لڑنے جھگڑنے کی فطرت، یہ جوانی کی فطرت ہے۔ یہ دوسرے دور کی خصوصیات ہیں۔ لڑنا جھگڑنا، فساد کرنا، یہ دوسرے دور کی باتیں ہیں جوانی کی۔ مختصر بات یہ دور بھی گزر گیا۔

اب تیسرا دور آ گیا۔ جسے کہتے ہیں بڑھاپا۔ حواس گم ہیں، عقل کام نہیں کرتی۔ کان سنتے نہیں۔ آنکھیں دیکھتی نہیں۔ آنکھیں عینک کی محتاج۔ کان آلے کے محتاج۔ چلنے میں لاٹھی کے محتاج۔ ہے کہ نہیں؟ ہر طرح سے محتاج ہو گیا۔ یہ تیسرا زمانہ بڑا محتاج زمانہ ہے۔ کسی کام کا نہیں۔ بڑھاپا جو ہے اس میں ہوس بڑھ جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے ہر شے اکٹھی کر لو۔ یہ بات ہے تیسرے زمانے کی، مگر عقل کام نہیں کرتی۔ کبھی کسی کو بھیج دیا آپ نے کہ الماری کھول کر دیکھیں۔ نوٹوں کی جگہ کاغذ رکھے، کاغذ کی جگہ نوٹ رکھے، تمباکو کی جگہ چینی رکھی، چینی کی جگہ تمباکو رکھا۔ بابا یہ کیا کیا؟ کہ بھئی تیسرا دور جو ہے۔ جمع تو کر لیا ترتیب خراب ہوگئی۔

جب تیسرا دور آئے گا تو تمہیں پتہ چلے گا کہ یہ کیا شے ہے؟ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہر دور میں آدمی کو آئندہ آنے والے دور کا پتہ نہیں ہوتا کہ کیا ہوگا۔ یہ تیسرا دور بھی ختم ہو گیا۔ چوتھا دور آیا۔ چوتھے دور کو کہتے ہیں موت۔ سمجھے موت زندگی کا چوتھا دور ہے اور کوئی شے نہیں ہے موت، بچپن تھا۔ ایک جوانی تھی، دو۔ بڑھاپا تھا، تین۔ اور موت، چار۔ یہ چوتھا دور ہے زندگی کا موت۔ بچپن بے وفا، ساتھ چھوڑ گیا۔ جوانی بے وفا، بڑھاپا بے وفا مگر چوتھا موت۔ یہاں سے جو ساتھ ہوا تو قبر میں ساتھ، حشر میں ساتھ، حساب کتاب میں ساتھ، شفاعت میں ساتھ، پل صراط میں ساتھ، یہ ہے چوتھے کی شان۔ وہ ساتھ نہیں

چھوڑتا۔ یہ موت جسے آپ کہتے ہیں یہ ہمارا چوتھا دور ہے۔ اسی واسطے کسی نے نہیں کہا: بچپن برحق ہے، جوانی برحق ہے، بڑھاپا برحق ہے، جس نے کہا: موت برحق ہے اور کسی چیز کو برحق کہا ہی نہیں۔ موت برحق ہے نا؟ پکی بات، موت آئے گی، آئے گی۔ کیوں بھئی! آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ سوچ لو، ڈاکٹر، حکیم، دولت، سلطنت، کوئی علاج، کوئی چیز بچا سکتی ہے، ضرور آئے گی؟ تم کہتے ہو نا! کہ آئے گی کیوں بھئی آئے گی! ضرور آئے گی۔ اچھا یہ بتاؤ کب آئے گی، کب آئے گی؟ پتہ ہے، آئے گی یقیناً، کب آئے گی؟ یہ پتہ نہیں۔ یہ موت انسان کو یہ سبق دیتی ہے جس کا آنا یقینی ہو اس کے آنے کا وقت مقرر نہیں ہوتا۔

سمجھ آئی نا صاحبان! اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اللہ جانے کب آ جائے؟ سمجھے نا حضور! موت نے آنا ہے، ہر وقت یاد رہنا چاہیے۔ کوئی موت مصیبت نہیں، کوئی موت مصیبت نہیں، کوئی موت تباہی نہیں، زندگی کا ایک دور ہے۔ جس طرح بچپن گیا، جوانی آئی، بڑھاپا آیا، بڑھاپا گیا، موت آئی، یہ بھی زندگی کا ایک دور ہے۔

سمجھے! مرتے وہ ہیں موت سے جن کا کوئی وارث نہ ہو، جن کا سہارا نہ ہو، جن کا کوئی ''سائیں'' نہ ہو، جن کا کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ جن کے وارث موجود ہیں، جن کا سہارا موجود ہے، بھلا مجال ہے فرشتے کی اسے مار دے۔ فرشتے کو سزا ہو جائے گی، اگر مار دیا گیا۔ طاقت ہی نہیں کسی مَلک کی کہ ہمیں مار دے۔ ہمارا سائیں موجود ہے۔ ہمارا وارث موجود ہے۔ ہم بے سہارا نہیں ہیں۔ خدا کی حکومت میں ہمارے بہتر (۷۲) ممبر ہیں اور چودہ وزارتیں ہیں۔ ہمیں کس نے مارنا ہے؟ کس کی طاقت ہے جو ہمیں مار دے، کسی کی طاقت نہیں۔ ملک الموت آتا ہے ہمیں غور سے دیکھتا ہے۔ دیکھ کے پہچان لیتا ہے اوہ ہو! یہ تو میرا ''پیر بھائی'' ہے۔ آؤ بسم اللہ! گلے ملا۔ مصافحہ کیا۔ ہاتھ میں ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔ بس اتنی سی بات ہوتی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ تمہیں کیوں مرجانا ہے؟ خدانخواستہ مریں ہمارے دشمن۔ ہمیں کیوں مرنا ہے؟ ہمیں نہیں مرنا، جو مر گئے ان کے لوگ خود کہتے ہیں فاتحہ کی ضرورت نہیں، کیوں؟ مر جو گیا۔ اس کے لیے کوئی قرآن نہ پڑھو، کیوں؟ مر جو گیا۔

ہمارا زندہ ہے۔ اس کے لیے سب کچھ موجود ہے تو یہ مرنے والے مر گئے۔ تم قبرستان میں جا کے دیکھ لو۔ دو میتیں لے جائیں قبرستان میں۔ ایک کے وارثوں نے اُتارا اور قبر بند کی اور گھر کو چلے گئے۔ مر جو گیا اور جب ہمارا قبر میں اُترتا ہے۔ مولوی صاحب بیٹھ گئے سرہانے سن اور سمجھ جن کے مر گئے وہ کہتے ہی نہیں۔ کون مردے سے کہتا ہے کہ سن اور سمجھ؟ زندہ ہے تو اس سے کہا جاتا ہے سن اور سمجھ۔ پھر لطف یہ کہ زندگی بھر تو پنجابی جٹ رہا۔ مرتے ہی علامہ بن گیا۔ اب عربی میں بات ہو رہی ہے۔ ''معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چلتے وقت اس کے سرہانے علم رسولؐ کا در کھل گیا۔ علم رسولؐ کے ''در'' نے اسے علامہ بنا دیا، کہاں چلا گیا۔ مومن کوثر پہ چلا گیا۔ آپ چاہیں تو اسے خط لکھ دیں۔ چاہیں تو پارسل بھیج دیں۔ چاہیں تو اسے کوئی تحفہ بھیج دیں۔ کوثر پہ رہتا ہے وہ۔ بمقام کوثر ڈاک خانہ خلد آباد ضلع جنت۔ یہ پتہ لکھیں اور بھیج دیں۔ آپ کا خط، آپ کا پارسل یقیناً پہنچے گا اُسے۔ لازماً پہنچے گا اُسے، سمجھے! مگر شرط یہ ہے کہ ''بیرنگ'' نہ ہو ورنہ واپس آ جائے گا۔ ٹکٹ لگا کے بھیجنا۔ کوثر پر پہنچ جائے گا۔ کیا کیا؟

کتاب اللہ وعترتی

ایک اللہ کی کتاب، ایک میری عترت، سمجھے! فاتحہ پڑھی کتاب اللہ کا ٹکٹ لگ گیا۔ عترت کا ٹکٹ لگ گیا۔ اے، اے، وہ پہنچ گیا۔ فرشتے لے کے جاتے ہیں، لو بھائی ذوالفقار علی (آیا سید ذوالفقار علی کرمانی، مرحوم) تیرے لیے تحفہ آیا ہے اور وہ اتنا خوش ہوتا ہے تحفہ دیکھ کر اتنی دعائیں دیتا ہے آپ لوگوں کو۔ اب چونکہ وہ صرف ''روح'' ہے اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ یہ جو آپ فاتحہ کی مجلس کے لیے آتے ہیں۔ یہ آپ اپنے لیے آتے ہیں۔ اس کی دعائیں لینے کے لیے۔ اس کی طرف سے نیک تمنائیں لینے آتے ہیں۔ وہ آپ کے لیے بڑی دعا کرتا ہے۔ میری بات سنو گے کہ اگر مجلس میں آنسو فرشتے لے کر نہیں جاتے۔ تمہارا فاتحہ تمہاری اور باتیں تو فرشتے لے کر جاتے ہیں آنسو فرشتے نہیں لے جاتے۔ تمہارے آنسو رومال میں لے کر خود جناب سیدہ جاتی ہیں۔ یہ میں لائی

ہوں تحفہ تیرے واسطے وہ لے جا کر وہ تحفہ پیش کرتی ہیں

اور محترم عزیزو!

امام زین العابدین بھی آتے ہیں اس کے پاس اور اسے کہتے ہیں کہ دیکھ بھائی کتنے آدمی بیٹھے ہیں؟ تیری فاتحہ پڑھ رہے ہیں، تیرے لیے دعا کر رہے ہیں، تیرے بچوں کو تسلی دے رہے ہیں، تیرے وارثوں کو پرسہ دے رہے ہیں۔ یہ کہہ کے امام زین العابدین رونے لگے، پوچھا قبلہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ کہا: تو بھائی ایک تھا چلا آیا، کتنے آدمی آئے ہیں فاتحہ پڑھنے، تیرے بچوں کو تسلی دینے، میرے گھر سے بہتر (۷۲) جنازہ اُٹھا۔ مجھے کسی نے پرسہ نہ دیا، مجھے کسی نے آ کے تسلی نہیں دی۔ مجھے کسی نے آ کے دلاسہ نہیں دیا۔ کسی نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ''ذوالفقار'' کے متعلق بھی کچھ پڑھوں مگر اب تھک گیا ہوں۔ میرے کان خراب ہو گئے ہیں۔ یہ مجھے بولنے نہیں دیتے۔ یہ میری زندگی میں ''کان'' آ گئی ہے۔ اب سب مل کر ذوالفقار مرحوم کے لیے فاتحہ پڑھو۔ پڑھ لی فاتحہ۔ فاتحہ کے بعد وہ بھی بتا دوں مگر وعدہ کرو کہ میری بات یاد رکھو گے۔ یاد رکھو گے تو بتاؤں! فاتحہ پڑھو۔ سارا قرآن پڑھو۔ یہ بڑے ثواب کی چیزیں ہیں مگر ایک چیز تمہیں بتا دوں ایک دفعہ درود پڑھو، پڑھو۔

اس درود کا ثواب کس کو پہنچاؤ گے؟ یہ کئی سو قرآنوں کے برابر ہے۔ یہ لازماً درود کا ثواب پہنچایا کرو۔ یہ بڑی آسان بات ہے۔ جب یاد آیا کرے، درود پڑھا اور اسے ثواب پہنچا دیا۔ یہ سینکڑوں قرآنوں کے برابر ہے۔ سمجھے تم کہتے ہو: اللھم اس میں اللہ کی توحید آ گئی۔ پھر تم کہتے ہو: صلی علیٰ اس میں خدا کا عدل آ گیا۔ محمدؐ یہ رسالت آ گئی۔ وآل محمدؐ اس میں امامت آ گئی اور یہ خواب کہاں پہنچا قیامت میں۔ پانچوں اصول دین درود پڑھنے میں آ جاتے ہیں۔ اس کا ثواب پڑھا، سات مرتبہ درود پڑھا کرو۔ ایک مرتبہ الحمد پڑھا کرو۔ تین مرتبہ قل پڑھا کرو اور مرحوم کو اپنی طرف سے تحفہ بھیجا کرو۔

خدا تمہیں سلامت رکھے اور تمہاری مجلس کو قبول کرے۔

موت وحیات

فضائل ..... موت وحیات

مصائب ..... امام موسیٰ کاظمؑ

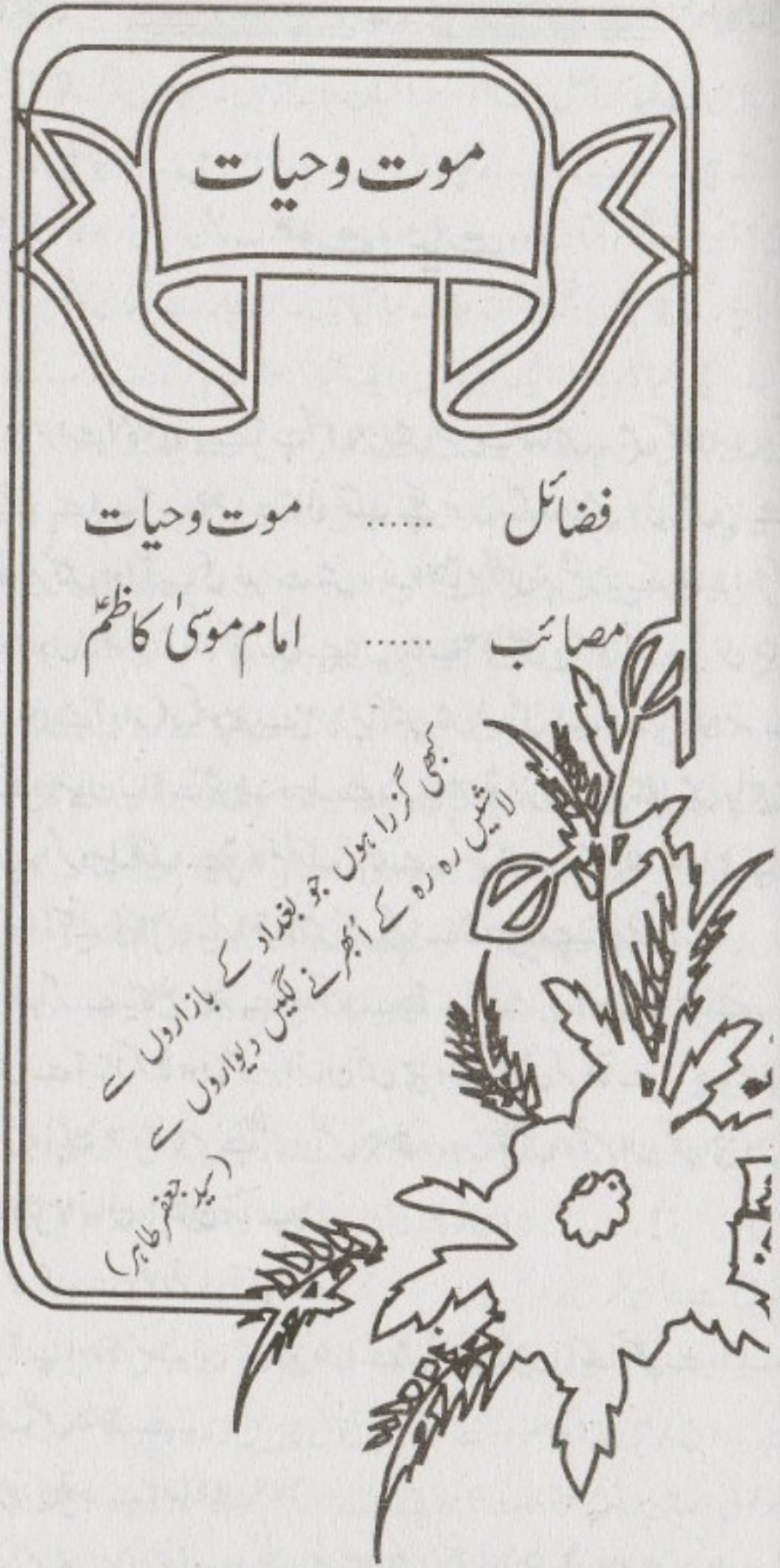

موت وحیات

حضرات! کافی دیر سے آپ مجلس عزا میں تشریف فرما ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اتنی دیر تک بیٹھنے سے اب آپ حضرات کافی تھک چکے ہوں گے اور میں کوئی مجلس پڑھنے اس وقت حاضر نہیں ہوا آپ کی خدمت میں، بلکہ اختتام مجلس پر شکریہ کے الفاظ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔ میری آواز پہنچ رہی ہے ناں جناب؟ (بھئی یہ آواز نہیں جا رہی بیٹا، اچھا اب جا رہی ہے آواز) دیکھو میرے معزز سامعین میں خود بھی بات کہہ رہا ہوں میرے اور آپ کے درمیان یہ ذاتِ شریف وسیلہ ہے۔ یہ چاہیں تو میری آواز پہنچائیں چاہیں تو نہ پہنچائیں۔ اگر وسیلہ ٹھیک ہے تو کام ٹھیک ہوتا ہے۔ وسیلہ غلط ہو تو کام غلط ہو جاتا ہے۔ اس وسیلے (لاؤڈ سپیکر) کا اس لیے اعتبار نہیں کہ یہ کرائے کا وسیلہ ہے۔ بہرنوع

خدا کرے یہ کام دیتا رہے، خدا کرے یہ آپ تک میری آواز پہنچاتا رہے۔ ہاں تو میں عرض سے آغاز کرتا ہوں کہ ہر انسان تین چیزوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایک جزو کا نام ہے روح، ایک جزو کا نام ہے نفس، نفس ناطقہ، روح ونفس وجسم ان تین چیزوں کے مجموعے کا نام انسان، انسان بنتا ہے۔

میری بات پر غور فرمایا آپ نے۔

آپ اور ہم سب ان تین چیزوں سے مل کر بنتے ہیں: ایک جسم سے، ایک روح سے، ایک نفس ناطقہ سے۔

پوری توجہ ہے نا صاحبان؟

جسم جو ہے یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں اس کے سامنے چار جزو ہیں: سنا ہے، میں

نے۔اس لیے کہا کہ اصلی بات ڈاکٹر صاحبان جانتے ہیں۔ہم ملاں لوگ تو سنی سنائی بات کرتے ہیں۔سنا ہے کہ جسم کے چار جزو ہیں۔چار عناصر ہیں۔کیا کیا ہیں وہ چار عناصر بھئی؟ جن سے جسم بنتا ہے وہ اربعہ عناصر کیا ہیں؟ آگ، مٹی، پانی، ہوا، لو جی میں بوڑھا ہو گیا چار کے نام ہی یاد نہیں، اللہ جانے کیا کیا ہیں۔ان چار سے انسان کا جسم بنا ہے: ایک آگ، ایک کیا؟، پانی، ایک کیا؟ مٹی، ایک کیا؟ ہوا، یہ چار۔جب آپ کے باوا آدمؑ بنے تھے وہ بھی ان چار عناصر سے بنے تھے۔تو فرشتوں نے دیکھ کے کہا تھا کہ یا اللہ! یہ پتلا جوان چار سے بنا ہے ضرور فساد کرے گا۔کیوں فساد کرے گا؟ کہ یہ ایسے چار اکٹھے ہوئے ہیں جن کا خاندان مختلف، قبیلہ مختلف، نسل الگ، قوم الگ۔ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔بے جوڑا، چار کب تک اکٹھے رہیں گے۔بہر نوع

ہم ان چار سے مل کر بنے ہیں۔اب آپ نے کہا ہے کہ آپ کے جزو چار ہیں، مجھے تو یاد نہیں۔ایک آگ، ایک پانی، ایک مٹی اور ایک ہوا مگر جس سے میں پوچھتا ہوں بھئی تم کون ہو کہ جی میں تو خاکی بندہ ہوں۔کوئی یہ نہیں کہتا میں تو جناب میں ہوائی بندہ ہوں۔حالانکہ آپ کہتے ہیں ہوا بھی ہے ہمارے اندر۔کوئی نہیں کہتا میں تو جناب آبی بندہ ہوں۔کسی نے اپنے آپ کو ناری بندہ نہیں کہا، آج تک۔لڑنے کو تو چار اور نام لینے کو ایک بہر نوع۔

ان سے ہمارا جسم بن گیا۔دوسرا جزو ہے ہمارا نفس۔اس کے بھی اجزاء ہیں۔وہ بڑی لمبی تشریح ہے۔اگر سناؤں تو بڑا وقت لے گا۔اس کے بھی اجزاء ہیں۔وہ بڑی لمبی تشریح ہے۔اسی طرح روح ہے۔

میرے محترم بھائیو! جسم کو بھی غذا کی ضرورت ہے۔نفس کو بھی غذا کی ضرورت ہے۔روح کو بھی غذا کی ضرورت ہے۔یہ تینوں چیزیں زندہ رہیں تو جسم زندہ رہتا ہے۔اگر کوئی انسان روح کو تو بہت غذا دے دے اور جسم کو تباہ کر دے۔اس نے ''ون تھرڈ'' انسانیت تباہ کر دی۔اگر اگر کوئی جسم کو پالتا ہے تو یہ بھی غلط۔ہر چیز کو پالنا چاہیے۔اب یہ

بتائیے کہ یہ جو موت آتی ہے جو انسان مر جاتا ہے وہ کیا شے ہے؟ کیوں بھئی کیا چیز ہے وہ؟ موت کیا ہے؟ موت کیا ہے؟

بولو نا بھئی!

موت کیا ہے؟ آپ اس لیے نہیں بتا رہے کہ جو بتا رہے ہیں انہوں نے بھی موت کو دیکھا نہیں۔ جنہوں نے دیکھ لیا وہ آ کے بتاتے نہیں۔ اس لیے پتہ ہی نہیں چلتا کہ موت کیا ہے؟ ہے ایسی ضروری چیز موت۔ ایسی ضروری چیز کہ جو اللہ کو نہیں مانتے وہ موت کو مانتے ہیں۔ اتنی ضروری ہے اور انسان کے ساتھ تو ایسی چمٹی ہوئی ہے موت۔ انسان ہی نہیں، ہر شے کے ساتھ۔

معاف کرنا بھائیو!

ابھی ہمارے جناب جسٹس صاحب تقریر کر رہے تھے۔ اللہ جانے وہ مجلس میں ہیں یا چلے گئے اگر وہ ہوتے تو میں ان سے پوچھتا کہ ہم نے کیا گناہ کر لیا ہم نے کیا جرم کر لیا اس دنیا میں آنا کوئی ایسا گناہ ہو گیا کہ ہم سے کہ چاہے یہاں ایک سانس لو چاہے لاکھ سال کی عمر پاؤ۔ سزائے موت ضروری ہے۔ حرام ہے کہ اور کوئی سزا ہوتی ہو جیل وغیرہ کی۔ سیدھی سزائے موتی ہوتی ہے۔ آئے ہو تو مرنا پڑے گا، سمجھے! جانا پڑے گا، چاہے مر جاؤ۔ مرنا پڑے گا، لازمی مرنا پڑے گا۔ یہ مرتی کیا چیز ہے؟ جسم جو ہے انسان کا یہ تو ہے ہی مرا ہوا۔ یہ کبھی زندہ ہوتا ہی نہیں۔ یہ جسم جسے کہتے ہیں اور روح جس چیز کا نام ہے وہ ہمیشہ جب پیدا ہو چکی، وہ زندہ ہے اور زندہ ہی رہے گی۔ روح نے مرنا نہیں، جسم نے جینا نہیں۔ پھر مرتی کیا شے ہے؟ اس کی تشریح ہمارے خالق نے کی۔ روح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جس میں زندگی ہے ہی نہیں۔ لہٰذا موت کا سوال ہی نہیں۔ مرتی کیا شے ہے؟ اس نے بتایا کہ سنو، مرتی کیا شے ہے؟ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وہ تیسرا جزو جو نفس ہے۔ وہ موت کو چکھتا ہے، مرتا وہ بھی نہیں۔ نفس موت کو چکھتا ہے مرتا وہ بھی نہیں۔ کیا دلیل ہو گی، نہیں مرتا؟ مرنے والے چکھا نہیں کرتے۔ موت کو چکھتا ہے وہ نفس موت کو چکھتا ہے۔

زندہ رہتا ہے، پھر زندہ کس طرح یہ چیزیں رہتی ہیں۔ ان کے زندہ رہنے کے بڑے طریقے ہیں۔

قبلہ! جسم الگ ہو گیا، نفس الگ ہو گیا، روح جو تھی وہ کہاں گئی۔ وہ ''یاد'' بنی۔ فقرہ میرا یاد رکھنا۔ مرنے والے کا جسم مٹی میں گیا۔ نفس عالم برزخ میں گیا۔ جسم مٹی میں چلا جاتا ہے اور روح ''یاد'' بن کے چاہنے والوں کے دل میں سما جاتی ہے۔ اسے یاد رکھتے ہیں اور یاد رہتا ہے۔

توجہ ہے نا صاحبان؟

یہ روحوں کی شان ہے اور میں اس گفتگو کو مختصر کروں۔ موت کی گفتگو تو بڑی لمبی چوڑی اور طویل ہے کہ حضرات محمدؐ و آل محمد جن کے ہم غلام ہیں اور جن کے اوپر ہمارا ایمان ہے جن کی تعلیم کو ہم اپنا ایمان سمجھتے ہیں انہوں نے موت و حیات کے اقتدار و فلسفے ہی بدل دیے سارے۔ بہر نوع

حضرات محمدؐ و آل محمدؐ نے اس کی شان ہی عجیب بیان کی ہے۔ وہ دو جملے ہیں حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ کی شان میں کہہ دوں تو حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ اپنا تعارف کیا کراتے ہیں؟ کہ محمدؐ فرماتے ہیں کہ میں محمدؐ اور آلِ محمدؐ ہم سب ایک نور سے ہیں۔ کیوں بھئی یہ سنا ہے کہ نہیں ٹھیک ہے نا؟ کہا نا انہوں نے؟ تو برابر ہو گئے نا؟ جب ایک نور سے ہیں تو ہو گئے نا سب برابر؟ انہوں نے کہا نا؟ ہیں تو ایک ہی نور سے، مگر اتنا اچھا فقرہ کہا یہ خطاب کیا ہے آلِ محمدؐ کے فرد اعلیٰ سے کہا: یا علیؑ! تو اور میں ایک نور سے ہیں تو علیؑ کا سینہ تن گیا ہو گا نا یہ سن کر کہ میں جب ایک نور سے ہوں تو برابر ہو گیا، سمجھے نا صاحبان! اگلا فقرہ فرمایا:

اِنَّا شَمْسٌ وَاَنْتَكَ الْقَمَرَ

''میں شمس ہوں اور تو قمر۔''

میری بدولت تو روشن ہے۔ فرق ہو گیا یا نہیں ہو گیا؟ اب شمس و قمر میں فرق یہ ہے۔ کیوں بھئی کبھی آپ نے یہ جھگڑا سنا ہے کہ کل شمس نکلا تھا یا نہیں؟ کبھی جھگڑا سنا ہے کیوں

بھئی ۔کل سورج ہوا تھا یا نہیں ۔ سنا ہے؟ نہیں نا؟ سورج میں سب متفق رہتے ہیں ۔ چاند کی باری آئی تو اختلاف ہو گیا ۔ ہوتا ہے یا نہیں، اختلاف ۔ بتاؤ آج چاند ہوا یا نہیں؟ اختلاف ہوتا ہے یا نہیں ۔ اللہ جانے چاند ہوا یا نہیں؟ پھر اختلاف ہوا کب تک ہے؟ پہلی کو جھگڑا ہوا پتہ نہیں ۔ تیسری تک سب جھگڑ کر سب خاموش ہو گئے کہ بھئی خاموش رہو کہ چاند کا فیصلہ چودھویں پر ہو گا ۔ جب چودھواں آئے گا تب پتہ چلے گا کہ تاریخ کیا ہے؟ چودھویں تک چاند میں جھگڑا ہوتا ہے یا نہیں ایسا ہی ۔ جہاں کہیں چاند ہے وہیں کہیں سورج بھی ہے مگر کبھی آج تک آپ نے سنا کہ بھئی آج سفر نہ کرنا میاں آج شمس در عقرب ہے ۔ سنا ہے کبھی؟ آج سورج عقرب میں ہے ۔ سنا ہے کبھی آپ نے؟ اور قمر در عقرب؟ سنتے ہو یا نہیں؟ عقرب کیا ہے؟ کچھ ستارے ہیں منحوس ۔ سنا ہے؟ جب تک سورج رہتا ہے یہ منحوس نامراد اللہ جانے کہاں چھپے رہتے ہیں؟ جہاں قمر کا زمانہ آیا عقرب بھی آ گیا ۔ کیا ہوا جی قمر در عقرب آ گیا ۔ یہ ہوتا ہے ۔ قمر در عقرب ہوتا ہے ۔ یہ کتنے دن رہتا ہے، قمر در عقرب؟ کتنے دن؟ صرف تین دن ۔ قمر در عقرب صرف تین دن رہتا ہے؟ جہاں تین دن گذرے، لے لو! قمر در عقرب ختم ہو گیا ۔ یہی قمر در عقرب ہے، چاند پر ۔

سمجھ میں آ رہا ہے نا صاحبان!

اب تمہیں پتے کی ایک اور بات بتا دوں ۔ اسے بڑے غور سے سننا اور اس کے بعد میں اپنا بیان ختم کر دوں گا ۔ سورج میں ایک صفت اور ہے وہ طلوع بھی ہوتا ہے اور غروب بھی ۔ یہ صفت ہے یا نہیں شمس کی ۔ غروب بھی ہوتا ہے، طلوع بھی ہوتا ہے ۔ کیوں بھئی! سورج نکلتا بھی ہے صبح کو اور شام کو غروب بھی ہوتا ہے ۔ ہے نا! یہ صفت شمس کی ۔ فرق یہ ہے کہ جب شمس طلوع کرتا ہے تو بند دروازے کھل جاتے ہیں ۔ یہی ہوتا ہے نا؟ بند دکانیں کھل جاتی ہیں ۔ کاروبار جاری ہو جاتا ہے ۔ لوگ اپنا کام شروع کر دیتے ہیں ۔ تمام دنیا میں روشنی ہو جاتی ہے ۔ یہ شمس کے چمکنے کا زمانہ ہے اور جب شمس غروب ہو جاتا ہے کھلے دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔ کاروبار بند ہو جاتے ہیں ۔ جب تک شمس کا وجود ہے اس

وقت تک بچوں کا دور ہوتا ہے۔ جہاں شمس غروب ہو گیا اب چور کی باری آ جاتی ہے۔ یہ میں شمس کی بات کر رہا ہوں، کوئی اور خیال اپنے دل میں نہ لانا۔ یہ ہے شمس کی حالت۔

تو میرے محترم سامعین!

شمس کے طلوع سے دنیا کو فائدہ، شمس کے طلوع سے دنیا کو فائدہ۔ شمس کے طلوع سے دنیا آباد۔ شمس کے طلوع ہونے سے دنیا میں آبادی۔ جہاں شمس غروب ہوا ایسا اندھیر آ جاتا ہے کہ میں کیا بتاؤں پورا اندھیرا ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے ستارے جو ہیں ہزاروں ستارے اسی شمس کی روشنی کی بدولت چمکتے ہیں مگر اس کی پہچان کون کرے کہ ان میں منحوس کتنے اور نیک کتنے۔ اصلی حیات کا مرکز شمس ہے۔ اصلی زندگی کا مرکز شمس ہے۔ اصلی توانائی کا مرکز شمس ہے۔ یہ طلوع رہے تو اس کی شان اور ہوتی ہے اور غروب ہو جائے تو دنیا میں اندھیر آ جاتا ہے۔ بڑا فرق ہوتا ہے قبلہ! کبھی کبھی اس کو گرہن بھی لگ جاتا ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا سورج کو گرہن لگتے ہوئے۔ ہوتا ہے، مگر گرہن لگ جاتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے چنانچہ جب بھی ہمارے کسی امامؑ کی شہادت ہوئی اس دن سورج کو ضرور گہن لگا تھا۔ ضرور رلگا تھا۔ جب بھی شہادت ہوئی ہے۔

آج حضور امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کی تاریخ ہے۔ امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کی تاریخ ہے صاحبان! آج آپ کے امامؑ کی شہادت کی تاریخ ہے۔ ہے نا؟ اور آج آپ شمسی کا چہلم بھی کر رہے ہیں۔ گویا امامؑ کی شہادت بھی اور شمس کا گرہن بھی۔ ضرور گرہن ہوتا ہے۔ شمس کو امامؑ کی شہادت کے دن۔

میرے محترم بزرگو! بھائیو! عزیزو!

میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں یہ کہہ کر کہ آپ حضرات میں سے سینکڑوں ایسے ہوں گے ان سامعین میں جنہوں نے چند دن پہلے شمسی صاحب کا جنازہ دیکھا ہوگا۔ دیکھا تھا نا بھائی؟ کیوں بچو دیکھا تھا؟ کتنے آدمی تھے؟ کئی گنا ہی تھے۔ آپ کے جنازے میں ہزاروں آدمی تھے۔ اتنا بڑا جنازہ تھا یا نہیں؟ جنازہ دیکھا تھا نا؟ اور اس جنازے کے

مقابلے میں آپ یہ جنازہ بھی دیکھ لیں ذرا کہ آپ کا امامؑ قید خانے میں زہر سے شہید ہوگیا۔ گھر میں نہیں۔ بال بچوں میں نہیں۔ قید خانے میں۔ جب امامؑ کی شہادت ہوگئی، چار مزدور جنازہ اُٹھا کر دجلہ کے پل پر رکھ آئے، صرف چار مزدور۔ آج کے دن ایسا جنازہ بھی اُٹھا تھا۔

سمجھے حضور والا!

مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہ آج ہم چار مزدوروں والے جنازے کا واسطہ دے کر اپنی اموات کے لیے دعا کرتے ہیں کہ خداوندا! اس غریب جنازے کے صدقے میں ہمارے مرنے والوں پر رحم فرما۔ ان کے درجات کو عالی کر۔ ان کو امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں پہنچا۔ ان کو بارہ امامؑ کی خدمت میں پہنچا۔ یہ امامؑ کی خدمت کرتے رہے ساری عمر اور یہ ان کی خدمت میں پہنچیں گے جن کی خدمت کرتے رہے اور مظفر علی شمسی میں چالیس سال سے تیرا واقف تھا۔ میں نے تجھے خدمتِ آلِ محمدؐ کرتے دیکھا۔ آلِ محمدؐ اپنے خادموں کو کبھی مایوس نہیں کرتے۔ ایک سیکنڈ کا خدمت کرنے والا حُرؑ اگر حضرت حُرؑ بن سکتا ہے تو چالیس سال کے خدمت کے خادم تو خدا جانے اسے کیا بنا دیں۔ یہ تو بہتر جانتے ہیں۔ خدا ان کے جوار میں جگہ دے۔ ان کی خدمت میں پہنچائے۔ آؤ سب مل کے دعا کریں۔ دعا کا وقت ہے۔ یہ شہادت امامؑ کا دن ہے۔ سب مل کے پکارو، یا اللہ! ہم تیرے دربار میں، تیرے اولیاء کے دربار میں، ہاتھ اُٹھائے بیٹھے ہیں۔ ہم بھکاری حاضر ہیں۔ ہمیں یہ بھیک عطا فرما کر ہمارے سب کے گناہوں کو معاف فرما دے۔ ہماری اموات پر رحم فرما۔ ہمارے جانے والوں کے درجات کو عالی کر۔ ہم جو باقی ہیں ہمیں توفیقاتِ خیر عطا فرما۔ ہم میں آپس میں اتحاد و اتفاق عطا فرما۔ ہم سب ایک دوسرے کے جانثار ہو کر رہیں۔ اللہ دینِ آلِ محمدؐ کی حمایت فرمائے اور کلمہ دین آلِ محمدؐ کی حفاظت فرمائے بحق محمد و آلِ محمدؐ۔

ان دعائیہ فقروں اور آپ کے شکریہ کے بعد میں آپ حضرات سے رخصت ہوتا

ہوں۔ اب ایک نعرہ لگاؤ پھر فاتحہ پڑھنا۔ نعرہ تکبیر، نعرہ رسالت، نعرہ حیدری، کلمہ ولایت، کلمہ ولایت، شاباش! نعرہ تکبیر، نعرہ رسالت، نعرہ حیدری، کلمہ ولایت، کلمہ ولایت، اسے پکا یاد رکھنا۔ ولایت کا کلمہ ہے جو دیسی کے عادی ہیں وہ ولایت سے مانوس نہیں ہوتے۔ دیسی وہ ہوتی ہے جو خود بنالیں خود بنانے والوں کو کیا پتہ؟ کہ ولایت میں کیا لطف ہے؟ آپ کلمہ ولایت کو بالکل یاد رکھیں، سمجھیں! خدا تمہیں خوش رکھے۔ یہ کلمہ اسی طرح قائم و دائم رہے۔

بحق محمد و آل محمدؐ

(۲۱ر جولائی ۱۹۷۶ بختیار لیبر ہال نسبت روڈ۔ لاہور
برموقع چہلم جناب مظفر علی صاحب شمسی مرحوم)

انسانیت

یہ شہادت ہے اُس انسان کی کہ اب حشر تک
آسمانوں سے صدا آئے گی انساں انساں
(احمد ندیم قاسمی)

انسانیت

۲۳ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ، ایس ٹی سی نیو کیمپس
''پنجاب یونیورسٹی'' لاہور کے طلبہ سے خطاب

یہ میری خوش قسمتی سمجھیں یا یہ کہ میری زندگی کا رخ اس طرح مڑ گیا۔ خدا جانے کیا قصہ ہوا کہ تقریباً ساری ہی زندگی اس طرح سٹیج پر کچھ نہ کچھ بولتے گزر گئی اور چھوٹے بڑے ہر قسم کے مجموں میں کچھ نہ کچھ بات ضرور کی۔ زیادہ تر میری گفتگو کا موضوع یہی تذکرہ محمدؐ و آلِ محمدؐ رہا اور اسی مناسبت سے شاید ان طلباء نے بھی مجھے حکم دیا کہ یہاں آ کر کچھ عرض کروں۔ بہت ہی ڈرا، یہاں میں اتنا ڈر رہا تھا آتا ہوا کہ مجھے دو تین طالبِ علم پکڑ کر لائے ہیں۔ ایک بے پڑھا لکھا آدمی مدرسے میں آتے ہوئے ڈرتا ہے۔ مجھے ڈر لگا کہ یہاں آ کے میں کیا کہوں؟ طلبہ کا مجمع ہے۔ اہل علم کا جھرمٹ ہے۔ بال کی کھال نکالنے والوں کا مجمع ہے۔ ہر بات کو سوچنے سمجھنے والوں کا اجتماع ہے۔ ستاروں کو قید کرنے والوں کا مجمع ہے۔ حکمت کی نہریں جاری کرنے والوں کا مجمع ہے۔ سائنس کے دریا بہانے والوں کا مجمع ہے۔ چاند پہ کمندیں پھینکنے والوں کا مجمع ہے۔ ذرّوں کا جگر پھاڑ کے قیامت ڈھانے والوں کا مجمع ہے۔ دنیا بھر کے سائنس اور عقل و فلسفے اور منطق کو دل میں سمونے والوں کا مجمع ہے۔ جواں دل، جواں سماعت اور کہنے والا از کارِ رفتہ بوڑھا آدمی، بھلا میرا آپ کا کیا ربط؟ کیا جوڑ؟ میں جس زمانے کی آپ سے بات کروں گا، وہ زمانہ آپ سے کبھی کا پرانا ہو گیا۔ نئی بات مجھے آتی نہیں، اگر پرانے یونیورسٹی کیمپس میں کوئی بلاتا تو چلا جاتا۔ نیو کیمپس میں پرانا آدمی..... تو بھائی میرے ذہن میں تو کوئی بات تم سے کہنے کے لیے نہیں۔ نہ کوئی موضوع ہے ایسا جو تمہارے سامنے بیان کیا جائے نہ کوئی گفتگو۔

بڑے ہی شوق سے بے خودی کے عالم میں وہ سن رہا تھا جو باتیں یہاں ہو رہی تھیں۔ بڑی اچھی شاعری، بہترین نثر کی گفتگو۔ میرا دل لگا ہوا تھا کہ سنتا رہوں۔ اچانک حکم ہوا کہ تو بھی کھڑا ہو کے کچھ بول۔ اب یہ طلبہ خود بہتر جانتے ہیں کہ اپنی محفل میں کتنا ہی چہکنے والا ہو طالب علم، جب سبق سنانے کا موقع آتا ہے تو بات اور ہو جاتی ہے۔ اب میں اتنے استادوں کے سامنے سنانے کھڑا ہوا ہوں کہیں بھول جاؤں کہیں غلطی ہو جائے کہیں اور کوئی بات ہو جائے تو میں کیا کہوں؟ کیا بات کروں؟ بہر کیف ایک مذہبی ماحول میں گفتگو کرنے والا آدمی اپنی بات مذہبی طور سے ہی شروع کرتا ہے۔ پتہ نہیں آپ کو میرا مذہبی طرزِ پسند بھی آئے گا یا نہیں؟ ہیں وہی مذہبی باتیں جو میں کیا کرتا ہوں۔

مسلمان بچو! مسلمان بچو! میں نے اس لیے کہا ہے کہ اس مجمع کے سامنے مجھے یہ خطابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اسلام کوئی بڑا اچھا مذہب ہے۔ اس لیے کہ یہاں سبھی مسلمان ہیں۔ تمہیں اسلام کی خوبی بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہونا! مسلمان؟ آپ تو سب ہیں ہی مسلمان، خدا کے فضل سے اور یہ اللہ کا احسان ہے اور اگر اللہ کسی مسلمان کے بجائے کسی عیسائی یا یہودی کے گھر میں پیدا کر دیتا ہو سکتا ہم وہی ہوتے۔ اس لیے مسلمان ہیں کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے۔

کیوں بھئی یہی ہے نا؟

ایسا تو ایک آدھ آدمی کہیں کوئی ہوتا ہے جو پیدا کہیں ہو، عیسائی وغیرہ کے گھر اور اپنی تحقیق سے مسلمان ہو۔ یہ بہت کم مثالیں ہوتی ہیں۔ عام طور پر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے لہٰذا مسلمان ہیں اور ایک اور مشکل بنتی ہے۔ تمہیں تو اندازہ نہیں اس بات کا کہ میں پیدا ہوا مسلمان کے گھر۔ لہٰذا ہوں میں مسلمان۔ اگر خدانخواستہ، خدانخواستہ، توبہ توبہ، ایسا ہو نہ کبھی اگر میں ہو جاؤں عیسائی اور پکا کٹر عیسائی بنوں۔ بڑا ہی مرتد عیسائی بنوں مگر پھر بھی ساری زندگی عیسائیوں کو مجھ پر شبہ رہے گا کہ ممکن ہے جاسوس ہو۔ ہو سکتا ہے مسلمانوں کا جاسوس ہو، ہو سکتا ہے مسلمانوں نے جاسوس کر کے بھیجا ہو۔ انہیں مجھ پر یقین ہی نہیں

آئے گا۔ جب بیٹھا کریں گے، آپس میں چار عیسائی کہیں گے ہو نہ ہو، ''وچوں وہی ہے''۔ یہی کہا کریں گے قسمیں کھاؤں گا، لاکھ اقرار کروں، کچھ بھی کہوں مگر وہ کہیں گے ''اونہوں ہے وہی'' تو کیوں شبہ رہے گا مجھ پر مسلمان ہونے کا ساری زندگی، باوجود میرے تردید کرنے کے چونکہ میں پیدا ہوگیا ہوں مسلمان کے گھر میں۔

سمجھے! اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص جس کے گھر میں پیدا ہوا یہ کچھ قدرتی سی بات ہے۔ وہ لاکھ کہے کہ میں وہ نہیں ہوں مگر جس گھر میں پیدا ہو جائے اس پر شبہ رہتا ہے ساری زندگی بھائی ہو نہ ہو وہی ہے۔ جس گھر میں جو پیدا ہوگیا تو یہ بات بھائی ہمیں خدا نے مسلمان کے گھر میں پیدا کر دیا۔ ہم اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں اور ہم مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ اللہ نے جب اس کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور یہ میں پڑھے لکھے حضرات کے سامنے پھر کہہ دوں کہ یہ جو الفاظ ہم استعمال کریں گے گفتگو میں خدا سے متعلق، رسولؐ کے متعلق تو یہ الفاظ ہیں جو ہماری عقل کی رسائی میں بڑے اچھے الفاظ ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ صحیح معنوں میں ان کی شان کے مطابق بھی ہیں جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ کے لیے الفاظ ہمارے پاس نہیں۔ جن سے ہم اللہ کا ذکر کر سکیں۔

بس اللہ کے لیے ایک ہی لفظ ہمارے پاس ہے کیا؟ کہ بس اللہ، اللہ کیا ہے؟ اللہ، بھئی اللہ کیا ہے؟؟ اللہ، آگے؟ کہ اللہ ہی اللہ خیر صلا، بس اللہ۔ اللہ کیا ہے؟ اللہ، اور کوئی لفظ ابھی تک ہے ہی نہیں ہمارے پاس اللہ کے لیے سوائے اللہ کے اور بڑے سے بڑے علمائے اعلام بڑے بڑے علمائے کرام بھی جب اللہ کی بات کرتے ہیں نا تو وہ یہی کہتے ہیں کہ مسلمانو! اللہ سے ڈرو۔

سنا ہے یا نہیں تم نے؟ اللہ سے ڈرو سنا ہے نا؟ مسلمانو! ڈرو اللہ سے۔ عالم کا واعظ، قبلہ وکعبہ کا فرمان، مولانا کا ارشاد، طلبہ بیٹھے ہیں سامنے بچو اللہ سے ڈرو اور ڈرو اللہ سے۔ ایک دفعہ سنا، دو دفعہ، چار دفعہ، دس دفعہ آخر بار بار مولوی صاحب نے اللہ سے ڈرایا تو خدا شاہد ہے کالج کے لڑکوں کا تو مجھے پتہ ہے یہ تو اتنے ڈر گئے ہیں اللہ سے کہ جہاں اللہ کا ذکر

ہو، ڈر کے مارے نہیں جاتے۔ مولوی صاحب جو کہتے ہیں، اللہ سے ڈرو۔ راستہ چلے جا رہے ہیں سامنے مسجد آ جائے چکرا کے گزرتے ہیں کیوں بھئی چکرا کے کیوں گزرے کہ بھئی مسجد سامنے ہے، پھر؟ کہ اللہ سے ڈرو۔ مولوی صاحب نے کہا تھا اللہ سے ڈرتے ہیں تو اللہ سے ڈرا ڈرا کے ایمان سے ہم لوگوں کا برا حال ہوا ہے اور کوئی ہم میں سے جرأت کر کے مولوی صاحب سے نہیں کہتا مولوی صاحب، اللہ سے ڈرو۔ کیوں اللہ کے بندوں کو اللہ سے ڈرا رہے ہو، خواہ مخواہ کے لیے۔ بھلا اللہ سے ڈرنا بھی کوئی انسانیت ہے؟ اللہ کے بندوں کو اللہ سے ڈرانا بھی کوئی بات ہے۔

بس ڈرا رہے ہیں کیوں بھئیو! ڈر تو اُردو زبان کا لفظ ہے۔ ڈر کے معنی ہیں بچنا۔ کس سے بچنا؟ اس سے بچنا، جس سے اندیشہ ہو ستانے کا، جس سے اندیشہ ہو دکھ پہنچانے کا، جس سے اندیشہ ہو اذیت پہنچانے کا۔ اب بتاؤ اللہ کوئی سانپ ہے؟ (نعوذ باللہ) بچھو ہے؟ کیا ہے؟ جو اس سے ڈریں۔ ہمیں ستاتا ہے؟ ہمیں نقصان پہنچاتا ہے؟ ہم پر ظلم کرتا ہے؟ ہمیں اذیت دیتا ہے؟ پھر ڈروں کیوں اللہ سے؟

بولو بھئی! کہتے ہیں ڈرو، کیوں ڈرو؟ کیا وجہ ہے ڈرنے کی؟ کیا اللہ ہم پر مہربان نہیں؟ اللہ ہمیں پیار نہیں کرتا؟ اللہ ہم سے محبت نہیں کرتا؟ اللہ کو ہم سے پیار نہیں؟ ہم سے زیادہ ہم سے پیار نہیں، نہیں اللہ کو؟ اللہ جیسا پیار، اللہ جیسا محبوب، اللہ جیسا اچھا، اللہ جیسا حسین، اللہ جیسا معشوق اس سے ڈرا ڈرا کے مار دیا لوگوں کو کہ اس سے ڈرو، اللہ سے۔

یاد رکھو میرے محترم بھائیو! بچو! عزیزو!

اگر کوئی مولوی صاحب کہیں تو بے شک میرا نام لے دینا۔ گناہ میرے ذمے۔ اللہ سے مت ڈرو، سمجھے! اللہ ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ اللہ ڈراؤنی شے نہیں ہے۔ اللہ ظالم نہیں ہے۔ اللہ ستاتا نہیں ہے۔

دیکھو بچو! اللہ محبوب ہے، اللہ معشوق ہے، اللہ پیارا ہے، اللہ حسین ہے، سمجھے! جب وہ حسین ہے، وہ محبوب ہے، وہ پیارا ہے اس لیے اس میں ادائیں بھی بڑی ہیں اور اس کی

اداؤں میں ایک بڑی ادا یہ بھی ہے کہ وہ ذرا روٹھ جاتا ہے۔ تو ڈرو اس بات سے کہ اللہ کہیں تم سے روٹھ نہ جائے۔ کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ یہ تو مسلمہ بات ہے کہ جتنا بڑا حسین ہوگا، اتنا ہی بڑا نازک مزاج ہوگا۔ جتنا بڑا حسین ہے اللہ، اتنا ہی بڑا نازک مزاج ہے۔ ذرا سی بات پہ روٹھ جاتا ہے۔ ہر وقت ڈرتے رہو کہ روٹھ نہ جائے۔ اگر روٹھ گیا تو پھر ''یار مناون اوکھا'' پھر اسے منانا بڑا مشکل ہوگا۔ تو اللہ سے اس بات سے ڈرو کہ کہیں وہ تم سے روٹھ نہ جائے۔

اور دیکھو میری بات سنو عزیزو!

اللہ کو یاد رکھو، سمجھے! اللہ کو یاد رکھو! مولوی صاحبان ہمارے سامنے ترجمہ کرتے ہیں۔ اذکروا اللہ ''اللہ کو یاد کرو'' تو میں کہتا ہوں مولوی صاحبان جانے بھی دو یہ ترجمہ عربی کا نہیں ہے۔ اللہ کو یاد کرو۔ یاد کرو میں کوئی سواد ہی نہیں۔ یاد کرو میں کوئی لطافت ہی نہیں۔

سن رہے ہو نا بھئی میری بات؟

پکی بات؟ جب سننے سے تمہارا دل بھر جائے کہہ دینا میں اسی وقت بیٹھ جاؤں گا۔ جب تک سنتے رہو گے میں تمہیں سناتا رہوں گا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ کسی نے سنائی تھی، جب تک سنتے رہو گے، میں تمہیں سناتا رہوں گا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کسی نے سنائی تھی۔ جب تک سنتے رہو گے، میں سناتا رہوں گا۔ تو دیکھو بھائی یہ ترجمہ غلط ہے اللہ کو یاد کرو۔ یاد کرو۔ لو اگر زندگی میں ایک دفعہ یاد کر لو تو یاد کرو پورا ہو گیا۔ عید کے دن کہہ دیا یا اللہ! یاد کرو پورا ہو گیا۔ باقی سال یاد نہ کرو۔ بے شک یہ کون سی بات ہے؟ چاہے کسی وقت بھی یاد نہ کرو۔ کوئی بات ہی نہیں۔ اللہ کو ایک دفعہ بھی کہہ دیا ''یا اللہ'' یاد کرو پورا ہو گیا۔ باقی سال یاد نہ کرو۔ بے شک یہ کون سی بات ہے؟ چاہے کسی وقت بھی یاد نہ کرو کوئی بات نہیں۔ اللہ کو ایک دفعہ بھی کہہ دیا یا اللہ یاد کرو پورا ہو گیا۔ اللہ ہم سے یاد کرو کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اللہ کہتا ہے: فاذکرونی کیا معنی؟ ''اللہ کو یاد رکھو۔'' اب تم خود بتاؤ پڑھے لکھے بچو! یاد کرو اور یاد رکھو میں کوئی فرق ہے کہ نہیں؟ بولو بھئی اللہ کو یاد کرو اور بات ہے اللہ کو یاد رکھو!

اب سوچو کوئی فرق ہے یا نہیں۔ اس میں ہے نا فرق؟ اور پھر آیت کا اگر تیور دیکھو۔ آیت کا اگر لہجہ دیکھو۔ پھر ترجمہ کرو تو یہ ترجمہ بنے گا، اس کا۔ اللہ کو یاد رکھو، ورنہ یاد رکھ پھر یہ ترجمہ بنتا ہے اور ترجمہ ہی نہیں بنتا کوئی، تو اللہ ہمیں یاد ہے۔ ہم اسے یاد رکھتے ہیں اور اللہ کا ہی ذکر کرتے ہیں محفل میں، مجلس میں مسلمانوں کی۔

تو میرے بھائیو! اللہ نے ارادہ کیا کہ کائنات کو پیدا کرے تو اس نے کائنات کو پیدا کرنے میں ہم مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق اس کے دلائل کے لیے اس وقت، وقت نہیں، چونکہ سب مسلمان مانتے ہیں اول مخلوق جو پیدا کی وہ تھا نورِ حضور سرور کائناتؐ۔ کیوں مسلمانو! ہمارا یہ ایمان ہے یا نہیں؟ ہم مانتے ہیں یا نہیں؟ اوّل مخلوق، پہلی شے جو اللہ نے بنائی۔ سب سے پہلے جو بنایا وہ تھا حضور رسالت مآبؐ کا نور۔

سمجھے نا حضور؟ اور جب نورِ حضور کائناتؐ بنا دیا نا! تو اس اکیلے نے گوارا نہ کیا کہ میں بھی اکیلا اور بنا ہوا بھی رہے اکیلا، لہٰذا اس کے چاروں طرف ''چار چاند'' لگا دیئے تا کہ یہ چار، پانچ ہو جائیں۔ میں اکیلا رہوں اب جب یہ چار ''پانچ'' ہو گئے تو اور ترقی کی۔ انہیں بارہ چودہ بنا دیا۔ جب بارہ چودہ بن گئے تو اللہ نے ایک یونیورسٹی کھول دی کہ بیکار بیٹھ کے کیا کرو گے؟ یونیورسٹی کھل جائے تم تعلیم دیا کرو، تم پڑھا کرو اور ایک لاکھ چوبیس ہزار طالب علم اس یونیورسٹی میں داخل کر دیئے اور محمدؐ ہو گئے اس کے وائس چانسلر او ربارہ چودہ وہ ہو گئے پروفیسر اور ایک لاکھ چوبیس ہزار پڑھنے بیٹھ گئے جو طالب علم پاس ہوتا رہا، ڈگری ملتی رہی عہدہ لے کر آتا رہا۔ کسی کو زمین پر پانی بہانا سکھا دیا اور آ گیا اور کسی کو آگ کو گلزار بنانا سکھا دیا اور آ گیا۔ کسی کو وائرلیس پہ بات کرنے کا طریقہ سکھا کر کلیم بننا سکھا دیا اور آ گیا۔ کسی کو موت سے ٹکر لے کے ہمیشہ جینا سکھا دیا اور آ گیا۔ غرض اپنا اپنا پڑھ کے سارے شاگرد آتے رہے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

جب ایک لاکھ چوبیس ہزار ہو کے آ گئے اور سب اپنا اپنا کام کر گئے تو اللہ نے

اساتذہ کرام کی طرف دیکھا جو چودہ پڑھانے والے تھے اور جوان کے رأس ورئیس تھے۔ حضور محمد مصطفیٰؐ ان کی طرف دیکھا اور دیکھ کے یہ کہا ہوگا ''ہوگا'' لفظ یاد رکھنا۔ یہ ہوگا لفظ میں آپ کے ڈر کے مارے کہہ رہا ہوں۔ کہیں پوچھنے لگو کہ کس کتاب میں لکھا ہے؟ کتاب میں نہیں، یہ میرے دل کی کتاب میں لکھا ہے۔ یہ کہا ہوگا کہ محمدؐ سنتے بھی ہو، شاگرد تو اپنا اپنا کام کر کے چلے گئے۔ اب اگر مناسب سمجھیں تو آپ خود چلے جائیں ذرا کیوں کیا خیال ہے؟ جاؤ گے؟ جانا ہے؟ کیوں محمدؐ جاؤ گے؟ جانا ہے؟ میں؟ کیا بات ہے؟ جاؤ گے؟ دیکھو محمدؐ! سنو، اگر باقی نبیوں کی طرح تم بھی نبی ہوتے تو حکماً بھیجتا، جاؤ! محبوب جو ہوئے اس لیے پوچھتا ہوں۔ جانا ہے؟ جاؤ گے؟ کیا خیال ہے؟ جانا ہے؟ اچھا جا رہے ہو، بسم اللہ تشریف لے آؤ۔ بہت اچھا تمہاری مرضی ہم تو تمہاری مرضی دیکھتے ہیں۔ چلے جاؤ، ہیں؟ مگر یہ کیا؟ تم تو اُداس ہو گئے۔ محمدؐ اداس نہ ہو۔ اگر وہاں کبھی دل گھبرا جایا کرے تو مل جایا کرو، جاؤ؟ پوچھا جا کے اب کریں کیا؟ کہ اب جا کے اب تک جو سوالاکھ پڑھے تھے، وہ پرانی یونیورسٹی میں پڑھے تھے، تم مکے میں جا کے۔ ایک جنگل میں بالکل ریگستان میں نیو کیمپس قائم کر دینا۔ اب کے ایک بالکل نئی یونیورسٹی قائم ہو جائے، نیا کیمپس بن جائے۔ دنیا بھی کیا یاد کرے گی کہ پڑھنے کا طرزِ بدل گیا، انداز بدل گیا۔ بالکل نیو کیمپس قائم کر دو وہاں جا کے سمجھے، بہت اچھا۔ تم اس یونیورسٹی کے ہو گے انچارج اور آگے طلبہ تمہارے آئیں گے، انہیں پڑھایا کرنا۔ بالکل نیو کیمپس قائم کر دینا وہاں جا کے، بہت اچھا۔

اب چلے وہاں سے، جا رہے ہو؟ کہ ہاں! او یہ بغل میں کیا ہے؟ کہ یہ تیری کتاب ہے۔ اسے پڑھ پڑھ کے دنیا کو پڑھاؤں گا یونیورسٹی میں۔ اچھا تم ایک کام کرو، کتاب یہیں چھوڑ جاؤ۔ تم خود جاؤ کہ اگر کتاب یہاں رہ گئی تو وہاں پڑھاؤں گا، کیا؟ کہ واہ محمدؐ کو اتنی بات بھی تم مجھ سے پوچھتے ہو، دیکھو جب بڑے آدمیوں کے بچے گھر سے کالج آتے ہیں تو ان کی بغل میں بستے نہیں ہوتے۔ ان کے نوکر پیچھے بستہ لے کر آتے ہیں۔ آپؐ تشریف لے چلیں۔ آپؐ کی یہ کتاب آپؐ کا نوکر جبرئیلؑ لے کر حاضر ہوگا۔ آپ تشریف

لے چلیں۔ کتاب وہ لے کر آئے گا۔ جائیں آپؐ۔

اور دیکھو ایک بات سنو۔ جہاں میں تمہیں بھیج رہا ہوں نا! وائس چانسلر بنا کے، وہاں جا کے بالکل نہ پڑھنا۔ وہاں پڑھو گے تو میری بنی بنائی بات بگڑ جائے گی، کیوں بچو! تم مجھے ایک بات بتاؤ، تم جو مجھے گھر سے لائے ہو کار میں بٹھا کے بڑی عزت سے اور مجھ سے کہا: زیدی صاحب! ایک تقریر کر دو۔ اب زیدی صاحب کھڑے ہوئے یہاں تقریر کرنے۔ جیب میں سے نکال کے کتاب اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ آپ نے کہا: بسم اللہ۔ (کتاب کھول کر دیکھتے ہوئے، ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ) اے قبلہ! پڑھو نا کچھ۔ (تیسری مرتبہ پھر اسی طرح نظریں کتاب پر اور ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ) او ٹھہرو ذرا! پہلے میں تو پڑھ لوں۔ سارے لڑکے اُٹھ کے چلے گئے۔ بھئی کیوں چلے گئے؟ کہ اس پاگل مولوی کو کون مانے؟ جو یہاں آ کے پڑھے۔ اب وقت بڑی جلدی جلدی گزر رہا ہے اور افطار کا وقت قریب آتا جا رہا ہے۔ اس لیے میں بات مختصر کرتا ہوں۔

بہرنوع یہاں آ کے مکتب کھول لیا۔ دیکھو یوں کرو، پہلے زیادہ طالب علم بھرتی نہ کرنا، تھوڑی سی کلاس رکھنا، اپنے گھر والوں کو پہلے جمع کرو۔ پہلے ان سے تعلیم شروع کرو جب وہ سمجھ جائیں گے پھر اور عوام سے بات کرنا۔

پہلے بالکل اپنے اقرب اکٹھے کرو۔ قرابت دار، پھر اوروں سے بات کرنا۔ بہت اچھا! یوں نیو کیمپس میں پہلی کلاس چالیس طالبِ علموں کی کھلی جو رسولؐ کے اپنے گھر والے تھے۔ وہ آ کے بیٹھ گئے جناب پڑھنے کے لیے۔ اس میں سن و سال کا خیال نہیں۔ طالبِ علمی میں سن و سال نہیں دیکھا جاتا۔ پڑھنے کے شوق میں بچہ بھی پڑھ کتا ہے، بوڑھا بھی پڑھ سکتا ہے یہ اور بات ہے کہ بچے کا ذہن تیز ہوتا ہے۔ اب مجھے اتنا اچھا یاد نہیں ہو سکتا جتنا تمہیں یاد ہو سکتا ہے، تو جناب اس میں رسولؐ کا سارا خاندان اکٹھا ہو کے بیٹھ گیا۔ چالیس آدمی بیٹھ گئے۔ بھئی! ہمیں کیوں بلایا ہے؟ کہ میں نے ایک نئی تعلیم گاہ قائم کی ہے۔ اس میں درس دینا چاہتا ہوں۔ اگر میرا علم تم نے پڑھ لیا اور سمجھ گئے تو ساری دنیا کی

حکومت تمہارے قدموں میں ہوگی اور عاقبت کی نجات تمہارے پاس ہوگی۔ میں ایسی چیز تمہیں بتانے کے لیے آیا ہوں کہ اچھا بتا دو۔

تو میرے محترم سامعین!

اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ محمد مصطفیٰؐ جیسا معلم اعظم اور اس کی پہلی کلاس۔ پہلی کلاس میں اتنے بڑے معلم کی تقریر۔ پہلی گفتگو، تمام طلبہ گوشِ ہوش کھولے بیٹھے تھے۔ سننے کے لیے کہ کیا کہتا ہے؟ مگر معلم اتنا عالمگیر تھا کہ وہ صرف اس جماعت کا معلم نہیں تھا بلکہ عالمین کا معلم تھا۔ عالم کی ہر شے کا معلم تھا۔ ادھر اس نے تقریر کرنے کے لیے گلا صاف کیا۔ ''ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں'' ادھر اس نے کہا ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ادھر کائنات کی ہر شے سراپا گوش بن گئی سننے کے لیے۔

سمجھے نا حضور؟

درختوں کا ہر پتہ کان ہو گیا سننے کے لیے۔ سوا لاکھ انبیاء آسمانِ اوّل پر اُتر آئے سننے کے لیے۔ اللہ نے کہا: ماشاء اللہ! قدرت نے کہا: سبحان اللہ!، فطرت نے کہا: بسم اللہ اور محمدؐ نے تقریر شروع کی زلفِ الہام کو شانہ ہونے لگا۔ شہپر جبرئیلؑ کو جنبش ہونے لگی اور تقریر میں فرمایا کہ میں تمہارے لیے خیر دنیا اور آخرت لے کے آیا ہوں۔ بولو ایسا کون شاگرد ہے؟ جو علم کو اچھی طرح سمجھ کر اس معاملے میں میرا ساتھ دے اور میرے بعد میری درسگاہ کا پرنسپل بنے۔ بولو کون ہے؟ بس ادھر اعلان ہوا، خیر دنیا اور آخرت کا پیغام لایا ہوں۔ چالیس کے چالیس سامعین خاموش بیٹھے رہے، مگر دنیا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ عالم کی چلتی ہوئی نبضیں رک گئیں۔ جب رسولؐ کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے، کونے سے ایک دس سال کا بچہ اُٹھا۔

سمجھے نا حضور؟

پوری بچپن کی ادا، پیروں پہ مٹی پڑی ہوئی، کرتے کے بٹن کھلے ہوئے، جیبوں میں خرمے بھرے ہوئے پوری بچپن کی ادا سے کونے سے ایک بچہ اُٹھا۔ قبلہ ذرا اب کے فرماؤ

کیا کہا ہے؟ یہ اب کے فرماؤ اس لیے کہا تھا کہ کام تو بچے ہی کریں گے آپ کا، قربانی دیں گے، مر مٹیں گے، مگر پہلے ہمیں سمجھا دیں کہ چاہتے کیا ہیں؟ بے سمجھے بوجھے ساتھ ہو لینا عقلمندوں کا کام نہیں۔ پہلے ہم سمجھ لیں کہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہماری سمجھ میں بھی آ جائے آپؐ چاہتے کیا ہیں؟ ہاں حضور ذرا اب کے فرمائیں۔ آپؐ چاہتے کیا ہیں؟ کہ بیٹا، بچے، برخوردار! میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کون ہے جو معاملے میں میرا ساتھ دے گا؟ بس یہ کہنا تھا کہ کون ساتھ دے گا؟ بچے نے ایڑیاں اُٹھا کے کہا:

اَنَا نَاصِرُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

''اے اللہ کے رسولؐ! میں تیرا ناصر ہوں۔''

میں تیری مدد کروں گا۔ ''بیٹا! یہ بچوں کا کھیل نہیں۔''، ''قبلہ! میں جان پہ کھیل کے کہہ رہا ہوں۔''، ''بیٹا یہ بڑا مشکل کام ہے'' کہ ''عالیجاہ میں مشکل کشا جو ہوا۔'' مشکل کام سمجھ کے کہہ رہا ہوں میں تیرا ساتھ دوں گا۔ ''یا محمدؐ!'' نہیں۔ اگر یا محمدؐ کہہ کے وعدہ کرتا تو زندگی بھر وعدہ تھا۔ یا رسول اللہؐ!، میں تیری نصرت کروں گا۔ گویا جب تک تیری رسالت ہے، میری نصرت ہے۔ جہاں جہاں تیری رسالت ہے، وہاں وہاں میری نصرت ہوگی، میں تیرے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کروں گا۔ گویا آج سے دنیا متعارف ہوئی علیؑ سے۔ وہ چالیس آدمیوں کا مجمع جو رسولؐ کی تقریر سن رہا تھا، اس بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ رسولؐ نے مسکرا کے کہا: ''میں بھی یہی چاہتا تھا کہ مجھ سے نظر ہٹے تو اس پہ آ کے رکے۔'' دیکھو یہ بچہ کیا کہتا ہے۔ آج طلبہ بچے، طالبِ علم بچے، اس بچے کی تقلید میں جس نے معلم اعظم کے فرمان پہ وعدہ کیا تھا میں تیرا ساتھ دوں گا۔ آج اس کا ذکر کرنے کے لیے نیو کیمپس میں بچے اکٹھے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اس دس سالہ بچے نے جو وعدہ کیا تھا کہ تیری تعلیم پر میں عمل کروں گا۔ آیا اس نے کس طرح عمل کیا؟ کہیں عمل میں پریشان تو نہیں ہوا۔ افسوس کہ وسعت نہیں اتنی کہ ساری چیزیں بیان کی جائیں اور وقت اس قابل ہی نہیں کہ اس کو سمو سکے، اپنے اندر۔

سمجھے! ہاں یہ اور بات ہے کہ کبھی وجد میں آ کر اس کا ذکر سننے کے لیے گیا ہوا

سورج پلٹ کے آ جائے۔ یہ بات اور ہے۔ ورنہ یہ وقت ختم ہو جائے گا، ذکر ختم نہیں ہوگا۔ وعدہ کرلیا اس نے کہ میں آپ ؐ کی تعلیم پر عمل کروں گا اور قیامت تک مسلمان بچوں کو سبق دے گیا کہ مسلمان بچو! اپنے معلم کی بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اپنے بزرگ کی بات کو اچھی طرح سمجھ لو جو وہ تم سے کام لینا چاہتا ہے، اسے اچھی طرح سے سمجھ لو۔ اس کے ہر پہلو پر غور کرلو۔ اس کو اچھے طریقے سے اپنے ذہن میں بٹھالو اور جب تمہاری سمجھ میں آ جائے تو آنکھیں بند کر کے نہیں، سوچ کے، سمجھ کے، غور کر کے پھر اس سے وعدہ کرو تو عمل میں رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ عمل میں ہچکچاہٹ نہ ہونے پائے۔ عمل میں پھر رکنا نہیں۔ پھر عمل اس طرح کرو آنکھیں بند کر کے دنیا حیران رہ جائے کہ اس طرح عمل کیا جاتا ہے۔

لو بیٹو! ایک بات اور پھر بات ختم۔ وقت گزر جائے گا اور میں بیٹھ جاؤں گا۔ وعدہ کیا تھا نا عمل کا؟ تو اس طرح آنکھیں بند کر کے عمل کیا جب سمجھ گیا تھا تعلم کیا ہے؟ جب سمجھ گیا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ جب سمجھ گیا تھا کہ وہ اس سے منوانا کیا چاہتا ہے؟ یہ سوچ سمجھ کر وعدہ کیا تھا تو عمل اس طرح کیا۔

بھائیو! لو بچو! سن رہے ہو بات کو؟ سن رہے ہو؟ پکی بات ہے؟ شاباش! سن رہے ہیں بڑے غور سے بچے۔

یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ ایک سفید داڑھی والے کی بات کو نوجوان سن رہے ہیں۔ نہیں تو دو تین مرتبہ میرے ساتھ ایسا اتفاق ہوا ہے، جب میں تم جیسے لڑکوں میں چلا گیا تقریر کرنے، تو ان بچوں نے کہا: ''بابا بہہ وی جا، کسے بندے نوں گل کرن دے'' یہ تو اتفاق ایسا ہے کہ تم میری بات سن رہے ہو۔ آج تم نے مجھے بندہ سمجھ لیا ہے۔ سوچ سمجھ کے جب وعدہ کیا کہ میں تیری نصرت کروں گا، یونہی اندھی تقلید نہیں۔ آنکھیں بند کر کے نہیں۔ یونہی ساتھ دوڑ پڑنے والی بات نہیں۔ سوچ سمجھ کے وعدہ کیا تھا میں تیری نصرت کروں گا۔ اس سمجھ کے وعدے کا اثر یہ تھا کہ اس وعدے کے تیرہ سال بعد جبکہ رسول ؐ کا سن ہے ترپن (۵۳) سال کا۔ سن پختہ عمر ہے یا نہیں؟ ترپن (۵۳) سال کا رسول ؐ شام کے وقت، اپنے گھر کے اندر

کھڑے ہو کر یہ کہہ رہا ہے، ایک انیس سال کے نوخیز نوجوان سے۔ جتنے اس محفل میں اٹھارہ انیس سال کے نوجوان ہیں، وہ میری بات غور سے سنیں۔ ایک اٹھارہ انیس سال کے نوجوان سے، ترپین (۵۳) سال کا رسولؐ کہہ رہا ہے یہ، کھڑا ہو کے بیٹا برخوردار آج میرے گھر میں خطرہ ہے۔ بڑا سخت خطرہ ہے۔ تو بتاؤ بچو جب گھر کا بزرگ خطرہ بتائے تو بچے کے دل پر کیا گزرے گی؟ ہیں؟ وہ بھی ڈرا ہوگا یا نہیں؟ وہ بھی گھبرایا ہوگا یا نہیں؟

خطرہ ہے قبلہ! اور جب اتنا تجربہ کار بزرگ کہہ رہا ہے، خطرہ ہے تو بچہ بھی گھبرایا ہوگا۔ اس انیس سالہ بچے نے گھبرا کے پوچھا: قبلہ! خطرہ ہے؟ کہ ہاں بیٹا خطرہ ہے۔ ''واقعی خطرہ ہے؟'' کہ بہت ہی خطرہ ہے؟؟ کہ یقیناً خطرہ ہے۔ پھر قبلہ کیا پروگرام ہوگا؟ میں گھر چھوڑ کے جا رہا ہوں، کیوں؟ خطرہ ہے۔ اچھا قبلہ! میں کیا کروں؟ کہ تم یہیں رہو، کیوں؟ خطرہ ہے۔

سمجھے آپ۔ اب بتاؤ بچو! اگر وہ لڑکا یہ کہہ دے کہ میں تو نہیں رہتا تو کسی اخلاقی ضابطے میں، اس کا یہ انکار کرنا بری بات ہے؟ وہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ جب خطرہ ہے تو میں بھی نہیں رہتا۔ مگر دنیا حیران ہوگئی یہ سن کے جب اس بچے نے کہا کہ خطرہ ہے؟ کہ ہاں بہت خطرہ ہے، پھر کہ میں جا رہا ہوں اور میں! کہ تم یہیں رہو، کہ اچھا! میں یہیں رہوں۔ حیرت میں آ گئی ساری دنیا کہ یہ بچہ کیا کہہ رہا ہے؟ تو اسے اس وقت یہ بتایا گیا کہ اس نے سوچ سمجھ کر وعدہ کیا تھا، نصرت کا۔ اس لیے یہ کہہ رہا ہے کہ میں یہیں رہوں گا۔ رسولؐ جانے لگے تو اس بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا گھر میں خطرہ ہے، ہوشیار رہنا، کیوں؟ خطرہ ہے۔ خبردار رہنا، کیوں؟ خطرہ ہے۔

بے خبر سو جانا، کیوں؟ خطرہ ہے۔ ہے نا عجیب بات! بالکل بے خبر سو جانا، اس لیے کہ خطرہ ہے۔

سمجھے حضور!

اس نے کہا: لیجئے قبلہ! میں سو گیا۔ اپنے بستر پر لیٹ گیا کہ ٹھہرو تمہارے بستر پر خطرہ نہیں۔ میرے بستر پر لیٹو کہ خطرہ یہاں ہے۔ اب خطرے کا مرکز سمٹ کے بستر رہ گیا تھا۔

یہاں لیٹو، وہاں لیٹ گیا، یہاں سو جاؤں؟ کہ نہیں ایسے نہیں۔ اگر میرے بستر پر تم، ہم ہو کے سوئے تو خطرہ نہیں۔ میرے بستر پر تم، ہم بن کے سوؤ، ہیں؟ لیٹو، لٹایا اپنی چادر اوڑھا دی۔ اپنا عمامہ سرہانے رکھ دیا۔ اپنے نعلین قریب رکھ دیئے۔ اپنی تلوار پاس رکھ دی تا کہ دیکھنے والے، سونے والے کو جانے والا، سمجھیں ہیں، سو جاؤ، سو گئے؟ سو گئے۔ صبح تک کروٹ نہیں لی۔ بستر کی سلوٹ گواہ ہے۔ اسی طرح آرام سے سوتا رہا۔ ساری رات سوتا رہا۔ یہ ہے سوچ سمجھ کر کسی اسکیم کو پھر اس پر نصرت کا وعدہ کرنے کا نتیجہ۔ بے سوچے سمجھے، بغیر سوچے ہوئے وعدہ کر لینے سے یہ استقامت پیدا نہیں ہوتی۔ خود سمجھ لو کہ ہم نے کیا کام کرنا ہے؟ پھر وعدہ کرو تو اتنا پکا وعدہ کرو۔ سو گیا آرام کے ساتھ۔

سو گیا یا نہیں؟ اور اللہ نے کیا کیا؟ رات کو سوتا دیکھ کر اللہ نے، لو جی یہ آخری فقرے۔ سوتا دیکھ کر اللہ نے۔ کیوں بچو اللہ بھی کبھی سوتا ہے، ہیں؟ نہیں سوتا! اے لو! اللہ تو کبھی سوتا ہی نہیں۔ کبھی نہ سونے والے نے آج کا سونا جو دیکھا تو اس نے کہا: محمدؐ یہ بڑا کھرا سونا ہے، بڑا بہترین سونا ہے، میں نے اسے پرکھ کے دیکھا ہے، بہت ہی بہترین سونا ہے۔ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں۔ یہ سونا میں خرید نہ لوں؟ یہ سونا میں خرید لوں، محمدؐ! تم درمیانی بن کے یہ سونا مجھے خرید وا دو۔ محمدؐ تھے کہیں اور، سونے والا تھا کہیں اور، وہیں سے آواز دی: سونے والے کہ جناب عالی! وہیں سوتے میں کہا: سونے والے! ہاں کیا ہے؟ سونا بیچتے ہو؟ جی ہاں! کیا لو گے؟ قبلہ کیا دو گے؟ خریدتا کون ہے؟ کہ کبھی نہ سونے والا اللہ خریدار ہے، اچھا! اللہ خریدار ہے؟ پھر بیچتے ہو؟ کہ بیچتا ہوں۔ کیا قیمت لو گے؟

قبلہ بات سنو جب اللہ جیسا خریدار ہو تو قیمت پر جھگڑا کرنا خلافِ تہذیب ہے۔ اللہ سے کہہ دو کہ سونا میرا حاضر ہے، قیمت میں جو اس کی مرضی ہے وہ دے دے، جو مرضی ہے، دے دے۔ بس مرضی قیمت ہے، سونا حاضر ہے۔ اللہ نے کہا: منظور۔ سودا ہو گیا کہ قبلہ یہ ملے گی کب؟ کہ قیامت میں، قیامت کا ادھار؟ بیعانہ مل جائے تا کہ سودا پکا ہو جائے۔ اللہ نے بیعانے میں جنت دے دی۔ جنت تیری قیمت نہیں یہ بیعانہ ہے۔ جنت پر قبضہ کر لیا۔

سمجھے نا حضور!

ہوئی جو شادی تو وہی جنت جو اس دن بیعانے میں ملی تھی، منہ دکھائی میں بیوی کو دے دی۔ خریدی تھی شوہر نے، خاتون جنتؑ کہلاتی ہے بیوی۔ بیوی نے بچوں کے نام کردی۔ رسولؐ نے رجسٹری کردی انتقال کی اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَ شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّةِ باپ نے خریدی، ماں ملکہ بنیؑ۔ حسینؑ مالک بنے۔

بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے، اللہ نے جنت کے صدر دروازے پہ یہ نام لکھ کر لگا دیئے: محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ، ان شاء اللہ۔

نیو کیمپس کے نوجوانو!

تم چلنا جنت میں۔ چلو گے یا نہیں؟ ہیں؟ جاؤ گے نا؟ (آوازیں، ان شاء اللہ) انشاء اللہ کی کیا بات ہے؟ جائیں گے۔ وہاں ضرور جانا ہے، وہاں جاؤ گے۔ مجھے بھی آواز دے لینا۔ سواد آجائے گا۔ جب دروازے پہ یہ نام لکھے دیکھیں گے نا۔ اگر کسی فرشتے نے روکا بھی تو کہہ دینا: ''فرشتے ہٹ جا ہمارا وقت ضائع نہ کر، یہ نام نہیں دیکھتا۔ اندر تو محفل ہو رہی ہے، زیدی تقریر کر رہا ہوگا۔ چلو چلیں اندر۔'' ان شاء اللہ! یہ نام دیکھ کے ہم فوراً پہنچ جائیں گے۔

تمہاری محفلوں کو اللہ قبول کرے۔ تمہارے اندر تقویت دین عطا فرمائے۔ دینی محفلیں منعقد کرنے کا تم میں شوق اور شعور پیدا کرے۔ جب کوئی دینی محفل منعقد کیا کرو اگر میری صحت ٹھیک ہو تو مجھے ضرور بلایا کرو۔ آج تو بیماری کے عالم میں، میں نے چند منٹ آپ سے باتیں کر لی ہیں۔ مجھے بلایا کرو ضرور۔ خدا تمہیں خوش رکھے! اللہ تمہیں سلامت رکھے! خوب سوچ کے، سمجھ کے، غور کر کے، ذہن میں بٹھا کے، ہر پہلو اور نشیب و فراز کو دیکھ کر جو عزم کر لو پھر اس پر جم جاؤ، سمجھے؟

اللہ تمہیں سلامت رکھے! خدا تمہیں خوش رکھے! خدا حافظ۔ فی امان اللہ!

انسان اور انسانیت

فضائل ..... انسان اور انسانیت

مصائب ..... شہزادگانِ عونؑ و محمدؑ

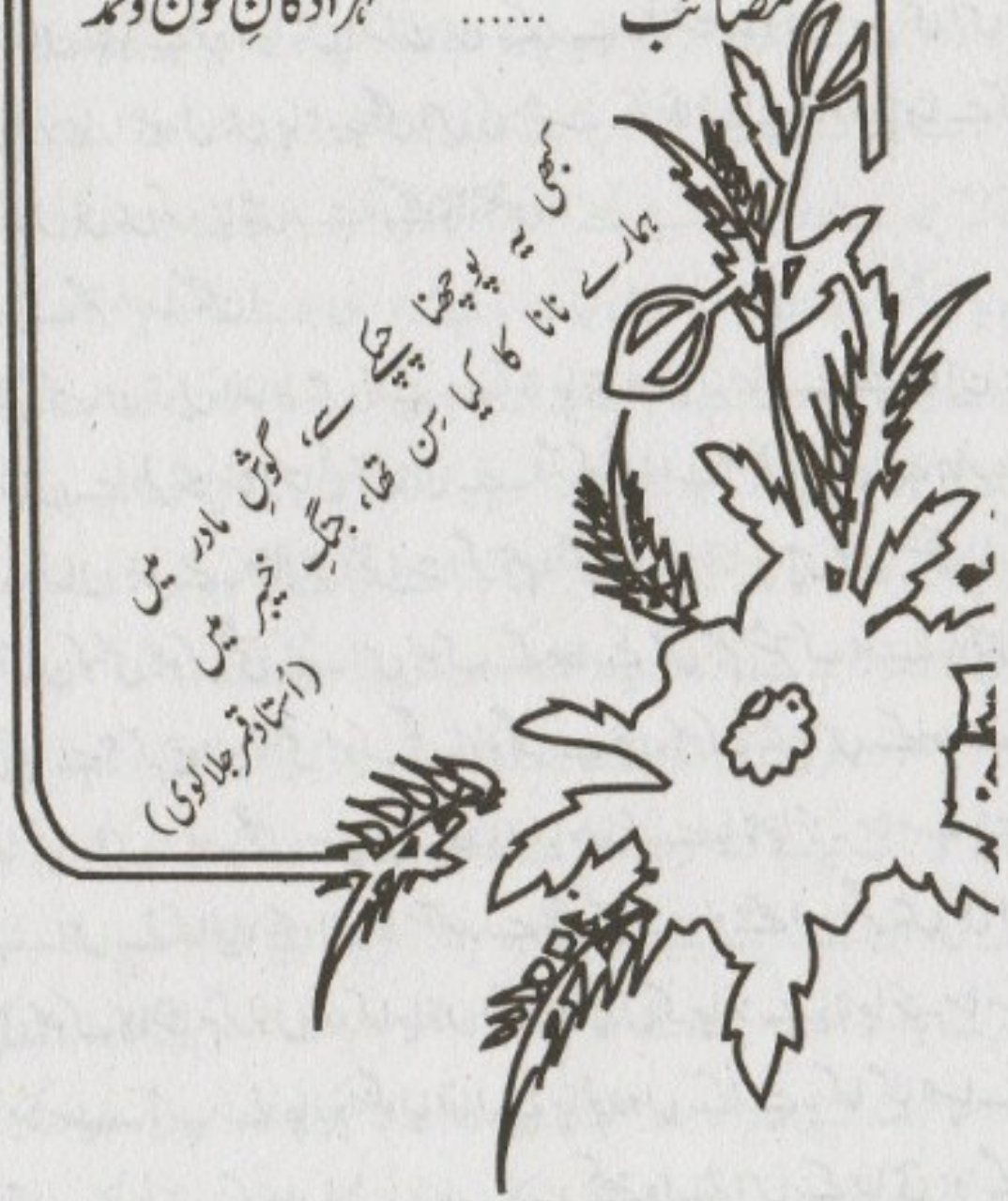

انسان اور انسانیت

میں آج گفتگو یہاں سے شروع کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی خاص مقصد کے لیے خلق فرمایا ہے اور سب سے بڑا مقصد یہ ہے اور سب سے بڑی بات جو اللہ ہم سے چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے۔ تو ہم میں انسانیت ہو، جسے اس نے انسان بنایا ہے وہ دنیا میں انسان بن کے رہے۔ فرشتہ بنانا ہمارا، یہ بھی اس کا مقصد نہیں اور ہمارا حیوان بن جانا، یہ بھی اس کی مشیت کے خلاف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان، انسان ہی بن کر دنیا میں رہے، سمجھے نا! حضور۔

میرے محترم سامعین!

میں آسان ترین الفاظ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے حیوان بننا انتہائی آسان ہے، فرشتہ بننا انتہائی آسان ہے۔ اگر کوئی ذات مشکل ترین ہے ہمارے لیے، تو وہ انسان بننا ہے۔ مثلاً خدانخواستہ اگر ہم ابھی حیوان بننا چاہیں تو یہ مشکل بات نہیں۔ انسان کو بھی بھوک لگتی ہے۔ اس بھوک کے معاملے میں ہم مشترک ہوئے یا نہیں؟ اب فرق کیا ہے؟ کہ حیوان کو بھی بھوک لگی۔ وہ گھر سے چلا، بھوک میں اس کے سامنے جو آیا وہ کھا گیا۔ اس نے یہ نہیں سوچا اپنا ہے یا پرایا، جائز ہے یا ناجائز۔ مناسب ہے یا نامناسب۔ اس نے کھالیا، یہی اس کا مقصد ہے بغیر کسی سے پوچھے اور اگر میں بھی اس طرح اپنی بھوک کا انتقام کرلوں اور کھا جاؤں اور نہ سوچوں کہ جائز ہے یا ناجائز۔ مناسب ہے یا نامناسب۔ آپ نے چارہ منگوایا تھا اپنے جانوروں کے لیے۔ کھا گیا ہمسائے کا جانور۔ آپ نے اُس کے چار ڈنڈے مارے۔ دیکھنے والے اس کے حمایتی ہو گئے۔

ارے بھائی جانے بھی دو حیوان ہے، بیچارہ۔ سارا چارہ کھا گیا، پھر بھی اس کے حمایتی۔ سارا کھیت کھا گیا پھر بھی اس کے حمایتی۔ ہمارا پورا باغ ہضم کر گیا، پھر بھی اس کے حمایتی۔ تو حیوان بننا بڑا ہی آسان ہے۔ فرشتہ بننا بڑا ہی آسان ہے۔ آپ نے بازاروں میں تو کئی ''ولی اللہ'' دیکھے ہوں گے۔ ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ فرشتہ نظر آ رہا ہے۔ ولی نظر آ رہا ہے۔ یہ انسان بھی کتنا عجیب ہے کہ اگر ماننے پہ آ جائے تو ''بازاری'' کو، ولی مان لے، نہ ماننے پر اَڑ جائے تو علیؑ کو ولی نہ مانے۔

نہ اللہ انسان کا حیوان بننا پسند کرتا ہے، نہ فرشتہ بننا پسند کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اے انسان! انسان بن، آرام سے رہ، اچھا لباس پہنو، اچھی خوراک کھاؤ، خوشبو لگاؤ، نماز پڑھو اور امن سے زندگی بسر کرو۔ یہ چاہتا ہے اللہ آپ سے، یہ نہیں کہ ساری رات بلند آواز سے چیختا رہے۔ نیند آتی نہیں، بے کاری کا مشغلہ ہے۔ بلند آواز سے چلائے جا رہا ہے کہ ''میرے مولا بلا لو مدینے مجھے'' اب مولاؑ کو کیا غرض پڑی ہے بلانے کی۔ اب مولاؑ کے پاس بھی جانا ہے تو مولاؑ کو ہی کہا جا رہا ہے کہ خود ہی بلا لے۔ خود جاؤ، ہمسایوں کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود جانے کی تیاری کرو، خود ارادہ کرو تو بلائے۔ صبح کی نماز قم میں پڑھو، ظہر کی نماز مشہد میں پڑھو، عصر کی نماز کاظمین میں پڑھو۔ مغرب کی نماز کربلا میں پڑھو۔ عشاء کی نماز نجف میں پڑھو۔ پھر اسے بلانے کا مزہ بھی آئے۔ حلال کماؤ، حلال کھاؤ، آرام سے رہو۔ مگر یہ حالت انسان میں پیدا ہو گئی ہے۔

حضرت نوحؑ کے طوفان کے بعد دو لفظوں میں بیان کرتا ہوں، ہے تو لمبی چوڑی، تاریخ کی بات یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کے طوفان کے بعد ان کے بیٹوں کی نسل دنیا بھر میں پھیل گئی۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام تھا، سام۔ دوسرے بیٹے کا نام تھا، یافث۔ ایک سام دوسرے یافث اور تیسرے تھے، حام۔ ''سام، حام، یافث'' سام چونکہ بڑے بیٹے تھے، لہٰذا اسام کے بیٹے نے حکومت سنبھالی۔ یافث اور حام کی اولاد اس کی رعایا ہو گئی۔ صرف اس لیے سام کی اولاد نے حکومت سنبھالی کہ وہ بڑے بیٹے کی اولاد تھے چونکہ سو پچاس برس تو

اسی طرح گزر گئے تو یافت اور حام کی اولاد یہ سمجھ بیٹھی کہ ہم دنیا میں پیدا ہی اسی لیے ہوئے ہیں کہ رعایا بن کے رہیں اور سام کی اولاد یہ سمجھ بیٹھی کہ ہم دنیا میں پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ حکومت کریں تو ہر وہ حکومت جو بغیر کسی دلیل کے محض ''بڑے پن'' کے دوسرے پر قابض ہو جائے تو وہ آج بھی ''سامراج'' کہلاتی ہے۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ انسان کو دنیا میں انسان بن کر رہنا چاہیے۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے، لہٰذا انسان ہی بن کر رہے۔

آپ حضرات کی خدمت میں ایک نکتہ پیش کرنا ہے اور نقطے کی حیثیت بھی بڑی ہے۔ اسے پڑھنے کے لیے احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک نقطے کے بدلنے سے خدا ''جدا'' ہو جاتا ہے۔ تو عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انتخاب کا ترجمہ بنتا ہے چھانٹنا۔ چننا نہیں ہے اور چننے کے لیے اصطفیٰ۔ اس کا اصطفی ہوتا ہے جو چنا ہوتا ہے اور جس کا انتخاب ہو ''چھنٹا'' ہوا ہوتا ہے۔ اور اللہ کے چنے ہوئے میں معاذ اللہ کوئی شبہ ہو سکتا ہی نہیں۔ غلطی کا شائبہ تک نہیں۔ اگر چنے ہوئے میں ذرا سی بھی غلطی نکل آئے تو وہ چننے والے کی بھی غلطی ہے اور اگر غلطی نکل آئے تو یا اس میں خرابی ہے یا چننے والے کو غلط چنا۔

ایک بات ہے اگر آپ حضرات کی سمجھ میں آ جائے کہ ایک شخص نے بڑی خوبصورت کوٹھی بنوائی، عظیم الشان۔ لاکھوں روپیہ خرچ کیا اس کے بنانے میں۔ اس میں ایک بڑا قیمتی کمرہ بھی بنوایا۔ بھلا سا نام ہوتا ہے، بتائیں آپ۔ آپ پتہ نہیں اس کا کیا نام ہے، ڈرائنگ روم۔ ہاں یہی ہے۔ ڈرائنگ روم۔ ہاں نا! نام ڈرائنگ روم اس لیے کہ غریب لوگ اس کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ اسے سجایا گیا۔ امریکہ سے تحفے منگوائے۔ ایران سے قالین منگوائے ہر ملک سے کچھ نہ کچھ منگوایا۔ لاکھوں روپے لگائے۔ شہرت ہو گئی، کوٹھی بنی۔ ڈرائنگ روم تو سبحان اللہ! اب جو شور مچ گیا نا! ایک نابینا بھی چلا گیا۔ جاتے ہی چیزوں سے ٹکراتا گیا۔ لاحول ولا۔ ''اب نظر خود کو نہیں آتا'' اگر آنکھ ہوتی تو جلوہ دیکھتا۔ خرابی چیز میں نہ تھی، دیکھنے میں خرابی تھی۔

تو صاحبان! آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک کسی میں کوئی عیب ہوسکتا ہی نہیں، ان میں غلطی ہوسکتی ہی نہیں۔ نبی ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ یہ خالق کا تخلیقی کمال ہیں اور اس کے کمال میں نقص بتانا یہ اپنی بے ہنری بتانا ہے۔ یہ جہالت کی دلیل ہے۔ سارے انبیاء کا بادشاہ نبی تھا، ہمارا نبیؐ۔ اب کئی صاحبان بتاتے ہیں کہ جب پہلی وحی آئی، اس کے پاس جبرائیلؑ نے آ کر وحی سنائی تو وہ ڈر گیا۔ جبرائیلؑ کو پہلی دفعہ دیکھا تھا، ڈر گیا۔ ڈرے ہوئے گھر آئے۔ آ کر بیوی سے کہا: ام المؤمنین کو بتایا کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا۔ وہ بیچاری اسے اپنے بھائی کے گھر لے گئی اور ان کے بھائی کا نام تھا ''ورقہ'' اس ''ورقہ'' نے سارا قصہ سنا اور کہا کہ ''واقعی سچ مچ ہے۔'' کہا کہ ''ہاں'' کہ پھر تو تم نبیؐ ہو گئے ہو۔ اچھا تو یہ بات ہے کہ ہاں۔

اب ایک فقرہ کہتا ہوں۔ صاحبانِ ذوق کے لیے کہ اب بتایئے کہ جو نبیؐ ہو صاحب ام الکتاب اس نبی کو سمجھائے گا کون۔ ایک ورقہ اسے سمجھا رہا ہے ایک ورقہ۔ اس کا علم کجا، اس کی تعلیم کجا، اس کی عقل کجا، جس درجے پر وہ فائز ہوتے ہیں، وہاں تک ہماری عقل کی رسائی نہیں۔ ہمارا فہم ان تک پہنچ نہیں سکتا۔ وہ انسان بنانے کے لیے آتے ہیں، ہم بننے کے لیے آئے ہیں۔ انسان کو انسان بنانے کے ان کے پاس مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو انسان بناتے ہیں پاس بٹھا کے۔ جتنے ذرائع ہو سکتے ہیں سمجھانے کے وہ استعمال کرتے ہوئے۔ دیکھتے چلو۔ میں جس طرح نماز پڑھتا ہوں مجھے دیکھ کر ویسی ہی پڑھو۔ اب جو دیکھا ہے، اس میں سب کچھ آتا ہے نماز پڑھنا کس طرح ہے، کھڑا کس طرح ہوتا ہے۔ رکوع کس طرح کرتا ہے۔ سجدہ کس طرح کرتا ہے۔

دیکھو، کس کو؟ رسول کو۔ دن میں پانچ دفعہ دیکھا۔ اب اندازہ لگا لو کہ زندگی میں کتنی ہزار دفعہ دیکھا ہوگا۔ کتنی ہزار دفعہ دیکھی ہوئی لاکھوں صحابیوں کی نماز۔ آج تک وہ نماز متنازعہ ہے کہ کس طرح پڑھی جائے۔ کوئی ہاتھ باندھ کے پڑھتا ہے، کوئی ہاتھ کھول کے پڑھتا ہے۔ اس نماز کو جس کو ہزاروں مرتبہ صحابہ نے دیکھا اس کا پتہ نہیں کہ ہاتھ کھول

کر پڑھنی ہے یا باندھ کر پڑھنی ہے۔ اگر رسولؐ نے ہاتھ باندھ کر پڑھی تھی تو کھولنا غلط اور اگر ہاتھ کھول کر پڑھی تھی تو ہاتھ باندھنا غلط اور یہ فیصلہ نہیں کر سکے مسلمان۔ ہاتھ باندھنے والے کو ہاتھ کھولنے والے غلط کہہ رہے ہیں اور ہاتھ کھولنے والے کو ہاتھ باندھنے والے برا کہہ رہے ہیں اور جو نہ باندھتے ہیں نہ کھولتے ہیں انہیں کوئی پوچھنے والا ہے ہی نہیں۔ جو ہزاروں مرتبہ دیکھی ہوئی نماز کا مسلمان فیصلہ نہ کر سکے کہ ہاتھ کھول کر پڑھی تھی یا کہ ہاتھ باندھ کر پڑھی تھی۔ اب بتائیں ایمان سے کہ جس قوم کو اپنے رسولؐ کے لاکھوں دفعہ دیکھے ہوئے ہاتھ یاد نہیں رہے، اس قوم کو اگر ایک دفعہ کے اُٹھاتے ہوئے ہاتھ یاد نہ رہیں تو کون سی بڑی بات ہے۔

تو اللہ نے ہمارے لیے رسولؐ اس لیے بھیجے کہ اے رسولؐ! انہیں انسان بناؤ، انہیں نماز روزہ سکھاؤ، انہیں رہنے کا طریقہ سکھاؤ، انہیں جینے کا سلیقہ سکھاؤ، بھائی بھائی کے تعلق بتاؤ، رشتہ داروں کے حقوق بتاؤ، یہاں تک کہ سوا لاکھ تک انبیاء بھیجے۔ صرف سمجھانے کے لیے۔ ایک لاکھ پچیس ہزار تک تو کتابوں میں تعداد ملتی ہے۔ یا اللہ جب انبیاء کا سلسلہ ختم ہو گیا اس کے بعد جو ہم پیدا ہوئے ہمارا کیا قصور ہے؟ پہلے لوگوں میں تو سمجھانے والے نبی موجود تھے اور ہم نے کون سا قصور کیا ہے؟ اب کیا بنے گا۔ اللہ کہتا ہے کہ میں نے نبوت ختم کی ہے ہدایت تو ختم نہیں کی۔ نبوت الگ بات ہے، ہدایت الگ بات ہے۔

قبلہ! ہدایت کیسے قائم ہے؟ اب اس بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ یہ اپنی بات ہے۔ یہ ہمارے یو۔ پی کی بات ہے۔ یہ ہمارے ہاں طریقہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک درخت ہوتا ہے ''آم'' اس کثرت سے کہ ''آم'' بس آم ''عام'' تھے اور ہم یو۔ پی والوں کو اتنا پیار تھا آم سے کہ یہ جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ پھل ہمارے ملک سے باہر نکلے۔ اسے اپنے علاقے میں محدود رکھنے کے لیے ہم نے اس کی ٹانگیں توڑ کر اسے لنگڑا کر دیا۔ مگر اسے لنگڑا بنا دینے کے باوجود وہ لاہور میں بک رہا ہے۔ کراچی میں بک رہا ہے۔ نامراد تو یہاں کیسے آ گیا۔ تجھے تو ''وہاں'' کے لیے چھوڑ آئے تھے۔ تو صاحبانِ ذوق جس کا دل

''گھر'' میں نہ لگے اسے کون روکے۔ یہ آم کی بات تھی، بالکل مختصر کرتا ہوں حضور والا! خیر آم ہوا کرتے تھے ہمارے علاقے میں۔ بعض بڑے اچھے بڑے میٹھے ہوتے تھے اور بعض ذرا ترش، حالانکہ ہوتے ایک ہی ''باغ'' کے تھے۔ بعض میں بہت زیادہ مٹھاس تھی اور کئی بڑے ترش، ''میٹھے'' آم کے ''دائیں بائیں'' اکثر ہوا کرتے تھے مگر تاثیر وہ نہ تھی۔

ذرا غور سے سننا اور کوئی بات یاد نہ رہے گی تو یہ آم کی بات یاد رہے گی۔

خدا تمہیں سلامت رکھے۔

اب آم میں ہر سال میوہ آتا تھا۔ کئی سال گزر گئے۔ سالہا سال بیت گئے۔ اب کیا ہو گیا۔ اب ''فصل'' نہیں ہو گی۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ کہ یہ ''بلا فصل'' ہے۔ جب ''فصل'' ختم ہوئی تو اب ہو گیا۔ ''بلا فصل'' پریشان ہو گئے کہ اتنا قیمتی پھلدار درخت۔ فصل آتی نہیں۔ اسے کیسے باقی رکھا جائے؟ تو مالی نے جاننے والے سے کہا کہ اس کا طریقہ میں بتاتا ہوں۔ اسے ''بلا فصل'' ہو جانے دو، اسے ختم ہو جانے دو۔ ایک آم کا پودا جس کی جنس کا پودا، آم ہی کا پودا، اسے گھر میں لگاؤ اور جب تمہارے گھر میں اُگا ہوا پودا ذرا ''سیانا'' ہو جائے نا! تو اسے ختم ہونے والے درخت کے نیچے رکھ دو۔ اور اس جیسی آب و ہوا ہی میں اسے رہنے دو اور اس ختم ہونے والے کی ایک شاخ اس پودے کے ساتھ پیوند کر دو اور اگر پیوند ہو جائے پکا تو شاخ کو کاٹ دو کہ اس قلم کو لے کر پھر اپنے گھر چلا جائے۔ نیا درخت تیار ہو جائے۔

باغِ عالم میں شجرِ نبوت نے ایک لاکھ چوبیس ہزار بہاریں دیکھیں۔ اور نبوت کا شجر جب بلا فصل جو ہوا تو اللہ نے اسی جنس کا جس جنس کی نبوت تھی۔ ایک پودا اپنے گھر اُگایا۔ پودا اتنا زوردار تھا کہ گلے میں شگاف آ گیا۔ اب جو اللہ کے گھر میں اُگا ہوا نبوت کا پودا اسی جنس کا اب جو ذرا پرزے نکلے تو اسے ختم ہونے والے شجرِ نبوت کی آغوش میں دے دیا، تاکہ آب و ہوا بھی ویسی ہی مل سکے اور ذرا سنبھل جائے۔ اب اس آب و ہوا میں جب ذرا شاداب ہوا، تو اس ختم ہونے والے شجرِ نبوت کی ایک ہری بھری شاخ کا پیوند لگ

گیا اور یہ پودا اس شاخ کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔ وہ ''ختم'' ہونے والا قیامت تک کے لیے ''قائم'' ہو گیا۔

میرے محترم سامعین!

اب ادھر ایک نیا درخت تیار ہو گیا۔ ختم ہونے والے درخت کا نام آپ ''نبوت'' رکھ دیں۔ قائم رہنے والے کا نام ''امامت'' رکھ دیں۔ جنس دونوں کی ایک ہے۔ معصوم کی معصوم سے ہوئی قلم بندی۔

جنابِ والا!

اب نئی شے تیار ہو گئی۔ نبوت کے پلنے کا اندازہ اور تھا۔ امامت کے پلنے کا اندازہ اور تھا۔ اب جو درخت بنا ہے نبوت و امامت کے اتصال سے۔ اس کے جو ثمر ہوں گے ان میں نبوت کا اثر بھی ہو گا امامت کا اثر بھی ہو گا۔

اسے میں مختصر کرتا ہوں حضور والا!

اس نئے درخت پر ثمر آنا شروع ہو گئے۔ بالکل مختصر کر دیا ہے میں نے اپنی بات کو۔ ثمر آنے شروع ہو گئے اس درخت پر۔

میرے سامعین! اس نئے شجر پر پہلا ثمر آیا ہے وہ تو ہرا ہی پک گیا، وہ ہرا ہی پک گیا اور دوسرا ثمر جو آیا وہ سرخ ہو گیا اور باغیوں میں بٹ گیا۔ جب دو ثمر آ چکے ایک حسنؑ اور ایک حسینؑ۔ کائنات کئی دفعہ ختم ہو اور پھر بنے۔ مگر! کسی ماں باپ کے حسنؑ حسینؑ جیسے بیٹے نہ ہوں گے۔ علیؑ کی لاکھ فضیلتیں سہی۔ سیدہ کے لاکھ شرف سہی۔ مگر جب یہ کہا جاتا ہے حسینؑ کا ابا، حسینؑ کی اماں! ان کی شان ہی اور ہو جاتی ہے۔ کہاں کسی کی ایسی اولاد، کہاں کسی کے ایسے بیٹے، کسے نصیب میں ملے۔

اب اس شجر میں جو ثمر آیا حسنؑ اور حسینؑ کے بعد اس کی شان ہی اور تھی اور علیؑ نے اس ''ثمر'' کو سفید رومال میں لپیٹا۔ لپیٹ کر رسولؐ کے سامنے لے آئے۔ قبلہ حضور نے یہ ''نعمت'' فرمائی ہے۔ رسولؐ نے علیؑ کو دیکھا۔ باپ کو دیکھا پھر بیٹی کو دیکھا اور فرماتے ہیں

کہ یہ تو اپنے باپ کی زینت ہے۔ علیؑ کو بڑا پیار ہے۔ بے انتہا پیار ہے اس ''نعمت'' سے۔ جس کا نام ''زینبؑ'' ہے۔ جب بھی باہر سے گھر میں آتے تھے، پہلی بات پوچھتے تھے: میری زینبؑ بیٹی کہاں ہے؟ باپ کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھاتی، باپ کی گود میں کھیلتی۔

سیدہؑ فرمایا کرتیں: یا علیؑ! ہے تو بیٹی مگر مجھ سے زیادہ آپؑ سے پیار کرتی ہے۔ باپ کی گود میں اکثر سو جاتی، ہر وقت باپ کا ہی خیال رہتا اور علیؑ سیدہؑ سے کہتے کہ فاطمہؑ مجھے اس بیٹی کو اُٹھا کے اتنا سکون ملتا ہے، میں اتنا مانوس ہوں اس بیٹی سے کہ بیان سے باہر ہے۔

اب حضور! پیدل چلنے لگی، زینب بیٹی۔ باپ کے ساتھ ٹہلا کرو۔ معصوم پیدل چلنے کی عادت ڈالنے لگے تو خاندان کے افراد پریشان ہو گئے۔ جب چار سال کی تھی کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھا۔ ماں نے وصیت کی تھی بیٹی سے کہ ہے تو زینبؑ، ہے تو بیٹی، یہ حسنؑ اور حسینؑ تیرے بھائی ہیں۔ اب میں جا رہی ہوں اب یہ بن ماں کے ہو رہے ہیں۔ ان سے اتنا پیار کرنا کہ انہیں ماں یاد نہ آئے۔ اب بھائیوں نے کیا کیا؟ جب حسنؑ یا حسینؑ گھر آئے زینبؑ کو سلام کا موقع نہیں دیا بلکہ پہلے کہہ دیا گھر میں داخل ہوتے ہی، بہن سلام!

اب میرے معزز سامعین!

یہ شریف ترین خاندان زمانے کا روانہ ہو رہا ہے مدینے سے۔ روانہ ہوئے مدینہ سے۔ اُٹھائیس رجب تھی، آدھی رات کا وقت تھا۔ سیدانیوں کی محملیں اور ناقے دروازے کے ساتھ آ کے بٹھائے جا رہے تھے۔ ایک ناقہ بیٹھتا اور خاندان کے نوجوان آواز دیتے۔ محلے والو! ہوشیار فلاں خاتون سوار ہو رہی ہے۔ وہ خاتون سوار ہو جاتی۔ ناقہ چلا جاتا۔ سب کے بعد سیاہ پردے لگے ہوئے ناقہ آیا، دروازے پر۔ اور آ کر بٹھایا گیا اور قمر بنی ہاشمؑ نے آ کر آواز دی، محلے والو! کوئی شخص باہر نہ نکلے۔ کوئی سوار ہو کر نہ گزرے، دروازے بند ہوں، کوئی بچہ شور نہ مچائے۔ اب بنت علیؑ سوار ہو رہی ہیں۔

ادھر حسینؑ اصحاب میں، ہیں رشتہ داروں میں ہیں۔ حسینؑ اُٹھے، بھائیو! اب

اجازت دینا میں خود جا کے ذرا زینبؑ کو سوار کرا دوں۔ امامؑ آئے، بہن کو سوار کرایا۔ ایک بازو حسینؑ کے ہاتھ میں ایک بازو علی اکبرؑ کے ہاتھ میں۔ عونؑ و محمدؑ نعلین سنبھالے ہوئے۔ عباسؑ نے محمل کا پردہ اُٹھایا۔ اب جو محمل کے قریب آئیں۔ تو فرماتی کیا ہیں؟ حسینؑ بھائی میرا بازو چھوڑ دو۔ اکبرؑ بیٹے میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ امام فرماتے ہیں: بہن کیا بات ہے؟ کچھ نہیں ذرا میرے بیٹے زین العابدینؑ کو آواز دو۔ زین العابدینؑ آ گئے۔ زین العابدین بیٹا! زینبؑ کو تم سوار کراؤ۔ اور سوار ہو گئیں۔ جناب زینب اور عبداللہ ابن جعفرؑ طیار محمل کے پاس خاموش کھڑے۔ صرف اتنا کہا کہ ''خدا حافظ۔''

میرے محترم سامعین!

میں بات کو مختصر کرتا ہوں۔ یہ لوگ مکے پہنچے اور جب مکہ سے حسینؑ روانہ ہوئے تو شہر مکہ سے نکل کے یہ قافلہ ایک میل پہنچا ہو گا کہ ایک آواز آئی۔ حسینؑ ٹھہرو۔ اور حسینؑ ٹھہر گئے۔ قافلہ ٹھہر گیا۔ گھوڑے کو روک کر حسینؑ نے آواز کی طرف دھیان دیتے ہوئے قافلے میں کہا کہ عباسؑ بھائی دیکھو کس کی آواز ہے؟ حضور نے ادھر دیکھ کے کہا: غالباً عبداللہؑ آ گئے، آئے کس شان سے، ایک ہاتھ عونؑ کے کندھے پر اور ایک ہاتھ محمدؑ کے کندھے پر، پہنچے۔ امامؑ نے فرمایا: کیوں تکلیف فرمائی میں تو ابھی مل کے آیا تھا۔ حسینؑ ایک کام رہ گیا تھا۔ ایک بات رہ گئی تھی اور عونؑ و محمدؑ سے کہا کہ بچو! مجھے اس ناقے کے قریب لے جاؤ، جہاں تمہاری اماں بیٹھی ہے۔ عونؑ و محمدؑ لائے۔ ناقہ بٹھایا گیا۔

عبداللہ مخاطب ہوئے۔ علیؑ کی بیٹی جا رہی ہو اور زینبؑ جواب میں کہتی ہیں ابنِ عم تیری اجازت نہ ہو تو اُتر آؤں۔ میں تو تیری اجازت سے جا رہی ہوں مگر یاد رکھنا کہ حسینؑ کے بغیر زینبؑ کا جنازہ اُٹھے گا۔ عبداللہؑ بولے میں روکتا کب ہوں۔ میں تو تاکید کرنے آیا ہوں کہ جاؤ تو ضرور مگر زہراؑ کی بیٹی تو جعفرؑ طیار کے رئیس کی بہو ہے اور سفر کا معاملہ ہے۔ ملک عراق کا سفر ہے۔ حسینؑ جیسی قیمتی شے تیرے ساتھ ہے۔ خالی ہاتھ جا رہی ہو۔ اگر کہیں حسینؑ پہ مصیبت بن گئی اور مصیبت کو ٹالنے کے لیے اگر صدقہ دینا پڑا تو کیا کرو

گی۔تم خالی ہاتھ جارہی ہو اور عونؑ و محمدؑ کے ہاتھ زینبؑ کے ہاتھ میں دے کے کہا کہ یہ دونوں بچے حاضر ہیں۔ انہیں بھائی کا صدقہ کر دینا۔ اپنی طرف سے صدقہ کر دینا۔ اب زینبؑ نے بیٹوں کو باقی زندگی عونؑ و محمدؑ کہہ کے نہیں پکارا۔ بھائی کا صدقہ کہہ کے پکارا۔

معزز سامعین کرام!

رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ امام مصلے پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ اتنے میں جناب فضہ آئیں، فرماتی ہیں: حسینؑ بہن نے یاد کیا ہے۔ حسینؑ آئے، کیا دیکھتے ہیں زینبؑ کے ایک طرف عونؑ کھڑے ہیں، ایک طرف محمدؑ کھڑے ہیں۔ حسینؑ نے آتے ہی کہا: زینبؑ سلام فرماتی ہیں۔ حسینؑ تھوڑی دیر کے لیے مجھے بہن نہ کہنا۔ تجھے میں نے بھائی سمجھ کے اب نہیں بلایا۔ میری بات سنو! تم ہو حیدرؑ کے بیٹے، میں جعفر طیار کی بہو ہوں۔ آج میں حیدرؑ کے بیٹے سے جعفرؑ کے پوتوں کے لیے شہادت کی بھیک مانگتی ہوں۔

اور بھائیو! قصہ ختم ہوتا ہے۔ بات ختم کرتا ہوں۔

صبح ہوئی، ایک ایک شہید کی لاش آتی رہی خیمے میں اور زینبؑ پوچھتی رہیں کہ ابھی عونؑ و محمدؑ زندہ ہیں۔ ابھی عونؑ و محمدؑ کی لاشیں نہیں آئیں۔ بچے گھر میں آ گئے۔ اماں سلام! ہائیں ابھی تم زندہ ہو۔ میں تو صبح سے مصلے بچھائے بیٹھی ہوں کہ تمہاری لاشیں آئیں اور میں سرخرو ہو جاؤں۔ تم ابھی تک میدان میں نہیں گئے۔ دروازے تک آئی۔ بچے میدان میں گئے، لڑتے رہے، خیموں سے صدا بلند ہوئی کی زینبؑ کے بچے شہید ہو گئے۔ کہا: زینبؑ کہاں ہے؟ رک گئے۔ دیکھا کہ سجدے میں ہیں۔ امامؑ لاشیں لے کے آئے، یا اللہ تیرا شکر ہے۔ اب جو ماں آئی بیٹوں کی لاشوں پر بیٹھ گئی۔ بیٹھی ہی تھی کہ چھوٹے کے لب ہلے، کیا کہنا چاہتا ہے۔ بچہ کہہ یہ رہا تھا اماں! اب تو تو راضی ہو گئی ناں! ہم پیاسے تھے۔ ورنہ بڑے دور اور دیر تک لڑتے اور زینبؑ سر کے بال چوم کر، ماتھے کے زخم چوم کر کہہ رہی ہیں کہ میرے بیٹو! اگر کبھی جھڑکا ہو تو معاف کرنا۔ عونؑ و محمد، میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ اب میری ایک اور بات یاد رکھنا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد تم اپنے نانا حیدر

کرارؑ کے پاس پہنچو گے۔ کوثر کے کنارے، اگر ساقی کوثر، کوثر کے کنارے تمہیں پانی پلائے تو میرے بچو! ماں کی بات ضرور یاد رکھنا۔ کوثر پہ جا کے بھی حسینؑ سے پہلے پانی نہ پینا۔

سامعین! جی بھر کے رولو۔ ان کی ماں کو کسی نے نہیں رونے دیا۔ جی بھر کے رولو۔ یہ زینبؑ کے بچوں کی مجلس ہے۔ اب میں پردہ نشین خواتین سے کہنا چاہتا ہوں کہ تمہاری مجالس دن کو ہوتی ہیں، جب تمہاری مجالس ہو تو تمام اکٹھی ہو کے سر کے بال کھول دینا اور زینبؑ کو عونؑ و محمدؑ کا پرسہ دینا۔ زینبؑ ہم تیرے بچوں کو رونے آئی ہیں۔ اللہ آپ کی مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔

اضافۂ شکریہ

فضائل ..... اضافۂ شکریہ

مصائب ..... دربارِ شام

اضافہ شکریہ

چونکہ میں بوجہ اپنی بیماری اور کمزوری کے مختصر وقت میں پڑھتا ہوں۔ زیادہ لمبی تقریر اب مجھ سے نہیں ہوتی۔ کسی زمانے میں دو اڑھائی گھنٹے پڑھ کے مجھے پتہ بھی نہیں چلتا کہ پڑھا بھی ہے یا نہیں۔ اب دس پندرہ منٹ کے بعد تھک جاتا ہوں۔ تو اگر ایسا مضمون شروع کروں جو تھوڑے وقت میں پورا نہ ہو سکے تو پھر سامعین بھی بے لطف و بے حظ ہوتے ہیں اور مجھے بھی کوئی لطف نہیں آتا۔ اب میں کوشش کرتا ہوں اس بات کی کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جو تھوڑے وقت میں پوری ہو جائے۔

تو بزرگانِ من!

ایک بڑا پرانا مضمون تھا جو میں کبھی پڑھا کرتا تھا۔ ابھی جب میں یہاں آیا تو ذاکر صاحب پڑھ رہے تھے مجھے وہ بات یاد آ گئی ہے۔ وہی میں شروع کر رہا ہوں۔ وہ مضمون ایسا ہے اسے جہاں ختم کر دو وہیں ختم ہے۔ جہاں شروع کر دو وہیں شروع ہے۔ وہ اس طرح کا ہے، آپ میری بات غور سے سنیں اور میں آپ کو سناتا ہوں۔

اس مضمون کی جو میں شروع کر رہا ہوں جو تمہید ہے وہ شروع ہوتی ہے انسان سے، کہ انسان کے اندر پیدا کرنے والے نے کتنی طاقتیں، قوتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں۔ گویا اس چیز سے شروع ہوتا ہے یہ مضمون کہ انسان میں خود کتنی صلاحیتیں، کتنی طاقتیں اور کتنے کام کرنے کے جذبے، خود انسان کے اندر انسان کے خالق نے رکھے ہیں اور پڑھے لکھے حضرات میں یہاں ایک لفظ کہہ کے آگے بڑھتا ہوں کہ انسان کے اندر ودیعت کردہ صلاحیتیں اور طاقتیں جن کا انسان کو خود علم نہیں کہ مجھ میں کتنی طاقتیں ہیں؟ ان ساری

انسانی طاقتوں کے محل اور موقع کے مطابق عمل میں لانے کا نام اسلام ہے۔ سمجھے! اسلام، انسان کی کسی طاقت کو معطل نہیں کرتا بلکہ انسان کی طاقتوں کو صحیح طریقے سے استعمال میں لانے کا نام اسلام ہے۔ اسلام، طاقتوں کے تعطل کا نام نہیں۔ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر ہیں انہیں صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا نام ہے اسلام۔

گھبرا تو نہیں رہے؟

یہ ذرا خشک ہو گیا ہے نا مضمون! آپ گھبرائیں نہیں تو میرے محترم سامعین ایک بات اور بھی کرتا چلوں آپ سے۔ یہ علم لغت کی بات ہے۔ زبان کی۔ آپ نے میری پہلی بات سن لی ہے جو اب تک میں نے کہی ہے۔ انسان کے اندر بے شمار طاقتیں اور قوتیں انسان کے خالق نے ودیعت کر دی ہیں۔ اتنی طاقتیں ہیں انسان میں کہ انسان ان طاقتوں کو گن ہی نہیں سکتا اور ان تمام طاقتوں کو جو خالق نے انسان میں رکھی ہیں صحیح طور پر استعمال میں لانے کا نام اسلام ہے۔

توجہ فرمائیں نا آپ نے؟

کسی طاقت کو معطل کرنا اسلام نہیں۔ ان طاقتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا نام اسلام ہے۔ اسے، علم لغت کے کمال کو کہتے ہیں ملکہ۔ سنا ہے کہ فلاں شخص کو اس کام میں ملکہ حاصل ہے۔ ملک کے معنی یہ ہیں کہ پوری طاقت حاصل ہے۔ تو عربی زبان میں ملکہ کا لفظ طاقت کے عروج کو کہتے ہیں۔

خوب! میری بات پر غور کیا آپ نے؟

اسی ملکہ کو آپ مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا تو کل ملائک کو حکم دیا کہ اس کے تابع ہو جاؤ۔ تمام طاقتیں ان کے تابع ہو گئیں۔ صرف ایک نفس انسانی کی طاقت تھی جو، شیطان بن کے باغی ہو گئی۔

سمجھے نا حضور!

اور جو اس طاقت پر بھی غالب ہو جائے۔ اپنے نفس انسانی کی طاقت پر۔ باقی

طاقتوں پر غالب ہونے والا غالب کہلاتا ہے۔ اور جو اپنے نفس کی طاقت پر غالب ہو جائے وہ غالب علی کل غالب کہلاتا ہے۔ جو اپنے اوپر بھی غالب ہو جائے۔ بہر نوع تمام طاقتوں کا منبع و مرکز انسان۔ انسانی طاقتوں کو صحیح استعمال کرنا، یہ ہے اسلام۔

اس تمہید کے بعد میں رُخ بدل کر آپ سے آسان طریقے سے بات کروں۔ جہاں اور ہزاروں طاقتیں انسان میں ہیں وہاں یہ بھی ایک طاقت ہے انسان میں۔ وہ کسی حد پر جا کر رکنا پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی طاقت ہے کسی حد پر پہنچ کر بھی وہ رکنا پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی انسان میں ایک طاقت ہے۔

سمجھے نا حضور!

یہ نہ سمجھیں کہ انسان چاند پر جا کر رک جائے گا۔ وہاں سے کوشش کرے گا کہیں اور جانے کی۔ یہ کسی حد تک بھی رکنا پسند نہیں کرتا۔ کسی بھی حد تک جا کر نہ رکنا یہ بھی ایک طاقت ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔

توجہ ہے نا میرے محترم سامعین؟

مثال کے طور پر جو کبھی آپ کو سمجھایا کرتا تھا اور اب سمجھتا ہوں۔ ایک بچہ مجھے کہتا ہے زیدی صاحب! مجھے نوکر کرا دو۔ کتنی نوکری چاہیے بیٹا کہ یہی دس بیس پچاس روپے کی مل جائے گذارہ ہو جائے گا۔ آپ نے اسے سو روپے کی نوکری دلا دی۔ اس سے پوچھو بھئی بس۔ جی ہاں! آیا، سوا سو روپے ہو جائیں۔ اچھا اس کے ڈیڑھ سو روپے ہو گئے کہ بھئی بس کہ آنجناب دو سو روپے ہو جائیں۔ اس کی آپ نے ہزار روپے ماہوار کر دیے کہ بس؟ کہ آیا، دو ہزار کیا مجال جو کسی جگہ رکتا ہو انسان۔ یہ طاقت انسان میں ہے یا نہیں۔

بھئی یہ ہے سمجھ میں آ رہی ہے نا بات؟ شاباش

تو میرے محترم سامعین!

اپنے تم پچاس ہزار روپے ماہوار دے دو کہ بس کہ ابھی کچھ اور ہے؟ اسے آپ ایک ضلع دے دیں سالم کہ بس؟ ابھی اور کیا مجال جو اس کی ابھی اور ختم ہو جائے۔ بڑا اچھا

عنوان ہے تقریر کا۔ اگر ذہن میں رہا تو ابھی اور کی طاقت انسان میں موجود ہے۔ آپ، مجھ میں، سب میں یہ ہے۔ ایں، ایں، ابھی اور، کہیں بھی پہنچ کے ایں ایں ابھی اور۔ اکثر میں یہ کہا کرتا تھا اور اب بھی یہ کہتا ہوں کہ اس ابھی اور جذبے نے انسان کو بڑھا بڑھا کے خدا بنا دیا۔ انسان جو خدا بن گیا نا، یہ ابھی اور میں تھا، سردار بنا، ابھی اور بڑا سردار بنا، ابھی اور، بادشاہ بنا، ابھی اور، شہنشاہ بنا، ابھی اور، ملک آ گئے، ابھی اور، ایں ایں خدا بن گیا۔ اب خدا بن کے اس نے بس نہیں کی، یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا بنوں؟ کہ موت آ گئی۔ اگر موت نہ آتی تو یہ کچھ اور بنتا۔ یہ موت نے آ کر روک دیا۔ ورنہ خدا بن کے سوچ رہا تھا کہ ابھی وہ اور کیا بنے؟

آپ یقین فرمائیں۔

یہ خدا بننے والے پاگل نہیں تھے، احمق نہیں تھے۔ پتہ تھا انہیں کہ خدا نہیں ہیں۔ یہ ان میں، ابھی اور کا جذبہ تھا جو انہیں خدا بنوا رہا تھا۔ ورنہ وہ کوئی پاگل یا احمق تھوڑے تھے۔ جانتے تھے کہ ہم خدا نہیں ہیں۔ مگر اس ابھی اور، والے جذبے نے بنوا دیا اور ایک چیز نے اس کے سمندر نازک پر مہمیز کر دی کہ پاس بیٹھنے والے جو تھے، انہوں نے کہا کہ حضور بجا اس نے ان کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ چیزیں انسان کا دماغ خراب کرتی ہیں۔ ایک اسی کا جذبہ ابھی اور ایک پاس بیٹھنے والوں کا کہنا کہ حضور بالکل درست ہے۔ بجا ہے وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ گویا اب بے جا ہمارے پاس ہے ہی نہیں جو بک دیا وہ بجا ہے۔

یہ پاس بیٹھنے والے بنا دیتے تھے۔

بیچارے نمرود نے، بیچارے فرعون نے، ہزاروں دفعہ کہا کہ بابا ہم نہیں بنتے خدا، ہم خدا نہیں ہیں مگر پاس بیٹھنے والوں نے کہا کہ نہیں تمہیں بننا پڑے گا، بن گئے، بنا جو دیا۔ ان میں ''اور'' کا جذبہ تو تھا ہی۔ ان لوگوں نے بنا دیا، بن گئے، شروع شروع میں تو انکار کرتے تھے، پھر بن گئے۔ یہ انسان کا جذبہ ہے تو ہر انسان میں ''ابھی اور'' کا جذبہ موجود ہے۔ آپ میں ہے نا ''ابھی اور'' کا جذبہ؟ ہیں؟ ہے؟ آپ لوگوں میں ''ابھی اور'' کا

جذبہ ہے۔ یہ انسان کی عادت ہے جو کثرتِ استعمال سے فطرت بن جاتی ہے۔ یہ انسان کی فطرت نہیں عادت ہے۔ تو اس کی توجیہات علماء نے بہت کی ہیں کہ یہ انسان کی ابھی اور کی عادت کیوں ہے؟ تو اس میں ایک سیدھی سی بات میں آپ کو بتادوں انسان میں جو ہوس ہے ''ابھی اور'' کی اس ہوس کا مرکز ہے انسان کا دماغ۔ دل میں ہوس نہیں ہوتی، دماغ میں ہوس ہوتی ہے۔ دماغ انسان کا سر میں ہے اور انسان کا سر ہے پیالے کی شکل کا یہ پیالہ ہے الٹا۔

دیکھو نا! الٹ اپیالہ ہے یا نہیں؟ اور الٹے پیالے میں چاہے تم سمندر بھر دو یہ خالی رہے گا اس لیے ابھی اور چلاتا ہے۔ جب قبر میں جائے گا کیڑے کھائیں گے الٹا پیالہ خود سیدھا ہو جائے گا۔ تب اگر اور نہ کہے تو نہ کہے یہاں تو کہتا ہی رہے گا جب تک یہ پیالہ الٹا ہے۔ انسان کا جذبہ ابھی اور رہے گا اور یاد رکھو کہ کتنی جنگیں، جتنی لڑائیاں، جتنی مقدمہ بازیاں، جتنے فساد اور جھگڑے دنیا میں ہو رہے ہیں ان سب کا اگر آپ کھوج لگائیں تو نتیجہ یہی ''ابھی اور'' اور'' کا ہی نکلے گا۔ یہ سارا جذبہ بھی اور کا ہے جو انسان کو لڑائیوں، جھگڑوں، اور فساد پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ جذبہ ہے ابھی اور کا۔ اب میں دوسری طرف رُخ بدلتا ہوں اس بات کا۔

میرے محترم سامعین!

جس خدا نے ہمارے اندر ابھی اور کا جذبہ پیدا کیا ہے اور جس خدا نے ہمیں فتنہ و فساد سے منع کیا ہے۔ ایک طرف ابھی اور پیدا کر دیا۔ ایک طرف کہہ دیا خبردار فساد نہ کرنا۔ سمندر میں پھینک کے کہنا کہ دامن تر نہ ہو۔ یہ بتاؤ ہمارا سخت امتحان ہے کہ نہیں؟ ہم اسی خدا سے پوچھتے ہیں کہ ایسی کوئی تدبیر بتا کہ ہمارا ابھی اور کا جذبہ بھی پورا ہوتا رہے اور دنیا میں فساد بھی نہ ہو۔

سمجھ میں آ رہا ہے نا صاحبان کے!

اسے میں نے مختصر کیا ہے بات کو۔ اللہ نے کہا لو بتاتا ہوں میں تمہیں طریقہ۔ جس

سے تمہارا ابھی اور کا جذبہ بھی پورا ہوتا رہے اور فساد نہ ہو۔

آپ گھبرائے تو نہیں اس بات پہ؟ ہیں؟ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ دس بیس آدمی میری بات بڑی غور سے سن رہے ہیں۔ باقیوں کا مجھے پتہ نہیں۔ ابھی اور کا جذبہ بھی پورا ہوتا رہے اور دنیا میں فساد بھی نہ ہو۔ اس کا طریقہ اللہ نے یہ بتایا کہ سنو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اگر تمہیں میرے وعدے پر یقین ہو۔ پتہ نہیں اللہ کے وعدے پر لوگوں کو یقین ہے کہ نہیں یہ مجھے پتہ نہیں۔ کیوں بھئی آپ کو یقین ہے کہ نہیں؟ ہیں؟ اللہ کے وعدے پر یقین ہے؟ پتہ نہیں ہے کہ نہیں؟ آپ دل کی گہرائیوں میں سوچ کے جواب دیں۔ اللہ کے وعدے پر یقین ہے؟ ویسے ہی نہ کہہ دینا سچ مچ بتانا ہے نا یقین اللہ کے وعدے پر۔ یقین ہے تو وہ تم سے وعدہ کرتا ہے اللہ کہ اگر تم ابھی اور کا جذبہ بھی پورا کرنا چاہتے ہو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ایک نعمت کے ملنے پر شکر ادا کرو گے تو میں اللہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں اور اضافہ کروں گا۔ تمہارا جذبہ ابھی اور کا میرا ذمہ ہے اور چونکہ اضافہ میرے ذمہ ہے، میری عطا لامحدود ہے۔ تمہارا ابھی اور تھک جائے گا میری عطا نہیں تھکے گی۔ میرے ذمہ ڈالو اس بات کو میں تمہیں عطا کروں گا۔ تمہارا اور کا جذبہ بھی پورا کروں گا، نعمت کا شکر تم ادا کرو ابھی اور، میں تمہیں دیتا رہوں گا۔ توجہ ہے نا صاحبان!

قبلہ بڑے اختصار کے ساتھ چلنا پڑ رہا ہے۔ بات بھی ہو جائے، میں اور تھک بھی گیا ہوں۔ اب مثلاً ایک نعمت دی ہے۔ ہمیں، آنکھیں یہ ہاتھ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یہ لفظوں کے شکر سے اللہ مطمئن نہیں ہوتا۔ شکر کے معنی ہیں اس کی ہر دی ہوئی طاقت کو اسی طرح استعمال کرو جس طرح وہ چاہتا ہے۔ بس یہ ہے اس کا شکر۔ آنکھوں سے دیکھو، لازماً دیکھو، ضرور دیکھو، انہیں بند نہ کرنا۔ یہ بند کرنا تو کفرانِ نعمت ہے۔ آنکھیں بند کر کے کوئی بیٹھا رہے مگر وہاں دیکھو جہاں وہ چاہتا ہے۔ وہاں مت دیکھو جہاں وہ نہیں چاہتا۔ ابھی آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں اللہ کے وعدے پر یقین ہے۔ آپ اپنی آنکھوں سے وہ تو نہیں دیکھتے جہاں وہ چاہتا ہے کہ نہ دیکھو یہ کفرانِ نعمت ہو جائے گا۔

آپ کے شہر میں نہیں۔ توبہ توبہ یہ تو مسلمانوں کی بستی ہے۔ لاہور جیسے شہر میں جا کے دیکھیں قطاریں لگی ہوئی ہیں دیکھنے کے لیے۔ سڑک پر ٹریفک رُکی ہوئی ہے۔ قطاریں لگی ہوئی ہیں دیکھنے کے لیے۔ قطاریں کیوں لگی ہیں؟ کہ ہم نے ٹکٹ لینا ہے دیکھنے کے لیے۔ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جنت کا ٹکٹ بک رہا ہے، ٹوٹے پڑ رہے ہیں ایک دوسرے کے اوپر دیکھنے کے لیے۔ سارا دن کارخانوں میں مزدوری کی، پانچ روپے کما کے لائے۔ تین روپے کا ٹکٹ خرید لیا۔ ایک روپے کی سگریٹ پی لی۔ وہاں دیکھنے کے لیے۔ آٹھ آنے کا کچھ کھا لیا وہاں دیکھنے کے لیے۔ تین چار آنے لے کر گھر آ گئے۔ بیوی بچوں نے کھانے کے لیے مانگا، وہاں ہیں نہیں پیسے۔ وہ تو خرچ کر آئے تھے۔ صبح کو جلوس نکال لیا زندہ باد مردہ باد، برکت نہیں۔ ہائے او، کمیونسٹ ہو جاؤ، اللہ کو بھول جاؤ، برکت نہیں رہی، برکت کا رونا رونے والو! کبھی اپنی حرکت بھی دیکھی۔ کمائی کے پیسے تو وہاں ضائع کر آئے یہاں یہ کر لیا۔ اللہ نے کب منع کیا ہے دیکھنے کو؟ ضرور دیکھو مگر وہ دیکھو جو وہ چاہتا ہے۔ وہ مت دیکھو جو وہ نہیں چاہتا۔

بزرگانِ من! پیروں سے چلو، پیر چلنے کے لیے ہیں ضرور چلو۔ کون کہتا ہے کہ نہ چل، ادھر چلو جدھر وہ چلانا چاہتا ہے مگر تم پیروں سے پورا کام لو۔ دوڑو، بھاگو، بلندیوں پہ چڑھ جاؤ، پہاڑوں پہ چڑھ جاؤ۔ اگر ہماری مرضی کے خلاف ہو تو ہم کیا کریں۔ چلو ادھر جدھر ہم چلانا چاہتے ہیں۔

سمجھے! ہاتھوں سے ضرور کام لو۔ انہیں معطل نہ کرو۔ یہ خدا کی نعمت ہے۔ اسے باندھ کے رکھنا کفرانِ نعمت ہے۔ ان سے کام لو، ہاتھوں سے۔ یہ تمہارے کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اللہ نے تمہیں ہاتھ دیئے ہیں انہیں معطل نہ کرو۔ انہیں خراب نہ کرو۔ وہ کام کرو جو اللہ چاہتا ہے۔ ورنہ یہ زبان بڑی نامراد شے ہے۔

قبلہ، سمجھے! اس کی بڑی احتیاط رکھنا۔ سارے اعضاء میں سب سے زیادہ خطرناک شے ہے۔ زبان، اس لیے اللہ نے اسے حوالات میں بند رکھا ہے۔ دانتوں کا پہرا سامنے

کھڑا کیا۔ حضور ہونٹوں کے پھاٹک لگائے۔ دھن کے قفل میں بند کیا۔ کہیں بے موقع، گھر سے نہ نکل آئے ورنہ فساد ہوگا۔ لڑائی ہوگی جو گھر میں رہنے کے لیے ہے وہ گھر ہی میں رہے تو ٹھیک ہے۔ اللہ یہی چاہتا ہے۔ زبان کی پوری احتیاط رکھنا۔ ورنہ کیا فائدہ؟ فساد ہو گا خواہ مخواہ کے لیے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

ہمارے یوپی میں محاورہ تھا۔ ہمارے دیہات میں کہ آدمی کا سر اُٹھ کے صبح آدمی کی زبان سے کہتا ہے ہاتھ جوڑ کے کہ دیکھنا زبان تو تو بول بول کر اندر چلی جائے گی میری شامت آئے گی۔ ذرا خیال رکھنا۔ یہ بات حضور! یہ اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے زبان اسے ضرور استعمال کرو، ضرور بولو۔ مگر وہ بولو جو وہ چاہتا ہے، وہ مت بولو جو وہ نہیں چاہتا۔

سمجھے، تو اللہ کی نعمت کا شکر یہ ہے جو اس کے منشاء کے مطابق اس کی نعمتوں کو استعمال کرے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

یہ تو ہو گیا میرا وعظ اگر آپ گھبرائے نہیں تو اب میں اس کا پھر رُخ پھیروں تقریر کا اسے مختصر کرنا ہے ساری بات کو۔ یہ آیت جو ہے کہ شکر کرو گے تو نعمت میں اضافہ ہوگا۔ یہ کس پہ نازل ہوئی ہے؟ یہ آیت مجھ پہ، آپ پہ، ہم پہ، نازل ہوئی۔ ہیں، اللہ چاہتا تو ہم پر بھی کوئی آیت نازل کر دیتا؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ اللہ چاہے تو نہیں کر سکتا؟ اللہ ایسی بات چاہتا ہی نہیں جو نہ ہو۔ ہاں اللہ کیوں چاہے ایسی بات کو جو نہ ہو۔

تو یاد رکھو میرے بزرگو!

اللہ جیسا قادر مطلق جس کی قدرت میں کوئی شک نہیں ہم تک پہنچنے کے لیے رسول کو وسیلہ بناتا ہے۔ تو اللہ تک بے وسیلہ کیسے پہنچیں؟ جب اللہ ہم تک بے وسیلے کے نہیں پہنچا تو وسیلہ ہونا عیب کی بات نہیں۔ سمجھے، خیر یہ الگ موضوع ہو جائے گا۔ میں چھوڑتا ہوں۔

تو یہ آیت نازل ہوئی رسولؐ پر کہ تم شکر کرو گے تو میں اضافہ کروں گا۔ یہ بتاؤ اس

آیت کی تعمیل رسولؐ نے بھی کی یا نہیں۔ شکر کیا ہوگا انہوں نے۔ ہیں، اور شکر کر کے، اللہ نے اپنے حسب وعدہ اضافہ کر دیا۔ اللہ کا وعدہ ہے اب چاروں طرف نظر ڈالی۔ جتنی نعمتیں اللہ نے دیں تھیں رسول کو وہ پہلے ہی دن اتنی حد سے د ے دیں تھیں کہ ان میں اضافے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اب رسولؐ سوچیں کہ اس کا شکر کر کے اضافہ کس شے کا کروں؟ میرے پاس جو نعمتیں ہیں وہ پہلے ہی اس حد کی ہیں کہ ان میں اضافہ ہو سکتا ہی نہیں۔ بتاؤ بھئی! اللہ نے رسول کو سعادت دی تھی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی تھی۔ شرافت دی تھی اس سے بڑھ کر اور کیا شرافت ہو سکتی تھی؟ خلق دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی خلق ہو سکتا ہے؟ انسانیت دی تھی۔ اس سے بڑھ کر کوئی انسانیت ہو سکتی ہے؟ سب سے بڑی نعمت رسالت دی تھی۔ وہ پہلے ہی ایسی دی تھی کہ ختم کر بیٹھا اور ہے ہی نہ تھی اس کے پاس کس چیز کا شکریہ ادا کرے؟ جو اس میں اضافہ ہو جائے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

جہاں جہاں بیٹھے ہو صاحبانِ ذوق ایک نعمت تھی رسولؐ کے پاس ایسی کہ جس کا شکریہ ادا کر کے وہ اس میں اضافہ کر سکتے تھے۔ اضافہ بھی، طولی نہیں عرضی، ایک اضافہ عرضی ہوتا ہے، ایک طولی، طولی تو اضافہ ختم ہو چکا تھا۔ عرضی اضافہ اس میں کر سکتے تھے، وہ کیا تھی؟ وہ تھی نعمت عصمت۔

توجہ ہے نا صاحبان!

اللہ نے رسول کو معصوم بنایا تھا یا نہیں؟ نعمتِ عصمت۔ یہ عصمت جو ہے میرے بھائیو! یہ کلی مشکک ہے۔ کلی مشکک اسے کہتے ہیں جو ہر جگہ یکساں نہ ہو۔ اسے کہتے ہیں کلمہ مشکک جس طرح ہے لفظِ سفید تو بتاؤ میری اس کرتے کا کیا رنگ ہے؟ سفید اور یہ جو کرتا پہنے ہوئے ہیں اس کا کیا رنگ ہے؟ سفید، کیا دونوں کا رنگ یکساں ہے؟ حالانکہ دونوں سفید ہیں اور یہ رنگ کیا ہے؟ سفید حالانکہ یہ سب سفید ہیں۔ مگر کہیں زیادہ ہے کہیں کم بولیں گے سب کو سفید۔ اسی طرح عصمت ہے۔ سب معصوم ہیں کہیں زیادہ ہیں، کہیں کم

ہیں۔ آدمؑ کی عصمت اور ہے، عیسیٰؑ کی عصمت اور ہے اور محمدؐ کی عصمت اور ہے۔ آپ آدمؑ کی عصمت کا قیاس محمدؐ کی عصمت پر نہ کریں۔ وہاں ترکِ اولیٰ کی گنجائش ہے یہاں نہیں ہے۔ اسے اُردو زبان میں یوں ادا کرو کہ انبیاءؑ کی عصمت میں اور چودہ معصومینؑ کی عصمت میں یہ فرق ہے کہ انبیاءؑ وہی کام کرتے ہیں جو ٹھیک ہو۔ غلط کام کرتے ہی نہیں، وہی کرتے ہیں جو ٹھیک ہو۔ پہلے وہ تلاش کرتے ہیں ٹھیک، پھر کرتے ہیں اور چودہ معصومینؑ جو کر دیں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بس یہ فرق ہے ان کی عصت میں۔

سمجھے حضور! پہلے ٹھیک تلاش کرتے ہیں اور یہ جو کر دیں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ جو کہہ دیں وہ ٹھیک ہے جو کر دیں وہ ٹھیک ہے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

عصمت اللہ نے دی تھی رسولؐ کو اس عصمت کا شکریہ ادا کرنا تھا۔

پوری توجہ صاحبان!

شکریہ زبان سے نہیں کیا، اللہ تیرا شکر ہے۔ شکر کے معنی میں نے ابھی بتائے ہیں اس طرح برتو، جس طرح چاہتا ہے، تو رسولؐ نے عصمت کو اس شان سے برتا کہ دشمن بھی مان گیا کہ صادق ہے، امین ہے۔ یہ عصمت کی نعمت کو برتنا تھا۔ اسی صداقت اور امانت کے مجموعے کو عصمت کہتے ہیں اور کیا ہے؟ افعال میں عصمت ہو تو امین ہے۔ دل میں عصمت ہو تو صادق ہے، قول و فعل کی عصمت کو صداقت و امانت کہتے ہیں۔ گویا دنیا مان گئی کہ معصوم ہے۔ ابھی رسول نہیں کہا تھا۔ یہ نعمتِ عصمت کا استعمال تھا یا نہیں تھا؟

توجہ ہے نا صاحبان!

بات کو نہ بڑھاؤں، مختصر رکھوں، دیر نہ ہو جائے۔ چالیس سال مسلسل نعمتِ عصمت کا اس انداز سے شکریہ ادا کیا کہ کائنات مان گئی وہ دشمن ان گئے کہ صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔ اتنا شکریہ جس نے ادا کیا ہو عصمت کا، اللہ کو حسبِ وعدہ اس میں اضافہ کرنا چاہیے یا نہیں، عصمت میں۔ اب رسولؐ کی عصمت اتنی ہے طولاً تو اس میں اضافہ نہیں ہو

سکتا۔ عرضاً ہوسکتا۔ اللہ نے کہا سن محمدؐ میں اپنے اضافے کے وعدے کو پورا کر دیتا ہوں۔ اس طرح تو اپنی عصمت کا شکریہ ادا کر۔ میں اس شکریے میں اضافہ کے طور پر تجھے ایک اور عصمت عطا کرتا ہوں جس کا نام ہے فاطمہؑ گویا سیدہ فاطمہؑ بیٹی جو رسول کو ملی ہے شکریہ عصمت کے اضافے میں ملی ہے اور بیٹیوں کی بات اور ہے۔ اس بیٹی کی بات اور ہے۔ اگر رسولؐ کے تھیں بھی اور بیٹیاں، اس جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ وہ تھیں یا نہیں تھیں۔ کوئی کہتا ہے چار تھیں، میں کہتا ہوں چار سو ہوں۔ چلو، جھگڑے کی کیا بات ہے؟ مگر شکریہ عصمت کے اضافے میں جو بیٹی ملی اس کا نام ہے فاطمہؑ۔ یہ رسول کو شکریہ عصمت کے اضافہ ہو کر ملی ہے، لہٰذا اس کی عصمت کی شان اور ہے، محمدؐ کی عصمت کی شان اور ہے۔ آپ کہیں گے کہ عورتوں میں مریم بھی معصومہ تھیں وہ تو تھیں مگر ان کی عصمت کسی شکریہ میں نہیں ملی تھی اس کو۔ عطیہ الٰہی تھا۔ اس میں عصمت کی اتنی ہی مقدار تھی کہ بس ایک پشت چل کے عیسیٰ تک ختم ہوگئی۔ یہ شکریہ عصمت میں ملی ہوئی عصمت تھی جو سیدہؑ کی شکل میں ملی تھی۔

توجہ ہے نا صاحبان!

اور یہ شرف اللہ نے اس شکریہ عصمت کو عطا فرمایا تھا کہ قیامت تک اس کی پیدا ہونے والی نسل معصوم تو نہیں ہوگی مگر بے حکومت کے شاہ کہلائے گی ہے یا نہیں حضور والا! کہلاتی ہے کہ نہیں کہلاتی؟ بغیر سرداری کے سید کہلائے گی۔ دنیا ان کے پیر چھونے میں فخر محسوس کرے گی۔ یہ اس لیے کہ شکریہ عصمت کا صلہ ہے۔

حضور والا! اگر پیسے پاس ہوں گے تو امیر کہلائیں گے، کچھ نہیں ہوگا تو پہنچے ہوئے فقیر کہلائیں گے۔ مر جائیں گے تو پیر کہلائیں گے۔ یہ شرف یاد ہے شکریہ عصمت کا تو سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا عصمت کے شکریہ کے طور پر ملی ہے۔

میرے محترم سامعین!

اب رسولؐ چاہتا ہے کہ اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کرے، تاکہ اللہ اور اضافہ

فرمائے۔ اب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی عصمت کا کس طرح شکریہ ادا کیا اس نے؟ بڑے اختصار کے ساتھ بات کرتا ہوں۔ بیٹی چلی آ رہی ہے۔ اگر تری بیٹی ہوتی تو بیٹھے رہتے، چونکہ اضافہ شکر تھا لہٰذا اس کے لیے شکریہ یوں ادا کیا کہ بیٹی کی تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تعظیم کو اُٹھنا اس نعمت کا شکریہ تھا۔ اللہ نے دیکھا تم نے اس نعمت کا شکریہ ادا کیا۔ لاؤ ہم نعمت کا اور اضافہ کر دیں۔ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی تعظیم کے لیے اُٹھے۔ اللہ نے ایک نعمت حسنؑ کی شکل میں دے دی۔ لو، یہ شکریہ نعمت کا صلہ ہے جو ہم تمہیں ادا کرتے ہیں۔

توجہ ہے نا صاحبان!

اب یہ فاطمہ سلام اللہ علیہا والے شکریہ میں اضافہ ہو کر حسنؑ والی نعمت ملی۔

پوری توجہ صاحبان!

رسولؐ نے کہا: لاؤ اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کروں گا۔ اس کا شکریہ کس طرح ادا کیا۔ نماز پڑھانے جا رہے تھے عید کی۔ حسنؑ جو نعمت کا شکریہ ملا تھا اسے بٹھا رکھا تھا کندھے پر۔ زلفیں اسے پکڑا رکھیں تھیں۔ لو بیٹا، چلو! یہ ہے شکریہ نعمت حسنؑ جو مجمع عام میں رسولؐ ادا کر رہے تھے اللہ کو یہ ادا پسند آ گئی۔ محمدؐ تو نے حسنؑ کی نعمت کا شکریہ خوب ادا کیا۔ ہم اضافہ کر کے تمہیں حسینؑ دے دیں۔ اللہ نے اضافہ کر کے حسینؑ دے دیا۔ حسینؑ جو نعمت ملی کہ اس کا بھی شکریہ ادا کروں گا۔ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا شکریہ محض تعظیم کر کے۔ حسنؑ کی نعمت کا شکریہ یہ تھا کہ نماز کو جاتے وقت کندھوں پر بٹھا لیا۔ نماز کو جاتے ہوئے نماز میں نہیں، نماز کو جاتے ہوئے حسینؑ نامی نعمت ملی تو شکریے کا انداز بڑھ گیا۔ اسے جاتے ہوئے نہیں۔ عین نماز میں۔

سمجھے! سجدہ میں یہ شکریہ ادا ہو رہا تھا اور فقرہ میں کہتا ہوں صاحبانِ ذوق! یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے۔ حسینؑ کی نعمت کا جو شکریہ ادا کیا وہ عین نماز میں۔ نماز میں بھی رکوع میں نہیں، قیام میں نہیں، سجدے میں پشت پر بٹھا لیا حسینؑ کو۔ یہ حسینؑ نامی نعمت کا شکریہ تھا؟؟؟ شکر ادا ہوا؟ سجدہ میں، کہاں، عبادت میں، چونکہ اس شکریہ میں عبادت اور سجدہ

دونوں شامل ہیں۔ اب جو اضافہ بھی ہوگا اس میں سجدہ بھی ہوگا اور عبادت بھی ہوگی لہٰذا حسینیؑ نعمت کے شکریے میں جو ملا وہ سید الساجدینؑ بھی تھا اور زین العابدینؑ بھی۔ یہ شکریہ نعمت میں مل رہا تھا۔

وہ سید الساجدینؑ تھا اور زین العابدینؑ بھی تھا۔ اللہ نے شکریہ نعمت میں عطا کیا تھا۔ اب جب یہ نعمت مل گئی سید الساجدینؑ، زین العابدینؑ، والی تو رسولؐ نے کہا: لاؤ وہ بھی شکریہ ادا کر دیں۔ اس کا شکریہ ادا کیا تو اللہ نے کہا محمدؐ سنتے بھی ہو اس شکریہ میں ہم تمہیں محمد ہی نہ دے دیں؟ محمدؐ کے شکریے میں محمدؐ ہی مل گیا جس کو آپ محمد باقرؑ کہتے ہیں۔

سمجھے! حضور اس نے کہا: یا اللہ تیرا شکر۔ اس نے کہا: اچھا یہ لسانِ صدق سے شکریہ ہے نا؟ تمہیں صادق نہ دیدیں؟ اللہ نے جعفر صادقؑ دیا۔ شکریے ملتے جا رہے ہیں۔ رسولؐ کا شکر چلتا رہا اور اللہ کا اضافہ چلتا رہا۔ چلتے چلتے جب گیارہویں پر پہنچے۔ اب تو اللہ کو اپنے خزانے کا جائزہ لینا پڑا یہ تو شکر ختم ہی نہیں ہوتا۔ یہ تو مجھے اضافہ کرنا پڑے گا۔ کہا سنتے بھی ہو محمدؐ اب بالقطع طے کر لو، بار بار نہیں۔ گیارہویں تک تو ہم دیتے رہے آج سے بالقطع سودا کر لو کہ کیا؟ تمہارا شکریہ دائم رہے۔ آج یہ چیز ہو جائے، ہمارا عطیہ قائم ہو، اور تمہارا شکریہ دائم ہو۔ جاؤ ہم تمہیں یہ چیز عطا کرتے ہیں۔

توجہ ہے نا صاحبان!

بہت اچھا یا اللہ! دے دے۔ اب ایسا عطیہ دوں گا، قیامت تک قائم رہے گا۔

سمجھے نا حضور!

میرے محترم سامعین!

میں شورکوٹ پھر کبھی آؤں گا یا نہیں۔ ویسے ہی زندگی کا بھروسہ نہیں اور ہم تو اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں بھروسہ رہا ہی نہیں، لہٰذا کیوں نہ چلتے وقت آپ کو کہتا جاؤں کہ خدا کا شکر ادا کرو۔ اللہ کا احسان مانو، مانو گے؟ کہ خدا نے تمہیں قائمؑ جیسا امامؑ دیا۔ ماشاء اللہ! چشم بدور، مؤمنیں خدا تمہیں مبارک کرے کہ تم بے امام نہیں ہو۔ اللہ نے تمہیں امامؑ

عطا کیا ہے۔ تمہارا امامؑ قائم جیسا ہے، ہے نا؟ اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ محمدؐ اللہ کا رسولؐ ہے۔ تھا تو نہیں اور بارہویں امامؑ؟ امامؑ ہے۔ تھا، تو نہیں۔ ہمارا امامؑ ہے۔ خدا ہے، رسولؐ ہے، ہمارا امامؑ ہے۔ اس لیے ہمارا وجود ہے۔ دنیا نے ہمیں ''تھا'' کرنے کی کوشش کی مگر نہیں، ہم ہیں۔ اور ہیں اس لیے کہ ہمارا وارث ہے، ہمارا امامؑ ہے۔ یہ شعبان کا مہینہ ہے حضور۔ اور شعبان کی مناسبت سے یہ دو چار جملے آپ سے کہہ دوں کہ خدا کے فضل سے ہمارا امامؑ ہے، بولو! ہے؟ اسی امامؑ کے ہونے کی وجہ سے ہم دنیا کے سامنے سینہ تان کے کہتے ہیں کہ دنیا والو! کیا یاد کرو گے ہم ہیں امامیہ اور کوئی فرقہ امامیہ نہیں۔ ہم ہیں امامیہ،

سمجھے! امامیہ؟ کے کیا معنی؟ امام والا، جیسے لاہوریا، امامیہ، امام والا، سمجھے! ہم ہیں امامیہ اور دنیا میں کوئی امامیہ نہیں۔ ہم ہیں امامیہ وجہ اس کی یہ ہے کہ امام تو کوئی انسان نہیں دنیا کا۔ کسی سے آپ پوچھیں کہ بھئی مسلمان! بتانا تیرا امام کون ہے؟ وہ بڑے ادب سے کہنے لگا ماشاء اللہ! چشم بدور۔ میرے امام فلاں بزرگ رحمۃ اللہ علیہ تھے، سمجھے؟ کہ بھائی تمہارے امام کون تھے؟ کہ میرے امام فلاں بزرگ رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ ہم ہیں کہ سینہ تان کر کہتے ہیں کہ کوئی ہم سے پوچھے کے دیکھیئے۔ ہمارا امامؑ ہے، دنیا کے امام تھے، ہمارا امامؑ ہے، اس لیے ہم امامیہ ہیں۔ دنیا کے لیے امامیہ نہیں کہ ان کے امام تھے۔ ہمارا امامؑ ہے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

اور یہ شکریہ نعمت رسولؐ مین ملا ہوا ہے۔ اس نے کبھی ختم نہیں ہونا۔ ہمارا امامؑ خداوند قدوس کے فضل وکرم سے ہے۔ ہمارا امامؑ ہے، موجود ہے، کہاں ہے؟

غائب، ویسے ہر جگہ ہے۔ غائب ہے، اس کی غیبت کا فقرہ سن لو اور پھر میں بیٹھ جاؤں، قبلہ! حضور امام علی نقی علیہ السلام ہمارے دسویں امامؑ کی خدمت میں کسی نے عرض کیا کہ حضور وہ امام جو آخری امامؑ ہوگا جو دائم وقائم ہوگا، ذرا اس کی صفت تو بیان کریں کہ

کس شان کا ہوگا؟ اب جناب لطافت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جنہیں ان لطافتوں کا لطف ہے۔ بیان کرنے والی وہ معصوم کی زبان، امامؑ بیان کرنے والا ہو، امامؑ کی فضیلت ہو، پھر اس کے اندر کتنی لطافتیں ہوں گی یہ وہی جانتے ہیں۔ ہم تو اس کا اُردو ترجمہ بھی نہیں کر سکتے صحیح۔ امام علی نقی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ہمارے امامؑ کے متعلق کہ کیا پوچھتے ہو اپنے امام کی شان؟

صاحب الدعوۃ النبویہ

تمہارا امام اسی طرح کی دعوت دیتا ہے جس طرح اس کا جد رسولؐ دعوت دیتا ہے جس طرح اس کا جد رسولؐ دعوت دیتا تھا۔

وصولت الحیدریہ

''اس کا اقبال حیدر کرارؑ جیسا ہے۔''

وعصمت الفاطمیہ

''اس کی عصمت فاطمہ کبریٰ سلام اللہ علیہا جیسی ہے۔''

وحلم الحسنیہ

''حسنؑ جیسا اس کا حلم ہے۔''

شجاعت الحسینیہ

''اور حسینؑ جیسی شجاعت کا مالک ہے۔''

اور چلتے چلتے آپ صفت بیان کرتے کرتے گیارہویں تک پہنچے۔

والھیبۃ العسکریہ

''حسن عسکریؑ جیسی اس کی ہیبت ہے۔''

یہاں آ کے آپؑ نے رک کے فرمایا: تم اس کی غیبت پوچھتے ہو:

والغیبۃ الالھیہ

''اللہ جیسی اس کی غیبت ہے۔''

اللہ کسی جزیرے یا غار میں غائب ہے۔ اللہ کسی مکان میں غائب ہے۔ اللہ ہر جگہ ہے، اس مجلس میں موجود ہے، بولو ہے؟ اور یہ مجلسیں کیوں کرتے ہو؟ یہ جلسے کیوں کرتے ہو؟ یہ اتنا خرچ کیوں کرتے ہو؟ مولوی صاحبان کی اتنی خوشامدیں کیوں کرتے ہو؟ پڑھنے والوں کی اتنی خوشامدیں کیوں کرتے ہو؟ تمہاری کیا غرض وابستہ ہے ان سے؟ تمہارا کیا کام وابستہ ہے ان سے؟ ہے یا نہیں؟ محض اس لیے کہ تمہیں یقین ہے کہ ہمارا امامؑ ہم سے راضی ہو جائے۔ ہم یہ تصور کر کے بیٹھے ہیں مجلس میں کہ ہمارا امامؑ یہاں بیٹھا ہے اور ہم سب اس کی رعایا اس کے سامنے حاضر ہیں کہ مولاؑ تیرے سامنے تیرا دربار لگوانے کے لیے تیری رعایا نے سب کچھ خرچ کیا ہے، لوگوں کو بلایا ہے، مولویوں کی خوشامد کی ہے، تیرا ذکر سننے کے لیے۔ ہم تجھے تیرے بزرگوں کا پرسہ دیتے ہیں اور تیرے سامنے بزرگوں کے فضائل بیان کرتے ہیں۔

اصل سامع مجلس وہی ہے۔ اسی تصور کی وجہ سے میں نے عمر بھر کبھی بیٹھ کے نہیں پڑھا۔ میرا ایمان ہے کہ میرا مولاؑ موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں کبھی کرسی پر بیٹھ جاؤں یہ بڑی گستاخی ہوگی۔ یہ اس کی شان کے خلاف ہے حضور! اس لیے کبھی بیٹھ کے نہ پڑھا میں نے آج تک۔ اب تو اس قابل ہو گیا ہوں کہ مولاؑ بیمار ہوا تو کیا پہلے دونوں پاؤں سے کھڑا ہو کے پڑھتا تھا، تو اسے قبول فرما۔ ہمارا مولا موجود ہے۔

لو بھائیو! گفتگو ختم ہوئی۔ گرمی کا وقت ہے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا کربلائے معلیٰ میں مجلس تھی۔ ایک عالم بیان کر رہے تھے اور وہ کہتے تھے کہ جب تم مجلس منعقد کرتے ہو اس میں امام زمانؑ آ کے بیٹھتے ہیں۔ تو تم یہ تصور کر کے پڑھا کرو کہ تم امامؑ کو سنا رہے ہو اور اس کے طفیل میں یہ مجمع بھی سن رہا ہے۔ اصل میں امامؑ کو سنا رہے ہو تو انہوں نے فرمایا کہ جب تم امامؑ کے سامنے مصائب پڑھو، بے شک حسینؑ کی شہادت پڑھ دینا پروا نہیں۔ علی اصغرؑ کی شہادت پڑھ دینا کوئی بات نہیں۔ عباسؑ کی شہادت پڑھ دینا کوئی بات نہیں۔ امامؑ ان باتوں کو سن لیتے ہیں، مگر ایک بات کا احتیاط کرنا ہے۔ کیونکہ امامؑ

موجود ہوتے ہیں کہ ذرا سوچ سمجھ کے پڑھنا۔ وہ چیزیں ایسی ہیں جسے سن کے امامؑ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

ہاں امامؑ بے ہوش ہو جاتے ہیں، پھر فرشتے آ کے ان کے پاؤں ملتے ہیں۔ ان کی دادی آ کے ان کے سر کو گود میں لیتی ہے، پھر انہیں غش سے افاقہ ہوتا ہے۔ کیا؟ اس کے سامنے زینب سلام اللہ علیہا کی قید نہ پڑھنا، کیونکہ اس کے لیے نا قابل برداشت ہے۔ وہ ہر شہادت کو سن لیتا ہے۔ زینب سلام اللہ علیہا کی قید برداشت نہیں کرتا۔ یہ چیز اس کے لیے قابل برداشت نہیں ہے۔ یہ چیز ذرا سنبھل کے پڑھنا۔ یہ چیز ذرا سوچ سمجھ کے پڑھنا۔ یہ شے وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے ذرا سوچ کے پڑھنا۔ زینب سلام اللہ علیہا کی قید بڑی مشکل شے ہے۔ اسے ذرا خوب سنبھل کے پڑھنا۔ اسے پڑھتے وقت اس کو، مولوی کو بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ امامؑ سن رہے ہیں۔ زینب سلام اللہ علیہا کی قید پڑھنی ہے۔ امامؑ سن رہے ہیں۔

میرے محترم بھائیو!

امامؑ نے ہمیں بتایا ہے، ہمیں تو پتہ نہیں تھا۔ امامؑ کے دو جملے کہہ کے میں بیٹھتا ہوں۔ امامؑ نے بتایا ہے ہمیں۔ ہمیں کیا خبر تھی؟ ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے ایسا کون ظالم بے حیا ہو گیا دنیا میں جو سیدانیوںؑ کے ہاتھ باندھ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شاہ صاحب میں خود قید ہوا تھا۔ میں اپنی بیتی بتاتا ہوں۔ رات کے دو بجے تھے۔ ۲۹ جنوری سردی کی رات تھی۔ تقریباً پانچ سو آدمی پولیس کا مجھے گرفتار کرنے آیا۔ پانچ سو آدمی، سارے محلے کا محاصرہ تھا۔ چھتوں پر پولیس تھی، ایک ہنگامہ تھا۔ سارا محلہ سہما ہوا تھا۔ خدا جانے کیا ہوتا ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا قصہ ہے؟ جب گرفتار کیا انہوں نے مجھے تو کار میں بٹھایا مجھے تو کسی سپاہی نے ایس، پی سے کہا جناب ہتھکڑی لگا لوں۔ تو اس نے کہا خبردار بکواس بند کرو کیوں شریف آدمی کو پریشان کر رہے ہو؟ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں نے ایس پی صاحب کاش تم کربلا میں کھڑے ہوتے۔ بجائے یہاں کے وہاں کہہ دیتے کیوں شریف آدمیوں کو

پریشان کرتے ہو۔ میرے ساتھ یہ ہوا اور جس دن میں گرفتار ہوا تھا بھائی یہ بھی میں آپ کو بتادوں۔ وہ تاریخ وہ تھی جس تاریخ کو ہارون کی فوج نے محاصرہ کر کے امام موسیٰ کاظمؑ کو گرفتار کیا تھا۔ بالکل وہی تاریخ۔ جس دن گرفتار کیا تھا۔

بہرنوع! چلے گئے۔ سیدانیوںؑ کے ہاتھ بندھ گئے۔ مجھے یہ خیال رہا، فکر لگا کہ ہاتھ بندھ گئے کہ ہاں بے ضرر سیدانیوںؑ کو ہمارے ذاکر، مولوی، ہم سب پوچھتے رہے کہ ہاتھ پتہ نہیں کس طرح بندھے تھے۔ پتہ نہیں بازو بندھے تھے، ہے نا ؎

شامیاں بستند بازو زینبؑ وکلثومؑ را

پتہ نہیں ہاتھ کس طرح بندھے تھے؟ یہ امامؑ نے مرثیہ فرمایا ہے۔ امامؑ کا فرمان ہے یہ۔ کسی ذاکر کی بات نہیں کہ روایت غلط ہے۔ یہ امامؑ نے فرمایا ہے کہ میرا سلام ہو میری دادی زینب سلام اللہ علیہا پر۔ تم سب بھی سلام کرلو۔ ہم سب کا مولاؑ تیری دادی زینب سلام اللہ علیہا کو سلام۔ ان کا فقرہ ہے یہ ہمارا نہیں۔ میرا سلام ہو میری دادی زینب سلام اللہ علیہا پر جس کے دونوں ہاتھ جس کی گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ کربلا میں ہاتھ بند گئے اور جب دمشق کے شہر میں پہنچے ہیں (زائروں کو تمام زائر جو جاتے ہیں وہ تقریباً کربلا کے ساتھ شام بھی جاتے ہیں)۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں جو حرفِ کربلا کی زیارت کر کے چلا آئے اس کی زیارت قبول ہی نہیں ہوتی جو زینب سلام اللہ علیہا کے سلام کو نہ جائے۔

اب تو جاتے ہیں زائر وہاں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جاتے ہیں بی بی سلام اللہ علیہا کے سلام کے لیے۔ حضور جو شہر ہے نا دمشق کا، اس زمانے میں نہیں تھا۔ اس زمانے میں تو پرانا تھا۔ جو اب بھی اندر ہے، باہر تو نیا شہر ہے۔ اندر کی طرف وہ پرانا شہر اب بھی ہے۔ اس زمانے کا شہر تھا جس میں بی بی سلام اللہ علیہا گئی تھی اور یہ فقرہ بی بی کا آپ سے کہہ دوں؟ ساداتِ عظام مجھے معاف کرنا، مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے۔ بخاری گلیاں سڑکیں ملا کے تقریباً ڈھائی میل بن جاتا ہے۔ اس میں بی بی سلام اللہ علیہاؑ گردن سے ہاتھ باندھے ہوئے پیدل گئیں۔ یہ مجھے کہنا پڑتا ہے ورنہ اس وقت بی بی کے ہاتھ گردن سے

بندھے ہوئے تھے اور جب بی بی سلام اللہ علیہا کو طاغوتی طاقت کے سامنے پیش کیا گیا تو ہاتھ بندھے تھے اور شام کے زائروں نے دیکھی ہوگی وہ جگہ جہاں جا کے یہ سادات کھڑے کر دیئے گئے۔ وہاں ایک لکڑی کا چبوترا سا بنا دیا گیا ہے۔ یہ جگہ تھی جہاں کھڑے ہوئے تھے آ کے۔ جگہ محفوظ رکھی گئی ہے جہاں وہ کھڑے تھے اور سامنے طشت پر بھائی کا سر رکھا تھا اور یہاں وہ کھڑی تھیں اور گردن سے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

بھئی سن رہے ہو؟ خدا تمہاری عزت کی حفاظت کرے۔ جو فقرہ میں نے کہنا تھا وہ یہ تھا، ہائے کیا بتاؤں کھڑے تھے اس طرح کوئی مصیبت تھی ایسی جو اُن پہ نہ گذر گئی؟ امام موسیٰ کاظمؑ کا فرمان ہے کہ ''میری دادی زینب سلام اللہ علیہا پر وہ مصائب گذر گئے جو نہ کوئی سوچ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے، انہی کو پتہ تھا جن پہ گذر گئی۔ نہ کوئی دماغ انہیں دماغ میں لا سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا:

''کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو ان پہ نہ گزری ہو اور یزید کے دربار میں کھڑی تھیں۔''

یہ فقرہ میں نے کہنا تھا آخری اب اور میرے عزیزو! ڈھائی تین گھنٹے گذر گئے کھڑے کھڑے اور یزید اتنا مشغول ہے اپنے نشہ فتح میں۔ قیدیوں سے بات نہیں کرتا اور یہ کھڑے تھے۔ چھوٹی بچیوں کے پاؤں میں ورم آ گئے۔ پیدل چل چل کے آنا اور کھڑے رہنا اور زمانے کا امامؑ بالکل خاموش کھڑا ہے۔ بی بی سلام اللہ علیہا خاموش کھڑی ہیں اور گردن سے سید انیوںؑ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ سب کھڑے ہیں جہاں جناب ربابؑ جو ساتھ کھڑی تھیں وہاں امام حسنؑ کی بیوہ جناب قاسمؑ کی ماں ساتھ کھڑی تھیں۔ صرف فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کی یہ دو بہوئیں تھیں قید میں۔ ایک علی اصغرؑ کی والدہ (اُمّ رباب) اور ایک قاسمؑ کی والدہ (ام فروہ) جناب ام لیلیٰ جو تھیں جناب علی اکبرؑ کی والدہ ان کا راستہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شام تک پہنچی نہیں تھیں۔ یہ دو بہوئیں تھیں۔ انہوں نے

بالکل سر نہ اُٹھائے اور بی بی سلام اللہ علیہا نے امام زین العابدینؑ سے کہا تھا دربار میں آ کے:

''بیٹا! مجھ کو کھا گئی یہ بات کہ میری بھاوجیں کھڑی تھیں اور ان کے پیکے کے لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ کیا کہتی ہوں گی کہ کس خاندان میں بیاہی گئی ہیں ہماری لڑکیاں۔ مجھے شرم کھا رہی تھی یہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔''

تو اس وقت یزید (لعنت اللہ علیہ) نے ڈھائی تین گھنٹے کے بعد ٹوکا ہے انہیں اور کہا کہ ان قیدیوں کے نام بتاؤ کہ یہ کون کون ہیں؟ کیا ہیں؟ یہ چیزیں غور کرنے کی ہیں قبلہ! انہیں دنیا کے لوگوں کو بتاؤ، انہیں عام کرو اور پڑھے لکھے حضرات کو بتاؤ کہ دنیا کی ہر تکلیف اور مصیبت اُٹھائے ہوئے کہتی کیا ہے اس وقت؟ فقرہ کیا ان کی زبان سے نکلا ہے۔ یہی تو میں کہتا ہوں: یا اللہ! یاد رکھ تیری قدرت نے تو ہے ہی بے انتہا پر ایسے بندے بھی نہیں ہوں گے یہ کمال بھی نہیں ہوگا۔ کہتی کیا ہیں؟:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَکْرَمَنَا

''ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں یہ عزت عطا کی۔''

قبلہ کوئی اور ہوتا تو کہتا کہ واہ اللہ میاں ہم کس طرح تیرا شکر ادا کریں۔ تیرے نام پر ہم مر گئے اور تو نے ہماری خبر نہ لی۔ وہاں یہ کہہ کہ ہم شکر ادا کرتے ہیں کہ خدا نے ہمیں یہ عزت دی۔ بی بی سلام اللہ علیہا نے منوا دیا کہ خدا ہے، خدا کوئی ہے، یہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا احسان ہے کہ آج دنیا خدا کو مان رہی ہے۔ ان حالات میں منوایا کہ خدا ہے اور اگر یہ خدا کا وعدہ ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں اضافہ کروں گا۔ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے اس شکر پر مجھے نہیں معلوم کہ کیا اضافہ ہوگا۔

خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جس نے مجھے یہ عزت عطا فرمائی۔ جس نے ہمیں یہ شرف عطا فرمایا۔ جس نے ہمیں یہ شان عطا فرمائی۔ ہاتھ بندھا ہوا ہے، ظالم سے دربار میں ایک خاتونؑ یہ کہہ رہی ہے کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں یہ عزت عطا فرمائی کہ ہم اس کے دین کے محافظ ہیں۔ اس کی حفاظت میں یہاں قید ہوئے کھڑے ہیں اور ہم خدا کا شکر ادا کرتے

ہیں۔ جو مؤمنین یہاں موجود ہیں یا اللہ ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں ان شکر گذاروں کے حق کا شناسا بنایا۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی معرفت ہمیں دی۔ ان کا ذکر کرنے اور ان کی مجالس برپا کرنے کی توفیق ہمیں عطا فرمائی۔

بس بھائیو! اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ میرا بیان ختم۔ زندگی رہی تو ان شاء اللہ پھر کبھی۔ اللھم صلی علی محمد و آل محمد

شورکوٹ

۸، اکتوبر ۱۹۷۱ء

شہادت

شہزادہ قاسم ابنِ حسنؑ

شہزادہ قاسم ابنِ حسن علیہ السلام

کربلا کے عظیم سانحہ نے انسانیت میں انقلاب برپا کیا۔ جس کی نظیر نسلِ آدمؑ میں ملنا ناممکن ہے۔ آدمؑ سے لے کر آج تک پوری انسانی نسل کسی نہ کسی شکل میں موت سے ڈرتی رہی۔ دنیا بھر کے فلاسفر، حکما، اہل الرائے، یہاں تک کہ انبیاء اور اولیاء تک تلخی موت کے شاکی رہے لیکن کربلا کے نوجوانوں نے موت کا ذائقہ بدل دیا۔

اس کی تلخی کو شیریں بنا دیا اور ڈراؤنی موت کو پرکشش اور محبوب بنا دیا، یہاں تک کہ کمسن بچے جہاد کے لیے اس طرح سے بے چین ہو کر نکلے کہ جس طرح کھیل کے میدان میں جا رہے ہوں۔ ان بچوں نے جہاد کیا جن پر نماز واجب نہ تھی۔ شب کی تاریکی خیام حسینیؑ پر اداسی اور موت کا سایہ۔ صرف حیدر کرارؑ کے شیر کی گرج کبھی کبھی خاموش کو توڑتی کہ اچانک مصلی عبادت پر سید الشہداءؑ نے دیکھا کہ ایک بارہ سالہ بچے نے آ کر سلام کیا۔ امامؑ نے جوابِ سلام دے کر ہاتھ پھیلا دیے۔ لاڈلا بچہ یَا عَمَّاہُ کہہ کر چچا سے لپٹ گیا۔ پورے خیمے میں حسنؑ کی خوشبو مہک گئی۔ بھائی کی یاد میں حسینؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ بھائی کی یادگار میری آنکھوں کی ٹھنڈک میں تیرے سوکھے ہونٹوں پر قربان۔ رات میں ماں کی آغوش چھوڑ کر کیوں آئے بیٹا؟ چچا جان! میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کل کے شہیدوں میں میرا نام ہے؟ حسینؑ نے ایک ہاتھ جگر پر رکھا، پورے حوصلے سے پوچھا: بیٹے! موت کو کیسے سمجھتے ہو؟۔ قاسمؑ کے نازک ہونٹ جواب کے لیے کھلے۔ دنیا کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ عالم کی نبضیں چھوٹ گئیں۔ کائنات نے پہلی دفعہ موت کے متعلق یہ فقرہ سنا۔ چچا جان! میں موت کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتا ہوں۔ جواب کی اس

ادا پر حسینؑ کو پیار آ گیا۔ دیر تک بھتیجے کو پیار کرتے رہے۔ آخر فرمایا: قاسمؑ! تم تو پھر بڑے ہو تمہارے تو بھائی علی اصغرؑ کی شہادت بھی ہے۔ یہ سننا تھا کہ حیدر کرارؑ کا پوتا حیدرؑ بن گیا۔ اُٹھ کر ایک انگڑائی لی۔ جس سے قبا کے بند ٹوٹ گئے۔ شیریں آواز، شیرانہ گرج میں بدل گئی۔ چچا جان کیا یہ بے حیا فوج ہمارے خیموں میں آ کر ہمیں شہید کرے گی؟ ایسا نہیں ہو سکتا جاؤ بیٹا آرام کرو۔ تمہاری زندگی میں کس کی مجال ہے؟ کہ خیموں کے قریب آ سکے۔

آج حیدری خون نے بچے کی زبان سے موت کا ذائقہ بجائے تلخ کے شیریں کر دیا۔ صبح ہوئی قاسمؑ کی بیوہ ماں اپنے نونہال کو عروسی شہادت سے شادی کرنے کے لیے دولہا بنانے لگی اور حسینؑ کا یتیم دولہا بن کے، ماں کو آخری سلام کر کے، پھوپھیوں اور بہنوں سے رخصت ہو کے خیمے سے برآمد ہوا۔ ماں مصلے پہ بیٹھی کہہ رہی ہے۔ یا اللہ! میری نیک کمائی نیک راہ میں کام آئے۔ امامؑ نے حسنؑ کے لال کو گود میں لے کے گھوڑے پہ سوار کیا۔ بارہ سال کا ہاشمی بہادر بنی ہاشم کا حسین ترین شہزادہ فوجوں کے بادل میں چودھویں کے چاند کی طرح گھر گیا۔ بچپن میں اس شان سے جہاد کیا کہ بوڑھے سپاہیوں کو خیبر و خندق کے معرکے یاد آ گئے۔ سر سے پیر تک زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا اور بچپن کی پوری ادا کے ساتھ زخمی بچے نے ماں کو پکارا۔ اماں! میں گھر گیا۔ حسینؑ بے تابانہ لاشہ پر پہنچے۔ حسنؑ کے لختِ جگر کے ٹکڑے دامنِ عبا میں رکھے اور گنج شہیداں میں لائے۔ قاسمؑ کی لاش اکبرؑ کی لاش کے برابر رکھ دی۔ دونوں لاشوں کے بیچ میں بیٹھ کے بلند آواز سے فرمایا! واہ! غُربتاہُ اللہ! میں غریب ہو گیا اور پوری فضائے زمین و آسمان میں اس آواز کی صدائے بازگشت بلند ہوئی۔

فریاد از غریبی و بے یاری حسینؑ

انا للہ وانا الیہ راجعون

باب الحوائج

فضائل ..... نعمت

مصائب ..... امام موسیٰ کاظمؑ

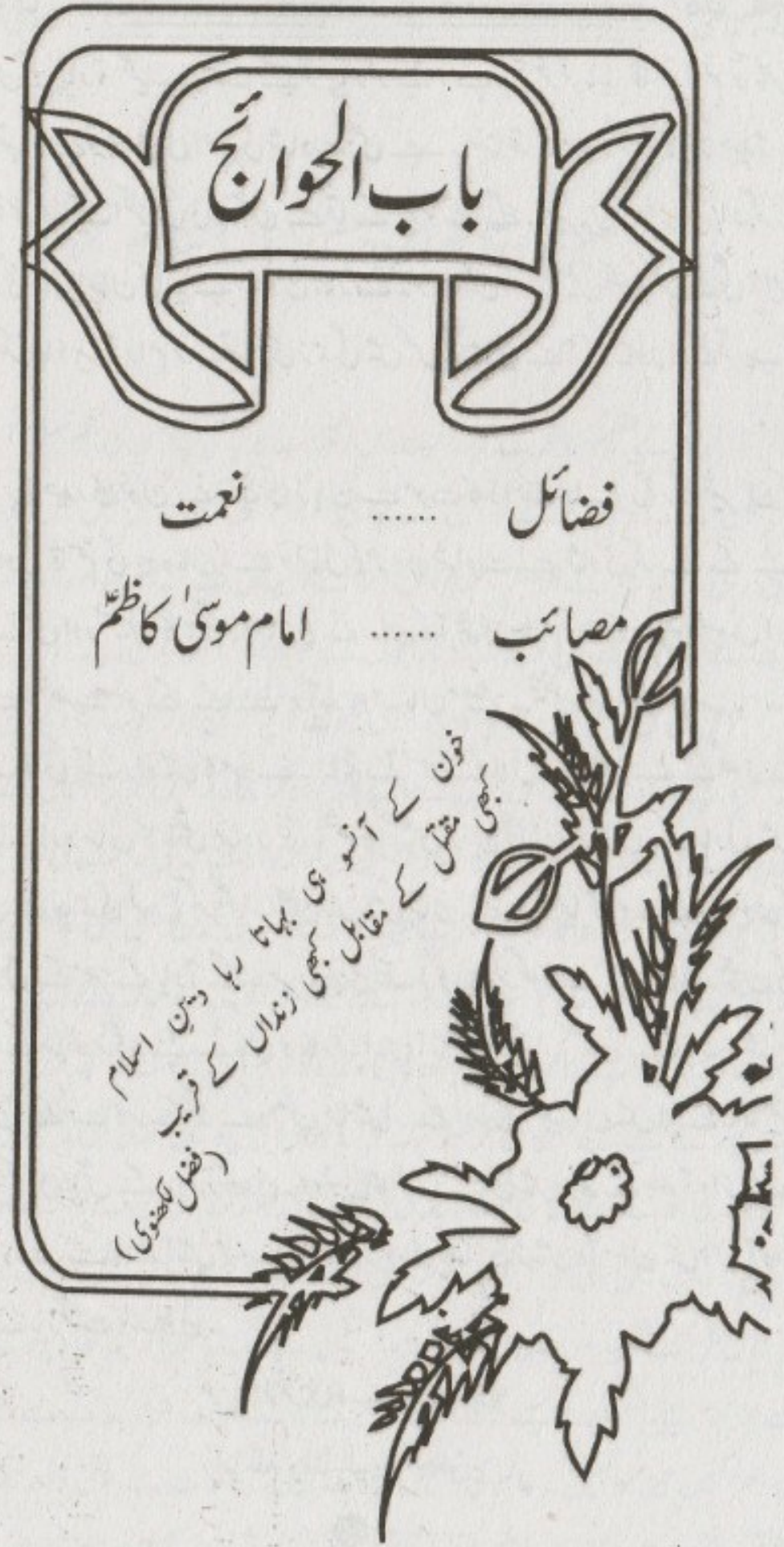

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کو عطیات ملتے ہیں۔ ان کے کئی نام ہیں۔ بڑوں میں اللہ بھی ہے، ہے اللہ بھی تو بڑا، ہے نا؟ اس کی طرف سے بھی عطیات ملتے ہیں۔ ان کے کئی نام ہے جو اللہ کی طرف سے عطیے ملتے ہیں وہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے عام بات بتاؤ، آپ کو کہ آپ کی صبح سے شام تک ایک مزدور نے مزدوری کی۔ اُسے جو مزدوری ملتی ہے عطیہ عوض کہلاتی ہے۔ اس کا نام ہے عطیہ عوض۔ یہ بدلہ ہے اس کی محنت کا۔

خوب سمجھ رہے ہیں نا آپ میری بات کو!

اگر اس کی مزدوری جو طے ہوئی ہے۔ آپ نے جو طے کی ہے ایک دو آنہ زیادہ دے دیا جائے یہ کہلاتا ہے فضل اور اگر مزدوری نہیں کی ویسے ہی آپ کا کوئی کام کر دیا باقاعدہ مزدور نہیں تھا۔ ویسے ہی کوئی کام کر دیا، آپ کا تو اگر آپ نے کچھ دیا تو وہ نہ مزدوری ہے یہی وہ فضل ہے۔ اسے کہتے ہیں انعام۔

توجہ ہے نا صاحبان!

وہ کہلاتا ہے انعام اور اگر اس پر کسی نے ترس کھا کر کچھ دے دیا، فاقہ کش تھا بیچارہ، ٹھٹھر رہا تھا، کپڑا نہیں تھا تو ایسے دینے کو کہتے ہیں کرم۔ ایسا دینے والا کہلاتا ہے کریم۔

توجہ ہے نا صاحبان!

وہ کہلاتا ہے فضل۔

سمجھے آپ!

یہ اس پر فضل ہے یہ جو زیادہ دے دیا ہے یہ کہلاتا ہے فضل اور اگر مزدوری نہیں کی

ویسے ہی کوئی کام آپ کا کر دیا یا قاعدہ مزدور نہیں تھا ویسے ہی کوئی کام کر دیا آپ کا تو اگر آپ نے کچھ دیا تو وہ نہ مزدوری ہے نہ وہ فضل ہے۔ اسے کہتے ہیں انعام۔

توجہ ہے نا صاحبان!

وہ کہلاتا ہے انعام۔ اور اگر کسی نے اس پر ترس کھا کے کچھ دے دیا۔ فاقہ کش تھا بیچارہ، ٹھٹھر رہا تھا، کپڑا نہیں تھا تو ایسے دینے کو کہتے ہیں کرم۔ ایسا دینے والا کہلاتا ہے کریم۔

توجہ ہے نا صاحبان!

اسے کہتے ہیں کرم تو ایک ہوتا ہے فضل اور ایک ہوتا ہے کرم تو ہم جو دن رات دعا کرتے ہیں، ہمیں اللہ کا فضل چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے لیے اس سے کچھ زیادہ چاہیے وہ فضل ہے۔ اور اگر ہم پر ترس کھا کے دے تو یہ کرم ہے۔ تو اللہ کا فضل و کرم ہی چاہیے۔ ہیں نا۔

تو صاحبان! ہر وقت کریم کا بڑا مرتبہ ہے۔ کریم کی بڑی شان ہے۔ فضل کا بھی بڑا مرتبہ ہے۔ فضل کی بھی بڑی شان ہے۔ تو ایک ہے عطیہ فضل اور ایک ہے عطیہ کرم۔ اللہ کی طرف سے عطیے ملتے ہیں۔ ہمیں اللہ کی طرف سے جو عطیے ملتے ہیں وہ عطیے دو قسم کے ہیں۔ ایک عطیہ نعمت کہلاتا ہے۔ ایک عطیہ رحمت کہلاتا ہے۔

اللہ دو قسم کی عطا کرتا ہے۔ نعمت دیتا ہے یا رحمت کرتا ہے۔ نعمت و رحمت میں یہ فرق ہے کہ نعمت کا سوال ہوگا اور رحمت معاف ہوگی۔ یہ فرق ہے نعمت میں اور رحمت میں۔ نعمت کے متعلق سوال ہوگا اور رحمت معاف ہے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

اب یہ بتاؤ کہ جو ہم روز روٹی کھاتے ہیں۔ یہ اللہ کی نعمت ہے یا کہ نہیں۔ میں آپ سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جمہوریت کا زمانہ ہے اگر آپ نے کہہ دیا نہیں تو بس ''نہیں'' ہوگا۔ تو اس لیے پوچھ رہا ہوں۔

کیوں بھائی؟

ہم جو روز روٹی کھاتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، چاول کھاتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں، ٹھنڈا برف کا پانی پیتے ہیں، چائے پیتے ہیں۔ یہ اللہ کی نعمت ہے کہ نہیں، ہے نا نعمت اور میں نے ابھی کہا ہے کہ نعمت کا حساب ہوگا۔ اللہ میاں قیامت کو حساب لے گا کہ کس قسم کی روٹی کھائی تھی؟ بتاؤ کتنا پانی پیا تھا؟ ہوگا حساب ہوگا۔ اللہ پوچھے گا ہم سے تو ہم کہیں گے اللہ میاں سے کہ ہم بھر پائے، ہم اگر کسی کو تو روٹی کھلا دیں اور پھر پوچھ بیٹھیں کہ کیوں بھائی! تم نے کتنی روٹی کھائی تھی؟ تو لوگ کہیں گے کہ واقعی کنجوس ہے کہ روٹی کھلا کے پوچھ رہا ہے۔ اب اللہ میاں کو تم اتنا کنجوس سمجھتے ہو کہ روٹی کھلا کے پوچھے گا کہ سناؤ کتنی روٹی کھائی۔ بالکل نہیں پوچھتا جی بھر کے کھایا کرو۔ بالکل روٹی ووٹی کا سوال نہیں ہوگا۔ اگر اپنے کھانے کے لیے بنائی ہوتی اور ہم کھا جاتے تو پھر پوچھتا کہ میری روٹی تم کیوں کھا گئے۔ بنائی ہمارے لیے ہے تو پھر پوچھنا کاہے کا۔ اگر پتہ ہوتا کہ پوچھے گا تو ہر وقت کاغذ رکھ لیا کرتے اور اس پر لکھ لیا کرتے کہ کل اتنا کھایا تھا آج اتنا کھایا ہے۔

نعمت ایک ہی ہے۔ نعمت ایک ہی اللہ نے کہی ہے۔ اس فقرے کی قدر تو اہل ذوق ہی کریں گے۔ حوصلہ تو بڑا کیا نعمت اتنی بڑی ہے یہ۔

کیا یاد رکھو گے مومنو!

آج یوم غدیر کے دن میں نے وہ نعمت دی ہے۔ تمہیں جس سے بڑی نعمت میرے پاس بھی نہیں۔ بس اس نعمت کا سوال ہوگا۔ وہاں بس اس نعمت کا سوال ہوگا۔ بتاؤ غدیر والی نعمت یاد ہے کہ نہیں؟ بولو! اگر آپ نے کہا یاد نہیں ہے تو صاف کہہ دے گا۔ جاؤ جہنم میں میں کیا کروں۔ اگر یاد ہے تو بتا دینا کہ یاد ہے۔ تو وہ کہے گا کہ یاد ہے؟ سب کو یاد ہے؟ سب مل کے نعرہ حیدر لگا دینا۔ یا علیؑ۔ اللہ بھی خوش ہو جائے گا۔

ہاں بھائی یاد ہے شاباش بہت اچھا یاد ہے۔

نعرہ غدیر اللہ بھی تمہارے خود لگائے گا۔ یا علیؑ بڑے اچھے ہو تمہیں نعمت یاد ہے۔ یاد

ہے۔ ہم تو سوتے جاگتے یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ بڑا یاد ہے۔ یاد ہے نا! اور یہ یا علیؑ تمہیں کلمے میں بھی یاد ہے کہ نہیں اللہ میاں پوچھے گا اللہ میاں یاد تھا کلمہ کتنا پڑھتے تھے؟ کلمہ اتنا ہی پڑھتے تھے جتنا کلمہ تیرا تھا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اتنا ہی کلمہ تھا اللہ میاں تیرا مگر اللہ میاں تجھے ہی گواہ بنا کے ہم کہتے ہیں، کہ مسجد میں، گھر میں، بازار میں جہاں چاہے یہ کلمہ پڑھ کے اعلان کرتے ہیں کہ اگر مسلمان ہو تو یقین کرنا ورنہ تو مسلمان نہیں، میں کلمہ پڑھ کے کہتا ہوں علی ولی اللہ، ورنہ تو مسلمان نہیں رہے گا۔

اب نعرہ لگاؤ نعرہ حیدری، یا علیؑ۔

شاباش! سلامت رہو یہ کلمہ ولایت علی ولی اللہ، کلمہ ولایت کیا ہے؟ علی ولی اللہ، یہ ہماری پہچان ہے، یہ ہماری خصوصیت ہے، یہ ہمارا سلوگن ہے، یہ ہمارا پرچم ہے۔ یہ ہمارا نعرہ ہے، یہ ہماری الگ نشانی ہے۔ کلمہ ولایت کیا؟ علی ولی اللہ۔ یہ دیسی کلمہ نہیں، یہاں کا بنا ہوا نہیں ہے۔ یہ کلمہ ''ولایت'' کے عادی ''دیسی'' کے عادی نہیں ہوتے۔ دیسی کے عادی وہ ہوتے ہیں، جو خود بنا کے پئیں۔ خود بنا کے پینے والوں کو کیا پتہ؟ کلمہ ولایت کیا شے ہے؟ کلمہ ولایت ہے ہمارا۔ یہ خبر اللہ سنے گا تو بڑا خوش ہوگا۔ تو پتہ ہے کہ کیا کہے گا اللہ؟ کہ یہ لاہور کے مومنین آ گئے، یا علیؑ! یہ ولایت پڑھ رہے ہیں۔ انہیں تو غدیر کی نعمت یاد ہے۔ مولا آ گئے، تم آ گئے۔ مولا پوچھ رہے ہیں کہ کیا کرتے رہے دنیا میں؟ مولا، علیؑ علیؑ کرتے رہے۔ نمازیں پڑھی تھیں؟ ہم کہیں گے۔ مولا، مولا کا بچہ، ٹھیک بات کر۔ مولا، بات تو سنیں۔ مولا کہیں گے بدتمیز، بھاگ جا، وہ تیرا گھر ہے جنت، بڑا لطف آئے گا۔ بڑا سواد آئے گا، رش ہوگا جنت میں۔ ہم جانویں گے، اللہ پتہ ہے کیا کرے گا جنت میں۔ بجائے ایک دروازے کے ''بارہ دری'' بنا دے گا اور ہر ''در'' کھلا ہوگا اور قبلہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: جنت کے دروازے پر لکھا ہوا ہے کیا لکھا ہوا ہے قبلہ! جنت کے دروازے پر لکھا ہوگا، محمدؐ، علیؑ، فاطمہ، حسنؑ، حسینؑ۔

سارے لوگ پہنچیں گے ہم بھی جائیں گے قبلہ! آپ آئے دروازے پر نعرہ

ولایت لگا تو ایک دوسرے سے کئی کہیں گے کہ عمر دین اوہ دیکھو! چلو یہ تو امام باڑہ ہے تو معزز سامعین! یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اس کا حساب دینا ہے۔ رحمت کا کوئی حساب نہ ہوگا۔ رحمت بے پایاں عطا کرتا ہے۔ رحمت کیا ہے؟ یاد رکھو نبوت خدا کی رحمت ہے اور آخری نبیؐ عالمین کے لیے رحمت ہیں۔ اور یہ آخری بھی اسی لیے کہ قیامت میں تمہیں نبیؐ کے ساتھ نہیں پکاروں گا، بلکہ تمہیں چونکہ وہ رحمت ہے۔ اب نبوت ختم ہوگئی، مک گئی اس کے بعد کیا شروع ہوا؟ اب رحمت کے بعد جو چیز شروع ہوتی ہے اسے کہتے ہیں، لطف، یہ اللہ کا لطف ہے۔

اللہ لطیف بعبادہ

نبوت کے بعد جو چیز عطا فرمائی یہ نہ رحم ہے نہ کرم ہے، نہ فضل ہے۔ یہ ہے اللہ کا لطف۔ اور اسے کہتے ہیں حضور! امامت۔ یہ اللہ کے لطف سے ملتی ہے۔ آپ کے کتنے امام ہیں؟ جواب دو: بارہ، شاباش! کتنے امامؑ ہیں، بارہ، بارہ ہیں۔ پانچویں امامؑ کا کیا نام ہے؟ محمد باقرؑ۔ شاباش! ان کی والدہ کا کیا نام ہے؟ کیا کہا، فاطمہؑ، دور جو بیٹھے ہیں ان میں سے کسی نے یہ کہہ دیا ہے پاس بیٹھنے والوں کو پتہ نہیں ہوتا۔

محترم سامعین!

اللہ نے ہمیں بارہ امامؑ دیئے ہیں۔ یہ چھوٹی موٹی باتیں، ولادت، شہادت، ہر مومن کو زبانی یاد ہونا ضروری ہے اور اپنی مجلسوں میں پڑھنے والوں کو مجبور کرو کہ ہمیں یہ باتیں سمجھاؤ۔ نئی بات پر مجبور کرو اور آج تم اپنے ساتویں امامؑ کا ذکر سننے کے لیے آئے ہو۔

کیوں بھئی ٹھیک ہے نا؟

میں ٹھیک عرض کر رہا ہوں، آج کے آنے کا مطلب ہی یہی ہے۔ کیا نام تھا ہمارے ساتویں امامؑ کا؟ امام موسیٰ کاظمؑ۔ موسیٰ کاظم تھا لقب اور ابوالحسنؑ تھی آپؑ کی کنیت جو خود امامؑ کا ذکر سننے آئے ہیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ اس کا کیا ذکر یاد ہے۔ سارے مجلس والوں کو

یہی یاد ہے کہ

مولا پہ انتہائے اسیری گزر گئی

یعنی مطلب یہ ہے کہ مولاؑ ساری عمر قید میں رہے۔ اگر ساری عمر قید ہی رہے تو بہ حیثیت امامؑ انہوں نے ہمیں کیا فائدہ پہنچایا۔ ہمیں کیا شے عطا فرمائی؟ کیا چیز دی؟ کیا کچھ فرمایا؟ تو وہ ان کی ایک ذرا سی جھلک آپؑ کو دکھاؤں کہ انہوں نے ہمیں سب سے بڑا سبق یہ دیا ہے کہ مومن کو چاہیے جو ہمارے ماننے والے ہیں کہ ایک دوسرے کی بے انتہا عزت کریں اور ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آئیں۔ ورنہ! میں ان کا امامؑ نہیں۔ اپنے شیعوں کی فہرست سے کاٹ دوں گا نام ان کا۔

یہ امام موسیٰ کاظمؑ کے سبق کی روح تھی۔ میرے پاس اگر موٹر ہے اور میرا مومن بھائی پیدل جا رہا ہے۔ میرا فرض ہے کہ موٹر روکوں اور اس کو ساتھ بٹھاؤں اور اگر میں گزرا چلا گیا تو امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں، میں ان کا نام کاٹ دوں گا۔

سمجھے نا جناب!

ایک دوسرے کی مدد کرنا، یہ ان کی سب سے بڑی تعلیم ہے۔ وہ علی بن یقطین کا واقعہ سنا دوں آپ کو۔

سنیں گے نا!

ایک بہت بڑے مومن کامل بہت بڑے بزرگ تھے جب جانے لگے امام کی زیارت کو تو ان کے ہمسائے میں، ایک شخص رہتا تھا وہ بیچارہ لکڑہارا تھا۔ لکڑیاں بیچتا تھا۔ یہی اس کا گزارہ تھا۔ غریب آدمی تھا۔ وہ آیا اس نے آ کر سلام کیا۔ میں بڑا غریب آدمی ہوں۔ آپ کی خدمت کرتا چلوں گا۔ اس نے کہا: جا میاں جا۔ اب جگہ نہیں رہی سواری میں۔ وہ مومن بیچارہ چلا گیا۔ یہ علی بن یقطین حج کو گئے۔ ان کے مومن ہونے کی بڑی شہرت تھی۔ حج کر کے یہ مدینے آئے۔ امامؑ کے سلام کو حاضر ہوئے۔ جب آئے تو کہا کہ میری اطلاع کراؤ۔ اطلاع ہوئی تو اس آدمی نے آ کر کہا کہ امامؑ فرماتے ہیں۔ ہم تم سے

ملنا نہیں چاہتے۔ ہم نے تمہارا نام کاٹ دیا ہے اپنے شیعوں کی فہرست سے۔ اب تمہارا ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ تم جاؤ! فوراً اُٹھ کر چلے جاؤ ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا۔

علی بن یقطین تو گھبرا گیا۔ اس کا برا حال ہوگیا۔ ہائیں میں نے کیا کر دیا؟ مجھ سے کیا قصور سرزد ہوگیا؟ روئے چلائے چلا جا رہا ہے۔ اس کا تو برا حال ہوگیا۔ اس نے کہا جس طرح بھی ہو سکے امامؑ سے بات کرا دو۔ مجھے پتہ چلے کہ میرا جرم کیا تھا؟ خیر سامنے آ گیا تو مولاؑ نے کہا: سن! تو ''میرے بھائی'' کو ساتھ بٹھا کر نہیں لایا۔ غربت کی وجہ سے اسے حقیر سمجھا، نکل جاؤ یہاں سے۔ ایسے شیعہ مجھے منظور نہیں ہیں۔ ایسے شیعہ کو ہم پسند نہیں کرتے۔ تو مولاؑ اب اس کی کیا تلافی کروں؟ فرمایا کہ جب تک وہ تمہیں معاف نہیں کرے گا میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ کہا: قبلہ! وہ بڑا دور ہے یہاں سے۔ میں جاؤں وہاں، وہ معاف نہ کرے میں تو مارا گیا۔ حضورؑ مسکرائے۔ فرمایا: اگر تیری نیت ٹھیک ہے تو ایک سیکنڈ میں وہاں پہنچا دوں گا، چنانچہ فوراً پہنچا دیا گیا۔ تو جا کے اس نے اس مومن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کون ہے؟ کہا کہ میں علی بن یقطین۔ تو اس نے اندر سے بے نیازی سے جواب دیا کہ بھلا میرے دروازے پر علیؑ بن یقطین کیوں آوے گا۔ ملنے کے لیے۔ کہا ذرا دیکھیے خدا کے لیے ذرا باہر آؤ، وہ باہر آیا تو اس نے کہا کہ کیا قصہ ہے؟ دیکھ کے گھبرا گیا۔ آپ کیسے؟ علی زمین پر لیٹ گئے اور لیٹ کر کہا کہ میرے پر جوتوں سمیت کھڑا ہو جا اور جوتوں سے میرے منہ کو کچل اور پھر مجھے کہو کہ میں نے تجھے معاف کر دیا۔ وہ غریب آدمی ڈرے اور جو میں تجھے کہتا ہوں تجھے کرنا پڑے گا کہ بات کیا ہے؟ کہا کہ میرے مولا ناراض ہو گئے۔ اس نے کہا: ہائیں ہم غریبوں کا اتنا خیال ہے یہ کہہ کر اس نے ہائے مولاؑ کہا اور دم نکل گیا۔ ہائے مولاؑ کہا اور فرطِ محبت سے دم نکل گیا۔

علی بن یقطین مدینے واپس پہنچا اعجاز سے۔ کہنے لگا: مولا! وہ تو مر گیا یہ بات سن کے۔ اب میں کیسے یقین کروں کہ اس نے معاف کر دیا ہے یا نہیں۔ تو آپ نے آواز دی: ہارون، تو دیکھا کہ وہ چلا آ رہا ہے۔ دنیا بھر کو انہوں نے سبق دیا۔ یہی میرے مولاؑ مدینہ

میں روضہ رسولؐ پر تھے کہ آ گیا ہارون الرشید۔ یہ اس زمانے کا بادشاہ تھا۔ اس نے آ کر سلام کیا۔ السلام علیک یا ابنِ عم۔ میرے چچا کے بیٹے تم پر میرا سلام ہو۔ تو امامؑ نے کہا: السلام علیک یا جدہ میرے جد پاکؐ میرا سلام ہو۔ اس نے جد کہہ کر سلام کیا۔ اس نے ابنِ عم کہہ کر سلام کیا تو اس نے کہا آپ اکڑتے کیوں ہیں؟ میں عباسؓ کی اولاد ہوں۔ آپ ابی طالبؑ کی اولاد ہیں۔ آپ بھی چچا کی اولاد ہیں۔ میں بھی چچا کی اولاد ہوں۔ تو امامؑ نے فرمایا کہ سن! اگر آج رسالت مآبؐ آ جائیں زمین پر اور تیری بیٹی سے شادی کرنا چاہیں تو کیا تو کر دے گا؟ کہا: سبحان اللہ! مجھے تو فخر ہوگا میری بیٹی ام المومنین بنے گی۔ کہا کہ بس یہ تجھ میں اور مجھ میں فرق ہے کہ رسولؐ تیری بیٹی سے شادی کر سکتے ہیں۔ میری بیٹی ان کی اپنی بیٹی ہے۔

سمجھا اس کے جواب میں اس نے کیا کیا کہ رات کے وقت مولاؑ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ قید کر دیا۔ جب جا رہے تھے قید ہو کر تو لڑکیوں نے، لڑکی بڑی چیز ہوتی ہے، بیٹے میں وہ بات نہیں ہوتی۔ بیٹو! مجھے معاف کرنا۔ ہو تو بیٹے، مگر بیٹے کی محبت کا انداز اور ہوتا ہے بیٹے کا محبت کا انداز اور ہوتا ہے۔ خدا نے جنہیں بیٹیاں دی ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ بیٹی کا پیار کیا ہوتا ہے؟ اور بیٹے کا پیار کیا ہوتا ہے؟ بیٹی لپٹ گئی مولاؑ کہ بابا میں تو نہیں جانے دوں گی آپ کو۔ کہا: بیٹی فکر نہ کر میں آؤں گا۔ تجھے ملوں گا، کوئی بات نہیں ہے۔ قید کر کے لے گیا۔ قید کا قصہ نہیں سناتا۔ لمبا ہے۔ بہرنوع کچھ دن کے بعد رہائی ہوگئی۔

یہ ہارون کی حکومت چودہ سال رہی۔ چودہ سال کے عرصے میں کم سے کم آٹھ مرتبہ آپ کو مختلف وقفوں میں قید کیا گیا۔ یہ نہیں کہ چودہ سال مسلسل قید رکھا۔ ایسا نہیں ہے چودہ سال کے عرصے میں کئی مرتبہ قید ہوئے۔ کبھی دو مہینے کبھی چار مہینے اس طرح وہ قید کرتا رہا۔

سن رہے ہو نا بھائی میری بات۔

جب آخری مرتبہ قید کیا ہے اس نے تو آپ کے قید خانے کا داروغہ جو تھا اس خبیث کا نام تھا سندی بن شاہک۔ مومنین! یہ ظالم شمر سے بھی بدتر انسان تھا۔ یعنی میرے بدن

میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس کا نام لے کر ایسا نامعقول ایسا خبیث دربان تھا کہ کئی شمر اکھٹے ہو جائیں تو سندی بن شاہک بنتا ہے۔ داروغہ تھا، قید خانے میں بڑے واقعات ہوئے ہیں تمہیں چند جملے سنا کے بیٹھ جاتا ہوں۔ اگر تم سُن سکو تو وہ جملے میں سنا دوں۔ تین چار مہینے گزر گئے قید میں کوٹھڑی ایسی کہ کھڑے ہوتے ہیں تو چھت نیچی اور لیٹتے ہیں تو دیواریں چھوٹی، پاؤں نہیں پھیلتے۔ جس میں یہ قید تھے۔ ایسی کوٹھری۔

سن رہے ہو نا! میرے بھائی

اور ہر وقت یا اللہ تیرا شکر ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہا۔ ایک دن زہر دے دیا گیا۔ میں نے مختصر کر دیا ہے۔ زہر پلانے کے بعد سرکاری ڈاکٹر بھیجا کہ وہ اس کی توثیق کرے کہ ان کو زہر نہیں دیا گیا بلکہ ان کی موت طبعی ہوئی ہے۔

سندی بن شاہک خبیث کہتا ہے کہ خبردار قیدی یہ سرکاری طبیب جو آیا ہے تو نے اسے نہیں بتانا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ خبردار جو بتایا وہ طبیب آ کے دیکھنے لگا۔ آپؑ نے دونوں ہتھیلیاں سامنے کر دیں۔ تو ہتھیلیوں کو دیکھتے ہی اس نے کہا کہ تم نے تو اس بیچارے کو زہر دے دیا ہے۔ ہتھیلیوں پر آثار تھے زہر کے۔ وہ تو یہ کہہ کے چلا گیا۔ سندی بن شاہک نے کیا کیا معاف کرنا دوستو! مجھے پتہ نہیں آسمان کیوں قائم رہا اتنا غریب اور مظلوم امامؑ اور کوئی نہیں۔ یہ ظالم آگے بڑھا۔ ہاتھ میں ریش مبارک کو پکڑ کے زور سے طمانچہ مارا۔

ادھر کوٹھڑی کے پیچھے سے آواز آئی: بیٹا صبر کرو میں تیری دادی آئی ہوئی ہوں۔ یہ مصیبت تو حسینؑ پر بھی نہیں گزری تھی۔ تمام مومنین کی خدمت میں میں ان کے امامؑ کا پرسہ پیش کرتا ہوں۔ جب شہادت ہو گئی۔ سندی نے حکومت کو اطلاع دی کہ قیدی ختم ہو گیا۔ حکومت نے کیا انتظام کیا؟ دور دراز سے آئے ہوئے پردیسی مزدور جو جانتے بھی نہ تھے کہ یہ کون ہے؟ انہیں بلایا۔ چار مزدور جو جانتے بھی نہیں کہ یہ کون ہے؟ کہا کہ ایک تختے پر ڈال کر اُسے اُٹھا کے لے جاؤ اور کہیں بھی پھینک دو۔ اس طرح جنازہ اُٹھا ہے آپؑ کے

ساتویں امامؑ کا۔

مزدوروں نے کیا کیا کہ وہ جنازے لے جا کے دجلے کے پل پر رکھ کے چلے آئے۔ مطلب یہ ہے کہ پل پر ٹریفک گھوڑے، اونٹ وغیرہ کے پاؤں میں آ کر ختم ہو جائے گا۔ کس نے دفن کرنا ہے؟ کس نے اُٹھانا ہے؟ مگر ہوا ایسا جب ٹریفک کا گزر ہوا تو گھوڑے پل کے دونوں طرف رک گئے۔ سوار حیران کہ قصہ کیا ہے؟ اُتر کے دیکھا کہ کوئی شے لپٹی ہوئی ہے کپڑے میں۔ کپڑا ہٹا کے دیکھا میت ہے۔ وہ تھے عیسائی قافلے۔ ان عیسائیوں نے کہا یہ مسلمان کی میت ہے۔ یہ شہر بھی مسلمان کا ہے۔ قریب کے مسلمانوں کو بلا کر کہا کہ کیا تمہارے ملک میں میت کو دفن کرنے کی رسم نہیں ہے؟ ہے کوئی ایسا جو اس بیچارے کو دفن کر دے۔

سلیمان نامی ایک مومن تھا بغداد کا۔ اس نے منت مانی تھی کہ اگر میرا کام ہو گیا تو میں فاطمہؑ کے بیٹے کا کوئی کام کروں گا۔ کوئی خدمت کروں گا۔ وہ اپنے گھر رات کو سویا۔ خواب میں پردہ پوش خاتونؑ آئی۔ سلیمان نے یہ منت مانی تھی۔ کہا: ہاں، تو میں فاطمہؑ آئی ہوں تیرے دروازے پر۔ گھبرا گیا۔ بی بی آپؑ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ کہا: تو نے میرے بیٹے کی خدمت کا وعدہ کیا تھا۔ میرے بیٹے کی میت بغداد کے پل پر رکھی ہوئی ہے، جلدی آؤ۔ وہ اٹھا۔ بغداد کے پل پر گیا۔ میت دیکھی۔ اتنا اثر ہوا کہ قریب تھا کہ وہ بھی مر جاتا۔ مرنے لگا، اپنے کو سنبھالا۔ لوہاروں کے محلے میں گیا۔ لوہار کو بلایا، بھلا میت کے لیے لوہار کو کیوں بلایا؟

میرے عزیزو! کہ میت کے ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی تھی۔ میت کے پیروں میں بیڑی بھی تھی۔ لوہار نے آ کر وہ ہتھکڑی، بیڑی کاٹی اور پھر انہوں نے اکھٹے ہو کر امامؑ کی میت اُٹھائی، اور وہ سب اپنے ساتھ اپنے بیویوں کو، اپنی عورتوں کو بچوں کو لائے تھے کہ ہم میت لے کے چلیں گے اور ننگے سر روتے ہوئے جنازے کے پیچھے چلے تا کہ جنازہ کی رونق ہو جائے۔ اور اسے غریبوں کے، پردیسیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا اور بات ختم ہو گئی۔

ہمارے گھر آج یہ واقعہ ہوا ہے۔ بتاؤ آج کا دن ہمارے لیے یوم عاشورا سے کم

ہے؟ بولو بھئی؟ اتنا بڑا حادثہ ہمارے ساتھ گزرا ہے۔ آج وہ پردیسیوں کا قبرستان ''باب الحوائج'' کہلاتا ہے۔ وہاں حرم بنا ہوا ہے۔ وہاں دربار ہے ''کاظمین'' جس بادشاہ نے زہر دیا تھا نام ونشان نہیں۔ کہاں گئے؟ کیا بنا؟ ان کے دربار میں آج لاکھوں انسان یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے ماں باپ تم پر قربان ہوں اور ہم لاہور میں بیٹھ کر رو رہے ہیں اور دنیا میں ہزاروں جگہ ''ہائے کاظمؑ''، ''ہائے موسیٰؑ'' کی مجالس برپا ہیں۔ خدا تمہاری مجلس کو قبول کرے۔

خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ اللہ تمہیں بحق محمدؐ و آل محمدؐ سلامت رکھے، آپ حضرات کو دین و دنیا کی ہر نعمت نصیب ہو۔ آمین!

اللھم صل علی محمد و آل محمد

ہجرت رسولؐ

فضائل ..... ہجرتِ رسولؐ

مصائب ..... تیاری از مدینہ

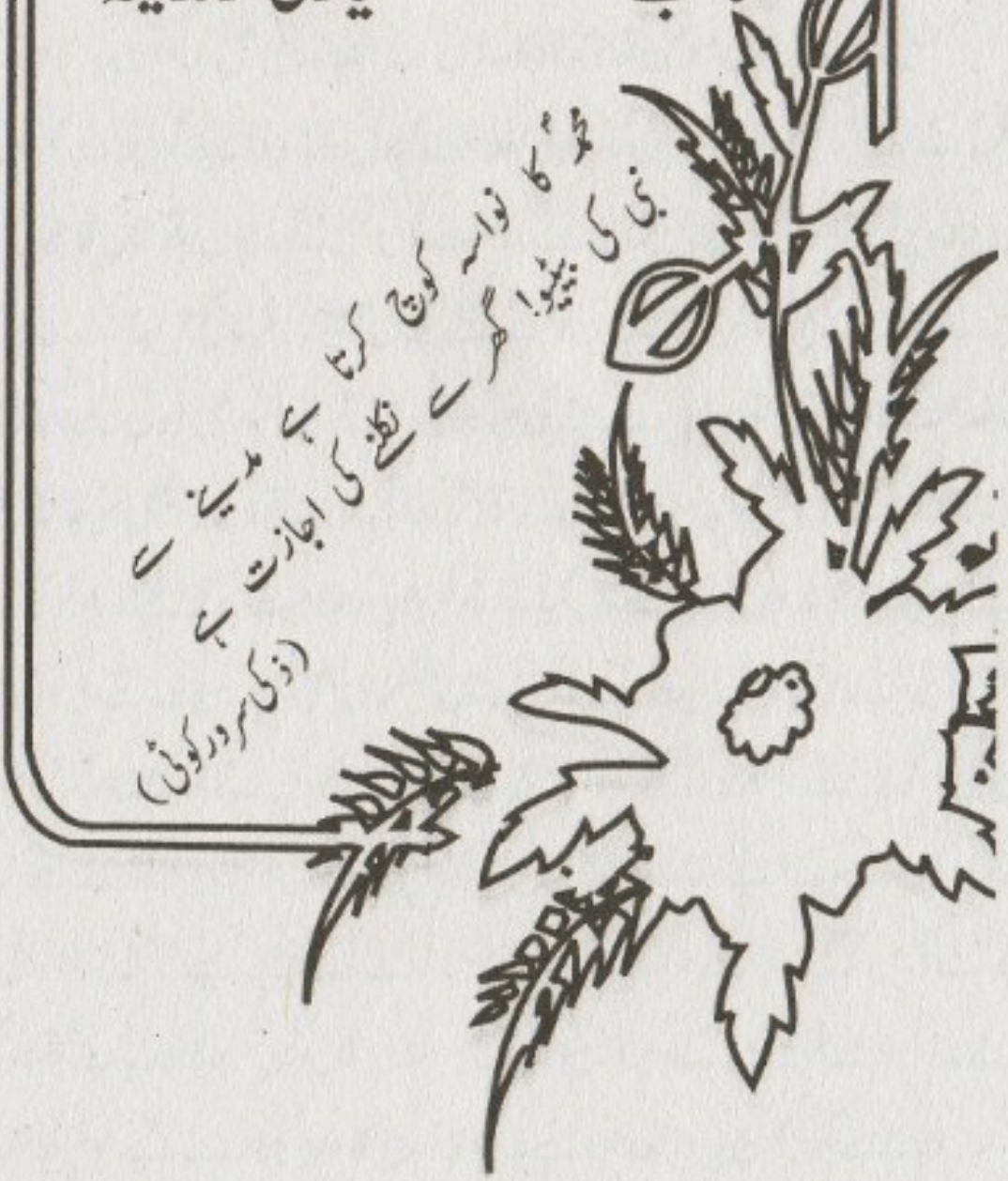

ہجرت رسولؐ

میرے محترم سامعین!

اللہ آپ کی ان محفلوں کو قبول فرمائے۔ اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ ہم پر کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ اور اس کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور اس کو مانیں۔ اب مصیبت یہ بن جاتی ہے کہ حضور والا! کہ ایک ہوتا ہے جاننا، ایک ہوتا ہے ماننا۔ اب یہ فیصلہ تنہائی میں بیٹھ کر خود اپنے آپ سے کرنا ہے۔ کہ ہم صرف جانتے ہیں یا مانتے ہیں۔ جاننے میں اور ماننے میں بڑا فرق ہے۔ اگر جاننے کی بات ہے تو ہم اپنی تقریروں میں بیان کر سکتے ہیں اور کتابیں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ یہ ہے جاننا، اب سوال ہے ماننا۔ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں، کہ ہندوستان کی گورنمنٹ جو ہے (بھارت کی) اس کا سربراہ فلاں ہے۔ اس کا وزیر اعظم فلاں ہے۔ اس کے خاندان کو جانتا ہوں۔ ان کی نسلوں کو جانتا ہے۔ مگر آپ بتائیں ان کے قانون کو، ان کے قاعدے، ان کے حکم کو میں مانتا ہوں؟ ہرگز نہیں۔ جاننا بات اور ہے اور ماننا بات اور ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم اللہ کو کس شان سے اللہ مانتے ہیں؟ اللہ کو صرف جانتے ہی ہیں یا مانتے بھی ہیں۔ کہ وہ ایسا ہے مالک ہے، رحیم ہے، کریم ہے۔ تو یہ ہم صرف جانتے ہیں یا مانتے بھی ہیں۔

ممکن ہے آپ کے کہنے سے ہم نہیں مانتے۔ مولوی صاحبان مانتے ہوں گے۔ ان کا بھی نہیں پتہ۔ وہ مانتے ہی ہیں یا نہیں بھی ہیں۔ آپ نے رات کو اکثر دیکھا ہوگا کہ بچہ رونے لگا تو اس کی ماں ڈراتی ہے، بچے کو کہ سو جا، وہ ''ہوا'' آ گیا۔ بچہ ڈر کے سو جاتا ہے۔ اب بتاؤ کہ وہ ماں بھی ڈرتی ہوگی ''ہوے'' سے، جو بچے کو ڈرا رہی ہے۔ وہ ماں بھی

ڈرتی ہے؟ نہیں نا۔ ماں تو نہیں ڈرتی۔ اسی طرح ادھر نظر آ رہا ہے اللہ جانے۔ یہ ڈرانے والے خود بھی ڈرتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں ڈرایا جاتا ہے اور اتنی شدت سے ڈراتے ہیں اللہ سے ہمیں۔ تم، نے تصویر کیوں بنوائی۔ بڑی غلط بات ہے۔ اللہ سے ڈرو۔ یہ تم نے کالے کپڑے کیوں پہنے۔ اللہ سے ڈرو۔ ڈر رہے ہیں یہ تم روکتے کیوں ہو؟ اللہ سے ڈرو۔ ڈرا ڈرا کے اللہ سے خوف پیدا ہو گیا ہے اللہ کا۔ اتنے سہم گئے ہیں اللہ سے کہ جہاں اللہ کا ذکر ہوتا ہو ڈر کے مارے نہیں جاتے۔ تندرست نوجوانوں کے راستے میں اگر مسجد آ جائے تو، تو چکر کاٹ کے چلے جاتے ہیں۔

کیوں بھئی کیا بات ہے؟ جی اللہ سے ڈر آتا ہے۔ اتنا ڈرایا گیا اللہ سے اللہ کے بندوں کو۔ کوئی سمجھانے والا نہیں کہ اللہ سے ڈرانے والو! اللہ سے ڈرو کیوں اس کے بندوں کو ڈرا ڈرا کر مارتے ہو۔ اللہ کوئی ظالم ہے؟ کیوں ڈرو اللہ سے، اللہ تو بڑا پیارا ہے، بڑا رحیم ہے، بڑا کریم ہے۔ ایسے کریم اور مہربان سے ڈرنا چاہیے۔ اس سے محبت کرو۔ اس سے پیار کرو۔ اس کے قریب جاؤ۔ وہ تو ہمیں پاس بلاتا ہے۔ ڈرو تو صرف اس بات سے کہ وہ محبوب اللہ ہے۔ کہیں تم سے روٹھ نہ جائے۔

اس گفتگو کو میں طویل نہیں کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرے وطن کا مجمع ہے اور وہ اس زبان کو خوب سمجھتے ہیں۔ تو بھائی جان مان لیں اللہ کو اور ماننے کی پہلی شکل یہ ہے کہ اچھی طرح جان لو۔ اس کی ذات کو پہچان لو، اس کی صفات کو اور مان لو اس کی بات کو، بات کو مانو اور اس کے ماننے میں بھی بہت سی چیزیں چھوڑنی پڑیں گی۔ ہر وہ شے جو اللہ کی طرف جانے سے روکتی ہو وہ بت ہے۔ اس کو چھوڑنا پڑے گا۔ اگر اولاد کی محبت خدا کی طرف جانے سے روکتی ہو تو اولاد ''بت'' ہے اور گھر کی محبت اگر اللہ کی طرف جانے سے روکتی ہے تو گھر ''بت'' ہے۔ اور وطن کی محبت اگر اللہ کی طرف سے جانے سے روکتی ہو تو وطن ''بت'' ہے۔ ان سارے بتوں کو توڑ کر جس نے ہمیں اللہ کی طرف پہنچایا ہے اسے سلام کہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے رسولؐ نے بھی اسلام کی خاطر وطن کو چھوڑ دیا۔ وطن سے ہجرت

کی اور ہجرت کے معنی ہی یہی ہیں کہ اپنے محبوب وطن کو چھوڑا، صرف اللہ کی خاطر۔ یہ نہیں کہ یہاں سے جا کر شہنشاہی مل گئی تھی۔ حکومت مل گئی تھی۔ سلطنت مل گئی تھی بلکہ اللہ کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ رہے تھے۔ اس لیے وطن چھوڑا کہ اس سے اللہ خوش ہو جائے۔ اللہ راضی ہو گا اور آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ یہ ہجرت کا واقعہ ربیع الاوّل کے مہینے میں ہوا۔ ربیع الاوّل کے پہلے ہفتے میں یہ ہجرت کا واقعہ ہوا تھا۔ مگر سن ہجری بجائے ربیع الاوّل کے محرم سے شروع ہوتا ہے اور دنیا کا دستور یہ ہے کہ وہ اپنے سن کسی بڑے واقع سے شروع کرتے ہیں۔ اگر یہ ہمارا سن رسولؐ کی ہجرت سے شروع ہے تو ربیع الاوّل سے ہونا چاہیے اور اس کا محرم سے شروع ہونا بتاتا ہے، کہ ہے تو ہجری ہی مگر محمدؐ کی ہجرت سے نہیں۔

سمجھ آ گئی ہے نا بات؟

بہر نوع ربیع الاوّل کے مہینے میں رسولؐ کی ہجرت تھی۔ وطن چھوڑا اور عجیب بات ہے کہ تمام مکے کے کفار حضورؐ کے دشمن تھے۔ بالکل سادہ سادہ بات ہے۔ عزیز و قریب سب دشمن تھے۔ اپنے پرائے دشمن تھے۔ جن سے خون کا رشتہ تھا وہ دشمن تھے۔ جو رات دن چاروں طرف رہتے تھے وہ دشمن تھے۔ مگر ان دشمنوں کے بیچ میں رہتے تھے مکے میں۔ اس لیے کہ اللہ تو مددگار ہے ہی ہر حالت میں اور ظاہری حالت میں ابی طالبؑ جیسا مددگار موجود تھا۔ ابی طالبؑ کے ہوتے ہوئے مکہ چھوڑنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی، اتنا عظیم مددگار موجود تھا۔

شیخ البطحا، امیر العرب، سید القوم جناب ابی طالبؑ وہ مددگار موجود تھا۔ اتنا بلند ہے ان کے ایمان کا آفتاب کہ آج تک جن کی نگاہوں میں نقص ہے۔ وہ اس ایمانی آفتاب کو دیکھ ہی نہیں سکتے، یہ ابی طالبؑ کے ایمان کی چمک ہے۔ کہ نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں، کوئی کچھ کہتا ہے ان کے ایمان کے متعلق کہ ابی طالبؑ مومن تھے یا نہیں۔ مجھے کیا خبر وہ تو تھے یا نہیں۔ مجھے نہیں پتہ، بس کلِ ایمان کے ابا تھے۔ میرے پاس ہے یہ رومال، پانچ چار آنے کا رومال کھو جائے گا تو آپ خرید دیں گے، یا میں خود خرید لوں گا۔ کوئی ایسی بات

نہیں۔ یہ رومال میں کسی کے سپرد کرنا چاہتا ہوں کہ بھئی مجلس کے بعد مجھے واپس کر دینا۔ تو کیا جس سے جان نہ پہچان ہے اس کے سپرد کر دوں گا وہ رومال؟ یہ رومال چار آنے کا سپرد کرتے وقت مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ اس آدمی کو میں جانتا بھی ہوں کہ نہیں۔ میرا واقف بھی ہے کہ نہیں۔ مجلس کے بعد واپس بھی کر دے گا کہ نہیں۔ چار آنے کی چیز سپرد کرتے ہوئے واقفیت بھی دیکھنا پڑتی ہے۔ اس کی ایمانداری بھی دیکھنا پڑتی ہے۔ وہ ایمان دار بھی ہے یا نہیں۔ اب اللہ کے خزانے میں سب سے قیمتی ہیرا سب سے قیمتی موتی اگر تھا، تو وہ تھا ''محمدؐ'' محمدؐ جیسے قیمتی ہیرے کو اللہ جس کے سپرد کر دے اللہ اسے ایماندار سمجھتا ہے کہ نہیں؟ اللہ اسے اتنا ایماندار سمجھے کہ محمدؐ جیسی شے اس کے سپرد کر دے اور ہم کہیں کہ نہیں نہیں۔ میں نے ابی طالبؑ کو تصور میں ہنستے ہوئے دیکھا، میں نے کہا کہ قبلہ آپ کیوں ہنس رہے ہیں۔ تو کہنے لگے کہ لطف آ گیا، کیا لطف آ گیا۔ بھئی جس کے پاس جو کچھ ہے وہ لے کے میرے پاس آ جاتا ہے۔ جیسے اللہ کے پاس نبوت تھی امامت تھی وہ میرے پاس لے کے آیا، لو یہ لو۔ مومنوں کے پاس درود و سلام تھا، وہ لے کے میرے پاس آ گئے کہ ہم تمہیں یہ دیتے ہیں جن کے پاس ''ایمان'' ہے ہی نہیں وہ ایمان لے کے کہاں سے آئیں۔ جن کے پاس جو کچھ ہے وہ میرے پاس لے آتا ہے۔ ابی طالبؑ خود حفاظت فرماتے ہیں محمدؐ کی۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں ان سے بڑی بڑی باتیں نکلتی ہیں، کہ رات کو محمدؐ کو سلا دیتے اور جب رات کا حصہ گزر جاتا تو سوتے ہوئے رسولؐ کو گود میں اُٹھا کے دوسرے بستر پر لٹا دیتے۔ اور محمدؐ والے بستر پر اپنے بیٹے کو سلا دیتے کہ بے شک اچانک کسی حملے میں میرا بیٹا مر جائے مگر محمدؐ بچ جائے تو گویا ابی طالبؑ نے برسوں مشق کرا دی اپنے بیٹوں کو۔ محمدؐ کے خطرناک بستر پر سونے کی۔ اب اگر کہیں ابی طالبؑ کا بیٹا سوتا ہوا ملے یہ باپ کی ڈالی ہوئی عادت کی طاقت ہے۔ اسے مشق کرا دی تھی۔ اب ابی طالبؑ کی رحلت ہو جانے کے بعد جب رسولؐ کے پاس، بقول آپ کے دنیا کا سب سے بڑا فاتح خیبر موجود ہے اور

بقول مسلمانوں کے ''فاتح اعظم'' موجود ہے۔ اتنے بہادر کے ہوتے ہوئے ابی طالبؑ کے نہ ہونے سے مکے میں نہ رہے۔ اور جا رہے ہیں، مکے سے جا رہے ہیں۔ اور جانا بھی کیسا یہ نہیں کہ دن میں جا رہے ہیں، سب کے سامنے جا رہے ہیں۔ کہ چلو ہم جا رہے ہیں، یہ نہیں بلکہ رات کو چھپ کے جا رہے ہیں۔ سب کچھ چھوڑ کے رسولؐ مکے سے جا رہے ہیں۔

اب ایک بات میری بھی سن لیں۔ ہمارے مسلمانوں کے پاس ایک کتاب ہے جسے ہم مسلمان قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح مانتے ہیں۔ احادیث کی کتاب ہے بڑی عظیم کتاب ہے۔

سمجھے حضور!

اس کی جو عزت کوئی نہ کرے اسے بخار ہے۔ عظیم کتاب مسلمانوں کے پاس ہے۔ اس کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت ام المومنین ہم مومنوں کی مادرِ گرامی، عائشہ صدیقہ ارشاد فرماتی ہیں:

> ''اندھیری رات میں جب حضورؐ باہر سے بیت الشرف میں تشریف لاتے تھے۔ تو آپ کا چہرہ مبارک اتنا نورانی ہوتا تھا، اتنا روشن ہوتا تھا کہ ہم دن میں کھوئی ہوئی چیز جو سورج کی روشنی میں ہمیں نہیں ملتی تھی وہ حضورؐ کے چہرے کی روشنی میں اسے تلاش کرتے تھے۔''

ہم میں سے کس کی مجال ہے کہ جو اس بات کی تردید کر دے۔

اب بتاؤ میرے بزرگو!

جس شخص کا چہرہ پانچ چار سو گیسوں کی روشنی کے برابر ہو وہ رات کو چھپے کیسے؟ جس گھر میں وہ ہوگا وہ گھر روشن ہوگا کہ نہیں۔ حسبِ فرمان ام المومنین اس گھر میں روشنی ہوگی اور جب اس گھر سے جائے گا تو اس گھر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ اندھیرا ہوتے ہی سمجھ جائیں گے گھبرانے والے کہ وہ چلا گیا۔ اب اسے ضرورت ہے یا نہیں کہ جاتے وقت کسی

ایسے کو چھوڑ کے جائے کہ روشنی میں کمی نہ آئے۔ یہ ضرورت ہے یا نہیں۔ جب یہ انتظام بھی وہ کرے دوسری مصیبت یہ ہے، کہ ہاتھ میں لے لیں آپ گیس یا لالٹین اور رات کو چھپ کے جائیں آپ گلیوں میں۔ وہ لالٹین نہیں چھپنے دے گی، وہ روشنی نہیں چھپنے دے گی، وہ روشنی بتا دے گی۔ کہ ادھر گیا، اُدھر گیا، جس کا چہرہ ہزار پاور بلب سے بھی روشن ہو وہ رات کو کیسے چھپ کے چلے؟ اسے ضرورت ہے یا نہیں کہ کوئی تاریک نقاب اس کے ساتھ ہو جو اس کے نور کو چھپا کے لے چلے۔ اس کی ضرورت ہے یا نہیں تو ایک نور پاش کی ضرورت ہے۔ ایک نور پوش کی ضرورت ہے۔ گھر میں روشنی بھی رہے۔ اس حالت میں ہجرت کر کے جا رہے ہیں اور چلے گئے۔ گھر سے ہجرت کر کے جانا، اور پھر خدا کے حکم کے مطابق یقین ہے کہ میں واپس آؤں گا مگر مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں، اپنے شہر کو۔ میں اس شہر میں زندگی گزار رہا تھا۔ میں اس کی گلیوں میں کھیلتا تھا۔ بار بار مڑ کے دیکھتے ہیں اللہ تسلی دیتا ہے فکر نہ کر واپس آئے گا۔ یہ یقین تھا مگر بار بار شہر کو دیکھتے ہیں، اور تین چار دن تک غار ثور میں پوشیدہ رہے۔ وہاں رفیق سفر بھی ساتھ رہا جسے گھر سلا گئے تھے۔ اس کے ساتھ جو گزرنا تھی وہ گزرتی رہی۔

بہر نوع یہاں رفیق سفر ساتھ رہا۔ اب میرے مجمع میں شعرائے کرام بھی ہیں، میں تو مولوی آدمی ہوں۔ مولوی اور شاعری میں آپس میں بیر ہوتا ہے۔ شاعر مولوی نہیں ہوتا اور مولوی شاعر نہیں ہوتا۔ مجھے تو شاعری آتی نہیں۔ بالکل میں تو سیدھی سی بات کرتا ہوں۔ یہ جو ہجرت ہے نا! لفظ ہجرت عربی کا لفظ ہے۔ ہجر سے بنا ہے۔ یہ جو شبِ ہجرت ہے نا! اسے شبِ ہجر بھی کہتے ہیں ہجر کی رات یا ہجر کی رات۔ میں نے تو شاعروں کا کلام سنا ہے۔ وہ ہجر کی رات کو کوئی سو کے گزار دیتا ہے کوئی رو کے گزار دیتا ہے۔

شبِ ہجر کی یہی تاثیر ہے کہ کسی نے سو کر گزار دی یا کسی نے رو کر گزار دی۔ یہ کہتے ہیں شعراء شبِ ہجر کو۔

یہ بچے مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میری بات پر ہنس رہے ہیں، میرے بچو! جب میری

عمر میں آؤ گے تو پتہ چلے گا۔ تم پر بھی بچے ہنسیں گے۔ رات کو جب میں سوتا ہوں تو مجھے کھانسی آتی ہے۔ تو گھر بھر کے بچے کہتے ہیں بابا سونے بھی دے، بابا چپ بھی رہ، بابا رات بھر جھڑکیاں کھاتا ہے۔ اوہ بابا! خاموش رہو، کیوں شور مچاتا ہے؟ آرام بھی کرنے دو اور جوان! سبحان اللہ شام کو اگر چادر تان کے سوتا ہے تو صبح تک انگڑائی نہیں لیتا۔ جوانی کو ساری رات سونا اور صبح کو پھر مرضیوں کے مالک۔ بوڑھا بے چارہ رات بھر جھڑکیاں کھاتا ہے۔ میں تو اب کہتا ہوں، کہ اچھا کہ اللہ میاں اُٹھا لے۔ ورنہ دو چار سال کے بعد بچے کہیں گے کہ بابا بیٹھ بھی جا کسی بندے کو بات کرنے دے۔ ایسا آدمی تو منبر پر بھی نہیں سجتا اور جب بچہ ٹوک دے تو اسے کہنا پڑ جاتا ہے میں کب خود منبر پر بیٹھا ہوں؟ کسی نے بٹھایا میں بیٹھ گیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تم میرا کیوں مذاق اُڑاتے ہو۔ بہر حال ہجرت کرنا پڑ گئی۔ مدینے پہنچ گئے اور اب میں بالکل مختصر کرتا ہوں۔ مدینہ شہر کے باہر قیام کیا اور جسے گھر چھوڑ آئے تھے جب آ گیا وہ واپس تو اسے ساتھ لے کر شہر مدینہ میں داخل ہوئے۔ اور تاریخ کا تو مجھے پتہ نہیں۔

علامہ ابن خلدون کی تاریخ کو پڑھا۔ بڑی معتبر صحیفہ آسمانی مانا جاتا ہے۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ جب مدینے میں گئے تو شہر کے سب لوگ اس بات کے خواہش مند تھے کہ حضورؐ ہمارے گھر قیام کریں۔ ہمارے گھر قیام کریں۔ تو آپؐ نے کہا: ٹھہرو۔ آپؐ نے ایک ناقہ سجایا۔ بیچ میں جو اونٹنی ابھی تازہ خریدی تھی۔ کوئی بڑا ہوشیار قسم کا اونٹ کا تاجر تھا۔ رسولؐ کو مل گیا تھا جس نے دو سو کی اونٹنی نو سو میں بیچ دی تھی۔ اس اونٹنی کو سجایا آپ نے اور اس اونٹنی پر۔

یہ علامہ ابن خلدون کی بات کر رہا ہوں۔ میں اپنے بھائی علیؑ کو جسے چھوڑ آئے تھے مکے اسے سوار کیا اور خود پیدل اور سارا مجمع مہاجر و انصار کا پیدل۔ اس کے ساتھ ساتھ حضور چل رہے تھے کہ چلو بھئی شہر میں۔ گویا پہلا کام ہجرت میں۔ مدینے میں یہ کیا کہ داماد کا جلوس نکالا اور لوگوں سے یہ کہہ دیا کہ مدینے والو! یہ اونٹنی جس کے گھر کے سامنے بیٹھ

جائے گی، بس ہم اس کے گھر مہمان ہو جائیں گے۔

چنانچہ اونٹنی چلی جارہی ہے، ہر گھر والے کی خواہش ہے کہ اونٹنی یہاں بیٹھے، جب اونٹنی وہاں سے گزر جاتی ہے تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ مدینے میں ایسی تھی۔ کہ وہاں کچھ آدمی ویران سی جگہ پر کھجوروں کے درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسی جگہیں عموماً دیہات میں ہوا کرتی ہیں، وہاں اونٹنی بیٹھ گئی۔ جب اونٹنی بیٹھ گئی تو حضورؐ نے کہا کہ یا علیؑ اُترنا نہیں بیٹھے رہو۔ وہ بیٹھے رہے۔ اونٹنی تھوڑی دور آگے چلی، واپس لوٹی اور پھر آ کے اسی جگہ بیٹھ گئی۔ آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ تمہیں یقین ہو گیا ہے نا کہ یہ اونٹنی بحکم خدا یہاں بیٹھی ہے۔ جی ہاں، اب علیؑ اُتر آؤ، علیؑ اُتر آئے۔ گویا علیؑ کے قدم جو پہلی دفعہ مدینہ کی زمین پہ آئے اس ویران زمین پر آئے جہاں اونٹنی بیٹھی تھی۔ اب دیکھنا ہے، اب دیکھنا ہے اس زمین کا بنے گا کیا؟ رسولؐ نے زمین اس کے مالکوں سے لے کر وہاں مسجد بھی بنادی۔ بن گئی مسجد، مسجد نبوی ہے۔ دنیا اس کا احترام کرتی ہے۔ اب اگر ہم یہ کہہ دیں کہ یہ ہے قدموں کی تاثیر۔ جہاں پہلا قدم رکھ دیں۔ جگہ خانہ خدا بن جاتی ہے۔ مکے میں قدم رکھ دیں یا مدینے میں، وہ خانہ خدا بن جاتی ہے۔

قریب حضرت ابوایوب انصاریؓ کا گھر تھا۔ وہ سامان گھر لے گئے۔ دوسرے اور اصحاب جو ساتھ تھے سب بیٹھ گئے، بڑی شان سے رہنے لگے۔ اب مدینے کی شان ہی اور تھی۔ اب مدینے میں رہنے والوں کا انداز ہی اور تھا۔ حضورؐ آ گئے مدینے میں، پھر کیا ہوا؟ مدینے کی قسمت ہی بدل گئی۔ اس کی آبرو ہی بدل گئی۔ اس کی شان ہی بدل گئی۔ جسے پہلے یثرب کہتے تھے وہ اب طیبہ کہلانے لگا۔ رسولؐ کے آنے سے پاک سرزمین ہو گئی۔

اب حاجی جاتے ہیں نا! حج کرنے۔ اس وقت تک حج مکمل نہیں ہوتا جب تک مدینے کی زیارت نہ کر آئیں۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ جس نے حج کیا اور میرے سلام کو مدینے نہ آیا اس نے مجھے راضی نہیں کیا۔ ہمارے پنجاب میں قبلہ ایک زمیندار ہے ضلع مظفر گڑھ میں۔ وہ نیا نیا شیعہ ہو گیا ہے۔ میرا بڑا مہربان دوست ہے۔ اس کے خاندان

نے جب یہ دیکھا، کہ یہ ماتم کرنے لگ گیا ہے۔ یہ شیعہ ہو گیا ہے۔ وہ سمجھے کہ یہ گیا۔ وہ اسے ٹھیک کرنے کے لیے۔ پھر واپس لانے کے لیے مکے لے گئے۔ حج کو لے گیا۔ وہاں جا کے یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ بے دین ہو گیا ہے۔ ماتم کرنے لگا ہے۔ وہ چلا گیا ان کے ساتھ۔ جب مدینے لائے اور رسولؐ اکرم کے روضے پہ لائے کہ قبلہ اسے ٹھیک کر دو۔ یہ بے دین ہو گیا ہے۔ اس نوجوان نے قبر رسولؐ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہؐ! میں حج کرنے نہیں آیا یہ مجھے زبردستی لے آئے ہیں۔ میں تو آپؐ سے بات کرنے آیا ہوں، صرف بات کرنے آیا ہوں۔ میں تو آپ کو بچوں کا پرسہ دینے آیا ہوں۔ آپؐ کے گھر کو لوٹ لیا گیا۔ قبلہ یہ تو حج کے نام سے آئے ہیں۔ میں تو پرسہ دینے آیا ہوں کہ آپؐ کے بعد آپؐ کے بچوں پر کیا گزر گئی۔ وہی مدینے کا شہر جس میں جانا آج باعثِ برکت ہے۔ اور اس میں رسولؐ آباد ہیں۔ اور آبادی بھی وہ شان کی آبادی کہ سبحان اللہ کہ جس طرح شریف ترین گھرانہ آباد ہوتا ہے۔ بچے بھی ہیں مستورات بھی ہیں۔

رسولؐ کا گھر آباد ہے۔ عجب شان ہے پھر ایسا اجڑا کہ آج تک پھر نہ آباد ہوا۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ ساٹھ سال بعد یہ انقلاب آیا کہ جنہوں نے آ کے مدینے کو عزت بخشی تھی۔ وہ مدینے سے جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آج جا رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں؟ کدھر جا رہے ہیں؟ کب واپس آئیں گے؟ کیوں جا رہے ہیں؟

میں اپنے بیان کو مختصر کرتا ہوں۔ یہ میرے گھر کی کہانی ہے۔ تو جس دن جانے کا دن آیا ہے نا! جانا ہے آج اس دن صبح سے بنی ہاشمؑ کے محلے میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ تمام عورتیں مدینہ کی موجود ہیں۔ تمام بچے موجود ہیں۔ تمام بڑے موجود ہیں۔ کوئی ملکہ عالم حضرت زینبؑ سے گفتگو کر رہی ہیں۔ بی بی خیال رکھنا پردیس کا معاملہ ہے۔ بچے ساتھ ہیں۔ کوئی بیوہ حسنؑ سے بات کر رہی ہیں۔ کوئی ربابؑ سے مل رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اصغرؑ کا خیال رکھنا۔ بڑا لمبا سفر ہے۔ مدینے سے باہر نوجوان ہیں۔ وہ قمر بنی ہاشمؑ کو گھیرے کھڑے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کبھی حسینؑ کو نہ جانے دیتے مگر اس لیے ہمیں

اطمینان ہے کہ تم ساتھ جا رہے ہو۔ ہمیں حوصلہ ہے۔ نوجوان نوجوان کو رخصت کر رہے ہیں، اور حسینؑ مسجد رسولؐ میں ہیں۔ وہاں تشریف فرما ہیں اور جو بزرگ ہیں رسولؐ کے وفادار صحابی، وہ حسینؑ کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ حسینؑ خاموش بیٹھے ہیں۔ حسینؑ جا رہے ہیں۔ حسینؑ کہہ رہے ہیں کہ میرے بزرگو! میرے ناناؐ کے صحابیو! میری مجبوری ہے۔ میں مجبوری سے جا رہا ہوں۔ اتنے میں آ کے قمر بنی ہاشمؑ عرض کرتے ہیں کہ مولاؑ! اگر آج ہی جانا ہے تو عصر کا وقت ہو گیا ہے۔ اگر حکم ہو تو مستورات کو ان کی سواریوں میں بٹھایا جائے۔ آپؑ نے فرمایا کہ ہاں بسم اللہ مستورات کو بٹھاؤ۔ اب جتنے ہاشمی جوان تھے سب موقعے موقعے پر کھڑے ہو گئے محلے کے۔ جہاں جہاں موقعہ تھا۔ آج محلے والوں سے کہہ رہے ہیں کہ راستہ بند ہیں۔ اب کوئی نہ گزرے اب اہل بیتؑ سوار ہوتے ہیں۔ اب مستورات سوار ہو رہی ہیں۔ ایک ناقہ دروازے پر لایا جاتا اور اس پر لا کے بٹھاتے اور باہر دروازے پر آواز دی جاتی کہ بیوہ حسنؑ کی سواری آتی ہے۔ یہ کون ہے؟ یہ جناب ربابؑ کی سواری ہے۔ یہ کون ہے؟ یہ زوجہ مسلمؑ کی سواری ہے۔ یہ کون ہے؟ یہ فلاں کی سواری ہے۔ یہ فلاں کی سواری ہے؟

تو ہر بی بی سوار ہوتی۔ ناقہ اُٹھتا۔ آگے بڑھ جاتا۔ سب سے آخر میں آواز آئی سب کے کانوں میں قمر بنی ہاشمؑ کی زوردار اور گرج دار آواز آئی: مدینے والو! ہوشیار۔ دیکھو کوئی شخص اپنے مکان کی چھت پر نہ چڑھنے پائے۔ اپنے اپنے بچوں کو خاموش کرو۔ کوئی آواز آئی، کیونکہ اب ثانی زہراؑ باہر آ رہی ہیں۔ اب عصمت کبریٰؑ کی سواری باہر آ رہی ہے۔ اب زینبؑ عالیہؑ سوار ہو رہی ہیں، اور ناقہ لا کے بٹھا دیا دروازے پر۔ آواز دی کہ خبردار ہوشیار اب زینبؑ سوار ہو رہی ہیں محمل میں اور امامؑ جو مسجد میں بیٹھے تھے وہ اپنے بزرگوں سے کہتے ہیں کہ بزرگو! ذرا مجھے معاف کرنا میں تم سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔ میں ذرا خود کھڑے ہو کر زینبؑ کو سوار کرا دوں۔ محمل پر بٹھا دوں۔ ایک فقرہ کہنا ہے بزرگو آپ سے آج اور بس یہ فقرہ ہی یاد رکھنا اور جب یاد آئے رو لیا کرنا۔

تھوڑی دیر میں عام عورتوں نے درود پڑھنا شروع کر دیا۔ کسی نے بسم اللہ کہنا شروع کر دیا۔ کوئی قرآن ہاتھ میں لیے کھڑی ہے۔ ناقہ اور دروازے کے قریب آ گیا۔ بالکل دروازے کے قریب بیٹھا دیا گیا اور حضور والا! عونؑ و محمدؑ نے بڑھ کے محمل کا پردہ اُٹھایا۔ ایک بازو پھوپھی کا علی اکبرؑ کے ہاتھ میں اور ایک بازو حضرت سید الشہداءؑ کے ہاتھ میں اور خاموشی سے تشریف لائیں اور محمل کے بالکل قریب آ گئیں۔

بس یہی فقرہ ہے جو میں نے کہنا تھا اور آج کی مجلس کا حاصل ہے۔ کہا کہ حسینؑ! بھائی میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ علی اکبرؑ بیٹا تم بھی چھوڑ دو۔ کیوں کچھ تکلیف ہے۔ کہا کہ نہیں صرف یہ کر دو کہ میرے بیٹے زین العابدین کو لے آؤ۔ علی زین العابدینؑ تم آؤ، آؤ تم مجھے سوار کراؤ۔ جب سوار ہو چکیں تو لوگوں نے دیکھا کہ دیوار سے سر لگائے حسینؑ رو رہے ہیں اور زار زار رو رہے ہیں۔

قبلہ! کیا وطن کی محبت یاد آ گئی؟ کہا: نہیں نے زینبؑ کے سوار ہونے نے کوئی منظر یاد دلا دیا۔ زینبؑ سوار ہو گئی، اور اس کے بعد فوراً ویسی ہی سواری آئی۔ امامؑ نے کہا کہ ٹھہر وہ میری اماں کی سواری ہے۔ یہ میری فضہؑ کی سواری ہے۔ خدا آپ کی مجلس کو قبول کرے۔ آپ کی عزت کو برقرار رکھے۔ آج کی مجلس ختم ہو گئی۔ مدینے سے عزت سے سوار ہو کر چلی اور آج کربلا میں عزت سے آ کر اُتری۔ خدا آپ کی عزت کو برقرار رکھے۔ اب پردہ نشین خواتین جو ہیں وہ دعا مانگیں کہ اللہ زینبؑ کی عزت رکھے۔ پردیس کا معاملہؑ ہے۔ ابھی اسے بڑا لمبا سفر کرنا ہے۔ آج کی مجلس یہیں ختم ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ اللہ آپ کے گھروں کو آباد رکھے۔ تم مجلس سن کر اپنے گھر جاؤ گے۔ تم آباد گھر میں جاؤ گے۔ آباد گھر آباد رہیں گے اور عزاداری میں تم شریک رہو اور اللہ تمہیں دنیا کے آشوب و انقلاب سے محفوظ رکھے۔

آلِ ابی طالبؑ

فضائل ..... آل ابی طالبؑ

مصائب ..... شہزادہ علی اکبرؑ

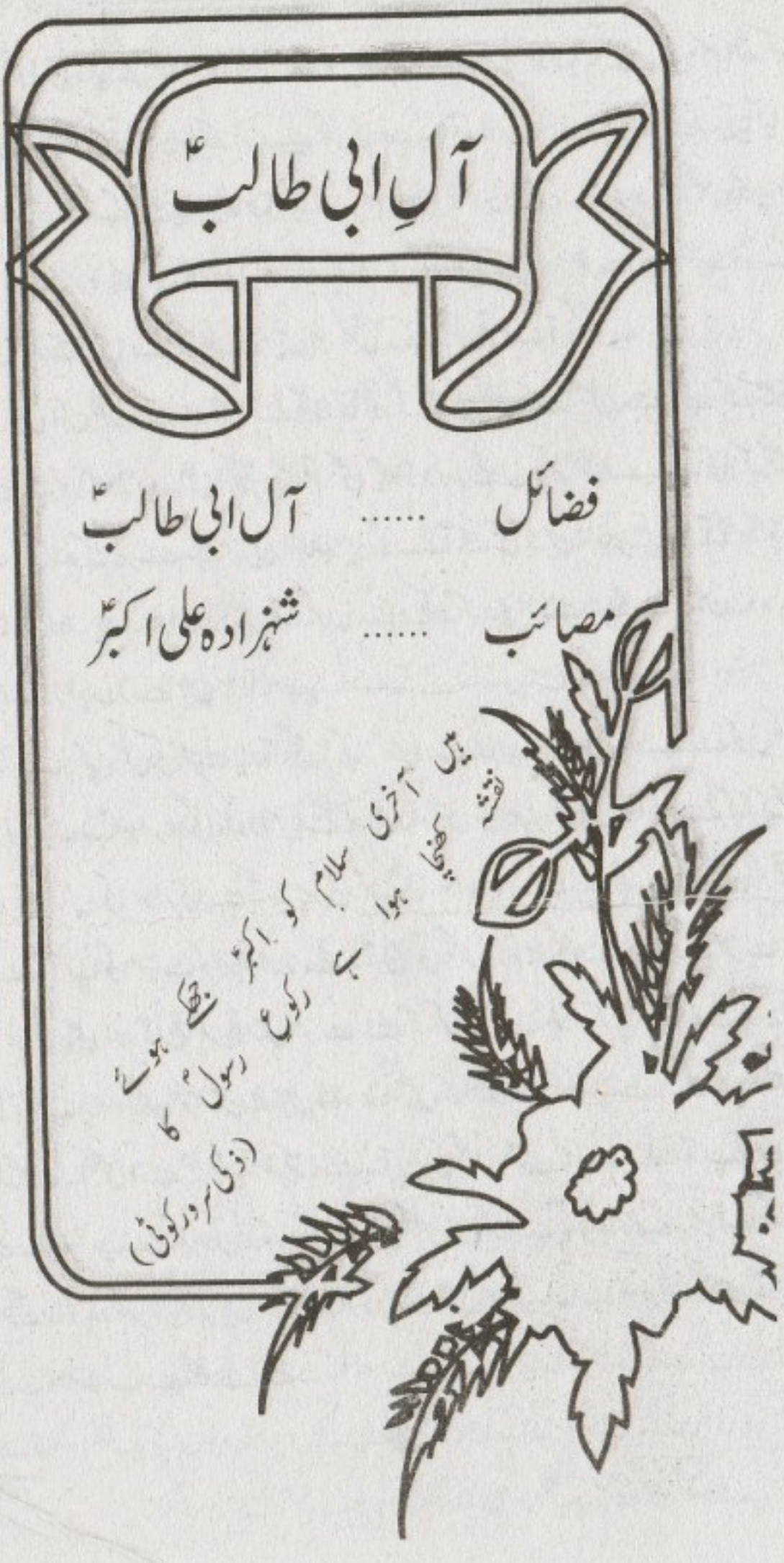

آلِ ابی طالب

(یہ مجلس دربار شاہ چن چراغ راولپنڈی میں پڑھی گئی)

خداوند عالم کی حمد وثنا اور حضرات محمد وآلِ محمد علیہم والسلام پر درود وسلام کے بعد۔ اس طرح گزارش کرتا ہوں کہ اللہ اپنے علم وفضل کے مطابق اپنا جو کام لینا چاہتا ہے، کسی انسان سے اس کام کے مطابق آدمی وہ خود چن لیتا ہے۔ اس سے میں نے یہ کام لینا ہے۔ اس سے یہ کام لینا ہے۔ انسان، خدا خود انسانوں میں سے چن لیتا ہے اپنے کام کے لیے۔

سمجھ رہے ہیں ناصاحبان!

اللہ کے یہاں الیکشن نہیں، اللہ کے ہاں سلیکشن ہے۔ اب میں انگریزی لفظوں کے معنی تو جانتا نہیں، سنے ہوئے میں نے کہہ دیئے ہیں۔ ہم لوگ کرتے ہیں الیکشن اور اللہ کرتا ہے سلیکشن۔ ہم بہت سے مل کر چنتے ہیں ایک کو اور اللہ چنتا ہے، بہت سوں میں سے ایک کو۔ سلیکشن کا ترجمہ چننا اور الیکشن کا ترجمہ چھانٹنا۔ جو بندہ سلیکشن سے آئے وہ چنا ہوا ہوتا ہے، جو الیکشن سے آئے وہ چھٹا ہوا ہوتا ہے۔

بہرنوع اللہ چن لیتا ہے اپنے کام کے لیے اس آدمی کو جسے وہ موزوں سمجھتا ہے۔

توجہ ہے ناصاحبان!

اور اس بڑی مختصر سی تمہید کے بعد میں اپنی مجلس شروع کرتا ہوں تاکہ تھوڑے وقت میں ختم ہو۔

میرے محترم سامعین!

اللہ نے اپنا کام لینے کے لیے جس خاندان کو چن لیا، وہ خاندان بنی ہاشم کہلاتا ہے۔ اس خاندان کو اللہ نے چن لیا تھا۔ اس لیے کہ اس خاندان سے وہ اپنا کام لینا چاہتا تھا۔ اس لیے یہ خاندان اللہ نے چن لیا۔ اور اس بنی ہاشم کے خاندان میں سے بھی ہر فرد سے کام نہیں لیا، بلکہ اس خاندان کا جو فرد کسی کام کے لیے موزوں ہوا وہ کام اللہ اس فرد سے لیتا رہا۔ عبدالمطلب سے کعبے کی حفاظت کا کام لیا، جب ابرہہ آیا تھا، ہاتھی لے کر۔ اور عبدالمطلبؑ کے بعد ان کے جانشین حضرت ابو طالبؑ سے جن کا نام نامی ہے عمرانؑ۔ کنیت ہے ابو طالبؑ۔ جن کے خطابات ہیں بیضۃ البلد، شیخ البطحا، سید القوم۔ یہ ان کے خطابات ہیں۔ سب سے پہلے عرب میں لفظ سید جناب ابو طالبؑ کے لیے استعمال ہوا۔ اور آج تک ان کی نسل کے ساتھ یہ لفظ مشہور ہو گیا۔

جناب ابو طالبؑ سے بھی کام لیا اللہ نے اور یہ کام ابی طالبؑ کے سپرد ہوا، کہ میرے رسول کو جو میری اس تمام مخلوق میں سب سے زیادہ معزز اور قیمتی ہے۔

لے ابو طالبؑ! ہم اس کو تیرے سپرد کرتے ہیں۔ تم اسے پالو اور پرورش کرو۔

توجہ فرمائی ناصاحبان!

اللہ نے اپنی سب سے قیمتی شے سپرد کر دی ابو طالبؑ کو۔ یہ فقرہ آپ نے سن لیا۔ اس کی ذرا تشریح کر دوں آپ سے۔ میرے ہاتھ میں یہ ململ کا رومال ہے۔ پتہ نہیں آٹھ آنے کا ہے یا چھ آنے کا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہو گا چھ چار آنے کا۔ میں چاہتا ہوں یہ رومال کسی کے سپرد کر دوں۔ اب اتنا مجمع ہے میرے سامنے۔ سب ماشاء اللہ مومن ہیں۔ میں نے یونہی ہاتھ بڑھا کے ایک آدمی کو دے دیا رومال۔ اب مجلس کے بعد پوچھتا پھرتا ہوں۔ بھئی میرا رومال کس کے پاس تھا، کہاں ہے؟ کون لے گیا میرا رومال؟ لوگ کہیں گے زیدی صاحب، تم نے خود غلطی کی۔ کسی جانے پہچانے کو دینا تھا، کسی ایماندار کے سپرد کرنا تھا، کسی شریف آدمی کے سپرد کرنا تھا۔ جب ایک کپڑے کا رومال سپرد کرتے ہوئے

جان پہچان دیکھنی پڑتی ہے، ایمانداری دیکھنا پڑتی ہے۔ شرافت دیکھنا پڑتی ہے تو اللہ نے محمد جیسی قیمتی شے سپرد کرتے وقت یہ نہیں دیکھا ہوگا، کہ یہ بندہ شریف ہے یا نہیں؟ ایماندار ہے یا نہیں؟ اور اللہ جسے اتنا ایماندار سمجھے کہ محمد جیسی شے سپرد کردے، ایسے ایماندار کو بے ایمان کہنا، بے ایمانی ہے کہ نہیں؟ بہرنوع یہ تو کام اللہ نے ابی طالبؑ کو دیا اور ابی طالبؑ نے اپنی گود میں نبوت کو بھی پالا، امامت کو بھی پالا گویا زیر دامن ابی طالبؑ پل کر نبوت آخری نبوت بن گئی۔ اور امامت پہلی امامت بن گئی۔ ابی طالبؑ کی پرورش کے بعد تو یہ کام اللہ ابی طالبؑ سے لے رہا تھا۔ اور آج تک خدا کا کام نسل ابی طالبؑ کے سپرد ہے۔ اور اللہ کی بگڑی بنانے کے لیے۔ آج بھی ابی طالبؑ کا کنبہ دنیا میں زندہ ہے۔ اور قائم۔ یہ کام اللہ نے ابی طالبؑ کے سپرد کیا۔

میری بات پہ توجہ ہے نا صاحبان!

بڑی مختصر بات ہے۔ ادھر ابی طالبؑ تھے قبل کہ آتے ہی سامنے شیطان آ گیا۔ ابراہیمؑ کے آتے ہی سامنے نمرود آ گیا۔ موسیٰؑ کے سامنے فرعون آ گیا۔ اس خاندان بنی ہاشمی کے مقابلے پر خاندان نبیؐ آیا۔

وہی آ گیا جو آپ کہہ رہے ہیں۔ یہ خاندان آ گیا۔ اس خاندان میں بھی بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے۔ بڑے بزرگ آدمی پیدا ہوئے۔ ایک صاحب فرماتے تھے کہ جتنے بڑے آدمی پیدا ہوئے، وہ سب اس خاندان میں ہوئے۔ وہی خاندان جس کا نام آپ لے رہے ہیں، بنی ہاشم میں کوئی بڑا آدمی نہیں پیدا ہوا۔ میں نے کہا: بالکل، بنی ہاشم میں تو جو پیدا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ امیہ کے خاندان میں جو پیدا ہوا وہ بڑا پیدا ہوا۔ یہ خاندان بنی ہاشم کے مقابلے کا خاندان ہو گیا۔ وہ دن تھے تو یہ رات تھے۔ اس خاندان میں بھی بڑے بڑے آدمی تھے۔ اس خاندان میں بھی بڑے بڑے آدمی تھے۔ اس خاندان کے بڑے بڑے آدمیوں میں سے ایک بڑے آدمی کا نام لیتا ہوں وہ تھے حضرت ابی سفیان۔ نام سنا ہے نا آپ نے؟

حضرت میں نے اس لیے کہا کہ بڑے حضرت تھے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے فضائل بیان کردوں۔ حضرت ابوسفیان کے سنیں گے آپ؟ فضائل پڑھوں؟ لو صاحبان! اس ایک جملے پر فضائل ختم کرتا ہوں۔ یہ یزید کے بھی دادا تھے۔ یہ ان کے فضائل ہیں۔ یزید کے دادا جان، حضرت ابوسفیان یہ اس خاندان میں پیدا ہوئے۔ جتنی جنگیں رسالت مآبؐ سے ہوئیں ان سب جنگوں میں کفر کی فوج کے سپہ سالار یہی حضرت ابوسفیان ہوا کرتے تھے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

مکہ کی فتح کے بعد اسلام کا اعلان کر دیا اور یہ بدلنے لگے۔

میرے محترم سامعین!

بڑے غور سے سننا شروع کرنا اب میں مطلب کی بات سناتا ہوں آپ کو تا کہ اپنے وقت میں مجلس بھی ختم ہو جائے اور بات بھی ختم ہو جائے۔ اس حضرت ابوسفیان کے تین چار بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک شہرۂ آفاق بیٹا، وہ ہے امیر شام، یزید کے والد بزرگوار۔ یہ ان کا شہرۂ آفاق بیٹا ہے، ابوسفیان کا۔

سمجھے حضور!

نام یاد نہیں، ہوگا کئی نامور بیٹے تھے اور جناب کئی بیٹیاں بھی تھیں ان کی۔ اس وقت مجلس میں مجھے آپ کی فرمائش پوری کرنے کے لیے ان دو بیٹیوں کا تذکرہ آپ کو سنانا ہے۔

یہ آپ سنیں اور غور سے سنیں۔

ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام تھا ام حبیبہ، ایک کا نام تھا جامد یہ۔

یاد رہے گا آپ کو؟

ایک ام حبیبہ ایک جامد یہ۔ یہ جو حضرت ابوسفیان کی بیٹی تھی نام ام حبیبہ، ان کی شادی ہوئی تھی حضور سرور کائناتؐ سے۔ ابوسفیان کی بیٹی اور ہم مومنوں کی ماں، جناب ام

حبیبہ، ام حبیبہ ہماری ماں تھیں۔ ان کے باپ سے ہمارا کیا رشتہ ہوا؟ سنو گے؟ کسی نے مجھ سے پوچھا: ام حبیبہ تو تمہاری ماں ہیں، ان کے باپ سے کیا رشتہ ہے؟ میں نے کہا: نا، نا۔ بہرنوع یہ ام حبیبہ حرم رسولؐ ہیں، ام المومنین ہیں۔ واجب الاحترام ہیں۔ رسول کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اور ہم مومنوں کی ماں ہیں اور ہمارے دلوں میں ان کی بڑی عزت ہے ماں ہونے کی حیثیت سے۔

سمجھے نا آپ؟

ان کے فضائل کتابوں میں بھرے پڑے ہیں، بہ حیثیت ام المومنین کے مگر سب سے بڑی فضیلت ان کی جو مسلمانوں نے کتابوں میں لکھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جناب ام حبیبہؓ ایک دن رسولؐ کے گھر بیٹھی تھیں، ان کے باپ ابوسفیان ان سے ملنے آئے۔ وہ مسلمان تھے نا۔ مسلمان ہونے کے بعد یہ شادی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے حجرے میں قدم رکھا۔ آ کے کہا بیٹی خیریت تو ہے جب باپ آتا ہے۔ ملنے تو بیٹی نے جو دری بچھ رہی تھی وہ سمیٹ دی۔ زمین پر اشارہ کیا کہ ابا بیٹھو، تشریف رکھو۔

کہا: دیکھو! ام حبیبہ! تم نے ہماری بڑی توہین کی ہے۔ جانتی ہو ہم کون ہیں؟ ہم عرب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ہم لاکھوں فوجیں لے کر آئے تھے مقابلے کے لیے۔ دنیا ہمارا کلمہ پڑھتی ہے۔ ہمیں دیکھ کر شیطان تک بھاگتا ہے۔ تم نے ہمیں کیا سمجھا ہے۔ یہ دری کیوں سمیٹ دی؟ ہمیں بیٹھنے نہیں دیا۔ ام حبیبہ نے بڑے ادب سے کہا: جناب! بات یہ ہے کہ یہ دری وہ ہے جس پر رسولؐ بیٹھتے ہیں۔ اس پر آپ اس طرح نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ واقعہ لکھ کر مسلمان مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ ہے اس کے کامل الایمان ہونے کی دلیل۔ یہ ہے اس کے ام المومنین ہونے کی دلیل۔ میں بھی سٹیج پر یہی کہتا ہوں کہ وہ ام حبیبہ، ام المومنین ہو تو ایسی ہو کہ رسول اللہؐ کی جگہ پر باپ کو نہ بیٹھنے دے۔ یہ ہے شان ام المومنین۔

سمجھے رہے ہو نا صاحبان اور میرے محترم سامعین!

آپ کو سلامت رکھے اور خوش رکھے۔ میں ایک بات آپ سے بیچ میں ضمناً کہتا

چلوں چونکہ جلدی ختم بھی کرنا ہے اور بات بھی کرنی ہے۔ آپ پوچھیں گے کس کتاب میں ہے؟ کہیں نہیں۔ یہ حوالہ کہاں ہے؟ کہیں نہیں۔ یہ میں اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں۔ پہلے ہی بتائے دیتا ہوں۔ اگر اس پر کوئی اعتراض ہے تو وہ مجھ پر ہے۔ یہ میرے مذہب کی کسی کتاب کی بات نہیں ہے کہ قیامت کے دن ایران کا شہنشاہ نوشیرواں جس کے لیے کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ جہنم میں جائے گا۔ بوجہ کافر ہونے کے۔ اللہ اسے ایک پنکھا عطا فرمائے گا جو آگ کو اس سے دور رکھے گا۔ یہ اسے عدالت کا صلہ ملے گا۔ یہ تو کتابوں کی بات ہے اور میں اپنی بات کہتا ہوں۔ یہ پنکھا ملے گا۔ اسے کیسے؟ جب فرشتے لے جا رہے ہوں گے اسے جہنم میں، یہ میری ذاتی بات ہے اور یہ جاتے جاتے کہہ دے گا ''جہنم میں تو میں چلا جاؤں گا، پر جانے سے پہلے میں ذرا اپنے نواسے سے ملنا چاہتا ہوں'' اس کے نواسے تھے زین العابدینؑ۔ زین العابدینؑ سے اس کا آمنا سامنا ہو جائے گا اور یہ زین العابدینؑ سے کہے گا تم میرے نواسے ہو۔ فرشتے خود شرما جائیں گے۔ اس کو جہنم میں لے جاتے ہوئے۔ اللہ جس کو بچانا چاہتا ہے اس کے گھر نواسہ پیدا کر دیتا ہے اور جس کے گھر نواسہ نہ ہو اس کا کوئی بچانے والا نہیں، کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔

یہ جناب ام حبیبہ کی بات آپ کے ذہن میں آ گئی۔ اب اسے میں پلٹ کے دوسری بہن کا قصہ سناؤں۔ جس طرح عرب ہاشم شرافت میں مشہور تھے۔ اور ان کا مقابل خاندان سیاست میں مشہور تھا۔ یہ لفظ میں نے احتیاطاً کہا ہے، سیاست میں۔ اسی طرح عرب میں ایک خاندان تھا۔

جو حسن میں مشہور تھا۔ اس کا نام تھا خاندان بنی ثقیف۔

یاد رہے گا آپ کو۔ خاندان بنی ثقیف حسن میں مشہور تھا اور خاندان بنی کلاب یہ شجاعت میں مشہور تھا۔ یہ عرب کے مشہور خاندان تھے۔ اگر بہادر کا نام لو وہ بنی کلاب سمجھے جاتے تھے۔ اگر حسین کہو تو بنی ثقیف سمجھے جاتے تھے۔ اگر شریف کہو تو بنی ہاشم گنے جاتے تھے۔ اگر مکار کہو تو پھر وہ، یہ تھے مشہور عرب کے خاندان تو۔ بنی ثقیف کے خاندان کا رئیس

اور جو شیخ تھا اس کا ابومرہ نام تھا۔ ابومرہ ثقفی۔ حضرت ابوسفیان کی دوسری بیٹی، ام حبیبہ کی سگی بہن ابومرّہ ثقفی سے بیاہی ہوئی تھی تو ابومرہ ثقفی، خاندان ثقیف کا سردار اور رسالت مآب آپس میں کیا ہوئے؟

بھئی بولو!

وہ آپس میں ہم زلف ہوئے۔ ایک بہن ابومرہ ثقفی کے گھر میں تھیں اور ایک بہن جناب رسالت مآبؐ کے گھر میں۔

آپ گھبرا تو نہیں گئے میری بات سے۔ سن رہے ہو نا غور سے؟

رسالت مآبؐ کے گھر تو اولاد نہیں ہوئی جناب ام حبیبہ سے۔ ابومرہ ثقفی کے گھر جو ابوسفیان کی صاحبزادی تھی ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی، سمجھے نا! ایک لڑکی پیدا ہوئی سمجھے نا! ایک لڑکی پیدا ہوئی ابومرہ ثقفی کے گھر۔ ابوسفیان کی بیٹی، امیر شام کی بہن، ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام تھا لیلیٰ۔

اب یاد رکھیں گے نا!

لیلیٰ ابومرہ ثقفی کی بیٹی، ابوسفیان کی نواسی، امیر شام کی بھانجی تھیں۔ یہ یزید کی کیا ہوئیں؟ بولو نا! بولو بھئی امیر شام کی بھانجی تھیں۔ یہ یزید کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ حقیقی پھوپھی زاد بہن، جناب لیلیٰ یہ ہوئیں جناب لیلیٰ۔ اب یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آ گئی نا! بومرہ ثقفی کی جو لڑکی تھی ان کا سفیان سے کیا رشتہ تھا بھئی؟ نواسی کا۔ امیر شام کی کیا تھیں وہ؟ بھانجی۔ یزید کی کیا تھیں؟ پوپھی زاد بہن۔ کس خاندان سے تھیں؟ بنو ثقیف کی صفت کس بات کی تھی؟ حسن و جمال کی، تو لیلیٰ اپنے زمانے میں رئیس بنی ثقیف کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے ان تمام خوبیوں کی مالک تھیں جو اس خاندان کی تھیں۔

سمجھ میں آ رہا ہے نا صاحبان کے!

جب یہ جوان ہوئیں لیلیٰ تو ان کے باپ کو شادی کی فکر ہوئی۔ اس نے چاہا کہ میں اپنی لڑکی کی شادی کروں۔ جہاں جہاں بیٹھے ہیں بڑے غور سے سننا بات کو۔ وہ اپنے

گھوڑے یا ناقے پہ سوار ہوا حضور اور مدینے آیا۔ وہاں مدینے کی مسجد میں حضور سید الشہداء امام حسینؑ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس ابو مرہ ثقفی کی، امام حسینؑ سے وہ ملا۔ آ کے خدمت میں امام حسینؑ کی وہ بیٹھ گیا اور بیٹھ کے عرض کیا اس نے کہ قبلہ میں ایک دفعہ آپؑ کے نانا کے پاس بھی آیا تھا۔ میں نے آپؑ کے نانا سے ایک حدیث سنی تھی۔ وہ مجھے پوری طرح یاد نہیں رہی، میں آپؑ کو وہ سناتا ہوں۔ اگر کہیں بھی بھول جاؤں تو قبلہ آپؑ تصحیح فرمادیں۔ آپؑ نے کہا: ہاں سناؤ کیا ہے؟ اس نے کہا: آپؑ کے نانا نے یہ فرمایا تھا کہ اگر تمہیں کوئی مشکل پیش آئے تو ایسے شخص کے پاس جانا مشکل کو حل کرانے کے لیے جو تمہارے علاقے میں، تمہاری دسترس میں سب سے زیادہ عالم ہو۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے تجھے صحیح یاد ہے۔ یہی کہا تھا میرے نانا نے۔

اس نے کہا: قبلہ آگے بھی ہے کہ ہاں۔ کیا؟ کہ آگے فرمایا تھا آپؑ کے نانا نے کہ اگر عالم تمہیں نہ مل سکے تو، ایسے شخص کے پاس جانا جو حسب اور نسب میں سب سے زیادہ شریف ہو۔ اس نے کہا: حضور ٹھیک ہے؟ آپؑ نے فرمایا: بالکل ٹھیک ہے۔ تو نے ٹھیک کہا۔ اس نے کہا: حضور آگے یہ کہا تھا کہ اگر حسب نسب والا نہ ملے تو ایسے بندے کے پاس جانا جو سب سے زیادہ حسین ہو تیری نظروں میں۔ آپؑ نے فرمایا: ہاں، ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ کہا: حضور مجھے ایک کام ہے۔ میں ایسے آدمی کے پاس بیٹھا ہوں جو علم میں بھی سب سے زیادہ ہے، حسب ونسب میں بھی سب سے بہتر ہے۔ حسن میں بھی سب سے بہتر ہے۔ یہ تینوں صفتیں ہیں میری مشکل آپ حل کریں گے، سن لیا آپ نے۔ آپؑ نے اس کی یہ بات سن کے اب اس سے یہ سوال کیا کہ ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا: قبلہ! فرمائیے کیا پوچھنا ہے؟ کہ یہ بتلاؤ کہ دنیا میں سب سے بڑا آدمی کون سا ہے؟

میری بات کو آپ حضرات سمجھ رہے ہیں؟

اس نے کہا: حضور سب سے بڑا آدمی دنیا میں وہ ہے جس کے پاس معہ حلم کے علم، علم معہ حلم کے، اس کے ساتھ بے صبری ہو تو یہ علم کی توہین ہے۔ علم ہو معہ حلم کے۔ آپؑ

نے فرمایا: اچھا بے شک تم نے ٹھیک کہا۔ اچھا اگر یہ نہ ہو کسی کے پاس۔ پھر؟ کہ قبلہ اس سے دوسرے نمبر پر وہ آدمی ہے جس کے پاس دولت ہو معہ سخاوت کے۔ آپؑ نے فرمایا: بالکل ٹھیک ہے۔ کہا: اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر کہ حضور تیسرے نمبر پر وہ آدمی ہے جس کے پاس فقیری ہو معہ قناعت۔ آپؑ نے فرمایا: شاباش! بالکل ٹھیک کہا تم نے، بالکل درست ہے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو کہ حضور اس آدمی کو مر جانا چاہیے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ آپؑ نے ٹھیک کہا، تو نے بالکل ٹھیک جواب دیے۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو ہم سے؟ کیا مانگنے آئے ہو؟ اس نے کہا: مانگوں؟ کہ ہاں، میری بات قبول فرمائیں گے کہ بالکل کہ حضور مجھے خدا نے ایک لڑکی دی ہے۔ میں خاندان ثقیف کا رئیس ہوں۔ میری تمنا یہ ہے کہ جیسی میری لڑکی ہے، داماد میرا وہ ہو کہ میں دنیا کے سامنے کہہ سکوں کہ آؤ دیکھو یہ ہے میرا داماد۔ آپؑ نے فرمایا: تم کسے چاہتے ہو؟ کہ حضور اگر میری لڑکی کو قبول فرمالیں۔ آپؑ نے فرمایا: منظور ہے۔ چنانچہ لیلیٰ کا عقد حضور سید الشہداءؑ سے ہوا۔

توجہ فرمایئے ناصاحبان!

بات یہ میری غور فرما رہے ہیں ناحضور!

سید الشہداءؑ کی پہلی بیوی جو تھیں والدہ امام زین العابدینؑ وہ ایران کی شہزادی تھیں، پھر عقد ہوا آپؑ کا لیلیٰ سے۔ یہ قبیلہ بنی ثقیف کے سردار کی بیٹی تھیں۔ پھر عقد ہوا آپؑ کا ربابؑ سے جو جمل کے رئیس امراؤ بن قیس کی بیٹی تھی۔

بہرنوع حضور! اس وقت میرا مطلب یہ سنانا تھا۔ یہ بات یاد رہے گی نا آپ کو؟ یاد رکھو گے نا اس کہانی کو؟ ان شاء اللہ یاد رہے گی۔ لیلیٰ کا عقد ہو گیا حضور سید الشہداءؑ کے ساتھ۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اب میری کہانی غور سے سنتے رہنا تاکہ وقت میں بات بھی ختم ہو سکے اور آپ بھی سن لیں۔

میرے محترم سامعین اور وہ محترم حضرات! جو دھوپ میں بیٹھے ہیں مجھے ان کا بڑا احساس ہے۔ مگر دھوپ میں بیٹھنے والو تم سے یہ بات کہتا ہوں تم تھوڑی دیر بیٹھو گے۔ پھر

اس کے بعد اُٹھ کے گھر چلے جاؤ گے، اور حسینؑ کی شہزادی کبریٰ سلام اللہ علیہا پورے چھ سال دھوپ میں بیٹھی۔ چھ سال تک دھوپ میں بیٹھی رہی۔ پورے چھ سال۔ بہرنوع۔ یہ غم حسینؑ دھوپ اور سایوں کا فرق مٹا دیتا ہے۔ ساری چیزیں ختم کر دیتا ہے۔

تو میرے سامعین!

حضور سید الشہداء کو خدا نے جب پہلا بیٹا امام زین العابدینؑ عطا فرمایا، پہلا فرزند تھا، سید الشہداء کا امام زین العابدینؑ۔ تو آپؑ نے اپنے بیٹے کا نام علیؑ رکھا، اور بچے کو رومال میں لپیٹ کر مسجد میں لے آئے۔ وہاں مسجد میں لٹا کر دو رکعت نماز پڑھی اور ہاتھ اُٹھا کر دعا کی امامؑ نے۔ خداوند! یہ نعمت تو نے مجھے دی تھی۔ میں تیرے ہی سپرد کرتا ہوں۔ یہ کہہ کے مسجد میں لیٹا چھوڑ کر بچے کو، گھر آ گئے۔

جب زین العابدینؑ پیدا ہوئے، امیر المومنین اس وقت دنیا میں موجود تھے۔ انہیں یہ معلوم ہوا، مسجد میں گئے۔ دو رکعت نماز پڑھی، خداوندا! حسینؑ تو تیرے سپرد کر گیا، میں مانگنے آیا ہوں۔ امام زین العابدینؑ کو۔ جناب امیرؑ لے آئے ساتھ اور کہا کہ میں نے اسے خدا سے مانگ لیا ہے۔ میں پالوں گا۔ یہ میرا بیٹا بن کے رہے گا۔ میں پرورش کروں گا اس کی۔ یہ تو امام زین العابدینؑ کی بات ہوئی۔ اب تفصیل میں جاؤں تو بڑی دیر ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپؑ کے گھر بیٹیاں ہوئیں۔ اس کے بعد جب دوسرا بیٹا پیدا ہوا جسے آپؑ علی اکبرؑ کہتے ہیں۔ تو یہ بطن جناب سیدہ لیلیٰؑ سے پیدا ہوا۔ جناب علی اکبرؑ جو لیلیٰ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ بتاؤ علی اکبرؑ کا یزید لعین سے کیا رشتہ تھا؟

بولو!

لیلیٰ تھی نا پھوپھی زاد بہن۔ علی اکبرؑ کیا ہوئے۔ یاد رکھنا اس بات کو۔ علی اکبرؑ کیا ہوئے یزید کے، ہیں؟ بھانجے۔

سمجھ رہے ہو نا صاحبان!

اور دوسرا بچہ لیلیٰؑ کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام فاطمہ صغراؑ ہیں۔ فاطمہ

صغراءؑ تم نے یاد رکھا تو ساتھ یہ بھی یاد رکھنا، جب حسینؑ جانے لگے کربلا تو آپؑ نے حکم دیا فاطمہ صغراء ہمارے ساتھ نہیں جاسکتی۔ اسے ہم ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ پوچھا بیبیوں نے کیوں؟ کہ یہ یزید کی بھانجی ہوتی ہیں۔ اگر یہ قید ہو کے دربار یزید میں گئی اور یزید نے بھانجی کے رشتے کی وجہ سے اسے قیدیوں سے جدا کر دیا۔ محل میں بھیج دیا۔ نیک نیتی سے بھانجی سمجھ کے بھیج دیا محل میں۔ قیامت تک ہمارے دشمن شیعوں کو طعنہ دیا کریں گے۔ اس لیے اس لڑکی کو لے جانا مصلحت کے خلاف ہے۔ اسے ہم نہیں لے جائیں گے۔ اب سمجھے آپ فاطمہ صغراء کو کیوں چھوڑا تھا؟ ورنہ بیماری حسینؑ کے لیے کیا شے ہے؟ اب آپ کے ذہن میں آ گئی بات۔

جب شہزادہ علی اکبرؑ پیدا ہوئے۔ دوسرے فرزند تو حسبِ عادت حسینؑ نے اس بیٹے کو بھی لے جا کے مسجد میں لٹا دیا۔ وہی دو رکعت نماز پڑھی۔ وہی دعا کی۔ خداوندا تو نے یہ نعمت مجھے دی تھی۔ میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ اس وقت امیر المومنین تو تھے نہیں۔ حسینؑ تو مسجد میں لٹا کے چلے آئے۔ اور برقعہ پہن کر زینبؑ گئیں۔ مسجد میں اور جا کے مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی اور بچے کو اُٹھا لیا۔ خداوند! اسے میں مانگتی ہوں۔ علی اکبرؑ، زینبؑ کی گود میں پلے۔ زینبؑ کی گود میں پرورش پائی، زینبؑ کے پاس رہے۔ یہاں تک کہ جس طرح امام زین العابدینؑ، علی ابن حسینؑ کہلاتے ہیں۔ علی اکبرؑ، علی ابن زینبؑ مشہور ہو گئے۔

زینبؑ کا بیٹا علی اکبرؑ زینبؑ کے بیٹے مشہور ہو گئے۔ اُٹھتا زینبؑ کے ساتھ۔ کھانا پیتا زینبؑ کے ساتھ۔ گود میں زینبؑ کی۔ اگر کوئی شے مانگنی تو زینبؑ سے۔ کوئی ضد کرنی ہو جناب زینبؑ سے۔ بالکل سو فیصد اس شہزادے کا تعلق جناب زینبؑ سے تھا۔

میری بات سن رہے ہیں صاحبان!

اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ امام حسینؑ اکثر زینبؑ سے کہا کرتے تھے بہن میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارا بیٹا مجھ سے بھی کوئی شے مانگے۔ زینبؑ جواب میں کہتیں میرا بیٹا غیرت دار ہے وہ کیوں مانگے؟ میں موجود ہوں۔ کبھی علی اکبرؑ نے حسینؑ سے کوئی سوال نہ کیا۔

حسینؑ کے دل میں یہ تمنا تھی کہ یہ مجھ سے کچھ مانگے۔ مجھ سے کوئی سوال کرے۔ مگر سب مانگتا زینبؑ سے۔ جو سوال کرتا زینبؑ سے۔ جو عرض کرتا زینبؑ سے۔ ان کا نام ہی قبلہ دنیا میں علی ابن زینبؑ مشہور تھا۔ کون ہیں علی اکبرؑ؟ زینبؑ کے بیٹے ہیں۔ حسینؑ کے بیٹے نہیں کہلاتے تھے۔ علی ابن زینبؑ کہلاتے تھے، باہر جانے لگتے تھے نا گھر سے تو زینبؑ بازو پکڑ کے دعا کرتی تھیں، میرے بچے کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

مشہور عربی کا محاورہ ہے۔ علی اکبرؑ سے زینبؑ کہا کرتی تھیں کہ بیٹا اس طرح نہ چلا کر، یہ بالکل علیؑ کی چال ہے، اِدھر اُدھر چلا کر۔ اس طرح پالتی تھیں۔ سترھواں سال تھا کہ مدینے سے روانہ ہو گئے۔ چلے۔

سنو گے؟ اور آپ سنیں گے تو حیران ہوں گے؟

حیران کیا اس خاندان کی ساری باتیں ہی ایسی ہیں۔ جب آلِ محمدؐ کی خواتین، مدینے میں سوار ہونے لگیں، اپنی سواریوں پر تو اس وقت عصر کا وقت تھا۔ ۲۸ رجب تھی۔

سنو گے مسلمانو!

ایک ایک ناقہ آتا تھا دروازے پر اور آواز آتی تھی ''مادرِ قاسمؑ'' کی سواری حاضر ہے اور مادرِ قاسمؑ آتی تھیں۔ قاسمؑ سلام کر کے انہیں سوار کراتے تھے۔ پھر آواز آتی تھی فلاں خاتون، فلاں خاتون، اور اس خاتون کے متعلقین سوار کراتے۔ سب سے آخر میں کالے پردوں والی محمل دروازے پر آئی، ناقہ بٹھایا گیا۔ اس وقت سید الشہداءؑ، مسجد میں بیٹھے تھے۔ اصحابِ رسولؐ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ آپؑ نے پاس بیٹھنے والوں سے فرمایا۔ بھائیو! ذرا مجھے اجازت دو، میں خود کھڑے ہو کر زینبؑ کو سوار کراؤں گا۔ امامؑ خود تشریف لائے اور قمر بنی ہاشمؑ نے آواز دی۔ محلے والو! اب زینبؑ سوار ہو رہی ہے اور دیکھو کوئی شخص سواری پر چڑھ کر زمین سے نہ گزرنے پائے۔ کوئی آدمی چھت پر نہ چڑھنے پائے۔ محفل میں شور نہ ہو۔ خبردار جو کسی نے کوئی ایسی بات کی۔ اس طرح ایک خاتون سوار ہو رہی تھی۔

امامؑ خود آئے بہن کو سوار کرانے۔ جب آپؑ آئے ہیں، سوار کرانے بہن کو۔ ایک بازو زینبؑ کا حسینؑ نے ایک بازو علی اکبرؑ نے ہاتھ میں لیا۔ اس طرح دروازے تک آئیں اور جب دروازے پہ پہنچی ہیں، اس طرح تو یہ پہلا موقعہ ہے کہ زینبؑ نے اپنی زندگی میں علی اکبرؑ سے کہا کہ بیٹا میرا بازو چھوڑ دو۔ علی اکبرؑ نے چھوڑ دیا۔ پھر حسینؑ سے کہا: آپؑ بھی چھوڑ دیں۔ انہوں نے بھی چھوڑ دیا۔ بہن کیا بات ہے؟ کہ بس منشا یہی ہے مجھے سوار کرانے کے لیے زین العابدینؑ کو بھیجو اور حضور امام زین العابدینؑ آ گئے۔ کہا: بیٹا! تم مجھے خود سوار کراؤ۔ میرا تمہارا ساتھ ہے۔ سوار ہو گئے، روانگی ہو گئی اور سید الشہداءؑ نے حکم دیا کہ میرے باپ کے گھوڑوں میں سے جو سب سے شریف ترین گھوڑا ہو، وہ زین العابدینؑ کی سواری کے لیے مخصوص کیا جائے۔ خاص طور پر زین بنایا گیا تھا۔ امام زین العابدینؑ کے لیے۔ نہایت نرم و نازک تھا تاکہ سوار ہو کر کوئی تکلیف نہ ہو۔ گھوڑے کو خاص طور پر سکھایا گیا تھا کہ وہ اشارے کے مطابق چلے۔ لوگوں نے عرض کیا: قبلہ! آپؑ اور بیٹوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ زین العابدینؑ کی بڑی پرواہ کرتے ہیں۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا کہ بھائی بات یہ ہے کہ اس کی ماں ایران کی شہزادی تھیں۔ اس کے بدن میں شاہی خون ہے۔ اس کا مزاج شہنشاہی ہے۔ یہ کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کا شاہی مزاج ہے۔ شاہی مزاج تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ شاہی مزاج کو کوئی تکلیف نہ ہو اور بات آ گئی زبان پر۔ وہ بھی کہتا چلوں۔ جب زبان پہ بات آئی تو تمہیں سنا دوں۔ گھر میں یہ حکم تھا۔

اب سننا بڑے غور سے۔

گھر میں یہ حکم تھا مستورات سے سید الشہداءؑ امام حسینؑ کا کہ دیکھو بیبیو! دیکھو میری بہنو! گھر کے اندر جب زین العابدینؑ بیٹھے ہوں تو گھر کے اندر بھی کسی کا سر نہ کھلنے پائے۔ میرے بیٹے کا شاہی مزاج ہے۔ یہ برداشت نہ کر سکے گا۔ اس کا شاہی مزاج اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا، اور اس محفل میں میرے، جتنے نوجوان بیٹھے ہیں۔ ہمارے خون میں

اب وہ ولولہ نہیں رہا۔ ہمارے خون میں اب وہ حرارت نہیں رہی ہے۔ نوجوانوں سے معافی مانگ کے ان کے خون میں گرمی ہوتی ہے نوجوان کے۔ ان سے معافی چاہ کر یہ بات سنانا چاہتا ہوں۔

نوجوانو! ذرا غور سے سننا میری بات کو۔

تمہارے خون میں گرمی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں بھی نوجوان تھا۔ آج سے اکیس سال پہلے کی بات ہے اور میں دکن گیا تھا۔ وہاں میں نے یہ واقعہ پڑھا جو ابھی تمہیں سناتا ہوں تو نوجوانوں نے چاقو مار لیے تھے۔ پھر میں نے پڑھنا چھوڑ دیا اس واقعہ کو۔ اب میں اسے نرم کر کے پڑھتا ہوں۔ نوجوانوں سے ڈر کے۔ امام زین العابدینؑ کا واقعہ تمہیں سناتا ہوں۔ امام زین العابدینؑ روانہ ہوئے مدینے سے تو بالکل تندرست جوان شہزادہ۔ امامؑ نے چہرے پر نقاب ڈالوادی۔

فرمایا: یہ شہزادہ ہے۔ اس کے بدن میں شاہی خون ہے اور شاہی خون بازاروں میں بے نقاب نہیں چل سکتا۔ میں کس طرح تمہیں وہ منظر سناؤں۔ باپ کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر زین العابدینؑ سوار۔ کربلا پہنچے۔ حسینؑ سے دوسرے نمبر کا انسان امام زین العابدینؑ چوتھا امام۔ وہی اعزاز تھا جو حسینؑ کے دوسرے نمبر کا ہونا چاہیے۔

توجہ ہے نا صاحبان!

میرے محترم سامعین! نویں تاریخ آئی محرم کی۔ نو کی شام کو امام زین العابدینؑ کو بخار ہوا۔ یہ غشی کب تک رہی؟ دسویں کی شام تک۔ اللہ نے یہ انتظام کیا تھا اس واسطے یہ غشی مسلط کر دی کہ امامؑ کی هَلْ مِن نَّاصِرٍ کی آواز ان کانوں تک نہ پہنچے۔ ورنہ جہاد فرض ہو جاتا اور امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ جب بخار ہوا۔ آپؑ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ بخار انتہا کا تھا۔ غشی کا عالم اور ایک سندھی خاتون جو آپؑ کی ماں کے ساتھ گئیں تھیں، شہر بانو کے۔ وہ آپؑ کی دایہ تھیں۔ تیماردار تھیں۔ اسے امام زین العابدینؑ اماں کہتے تھے، وہ پاس بیٹھی تھیں، جب رات کے دس بجے تو آپؑ نے سنا۔ سید الشہداءؑ نے اپنے خیمے میں

اپنے ساتھیوں کو بلا کے ایک کانفرنس کی اور اس میں یہ فرمایا۔ آپؑ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: کہ تم جا سکتے ہو۔

سنا ہے نا آپ نے؟

یہ نہیں کہا تم جاؤ۔ اگر کہتے جاؤ۔ پھر وہ رک نہ سکتے، پھر انہیں جانا پڑتا۔ یہ نہیں کہا، یہ کہا تم جا سکتے ہو، تمہاری مرضی۔ انہوں نے جواب میں کہا! کہ ہم نہیں جائیں گے۔ جو آپؑ نے سنا ہے۔ تو امامؑ نے فرمایا: اچھا تم ایک کام کرو۔ اپنے خیمے اکھاڑو جہاں جہاں لگے ہوئے ہیں اور سیدانیوں کے خیموں کے چاروں طرف لگاؤ۔

سن رہے ہو؟

تا کہ سادات کے خیموں کی رات میں حفاظت ہو سکے اور بے حیا فوج اگر رات میں حملہ کرنا چاہے تو ان ساداتؑ کی حفاظت ہو سکے۔ چنانچہ سب اصحاب کے خیمے اُکھڑ کے چاروں طرف لگ گئے۔

میری بات سن رہے ہو نا غور سے؟

انہوں نے اپنے خیموں میں بیٹھ کے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ مناجات پڑھنا شروع کر دیں۔ مذہبِ اہل بیتؑ کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔ مرنے کی عید ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ بھئی مبارک ہو۔ کل مرنا ہے۔ رات کے ایک بجے کا وقت اور ان کے خیموں سے آوازیں آ رہی تھیں قرآن کی۔ حدیث کی، مناجات کی تم تیار ہو نا؟

اب بات جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ جب ان کی آوازیں بلند ہوئیں۔ خیموں سے قرآن پڑھنے کی، مناجات پڑھنے کی اس وقت امام زین العابدینؑ کو غشی سے افاقہ ہوا۔ آپؑ ذرا بیدار ہوئے۔ بیدار ہو کے پوچھا اپنے تیمارداروں سے کہ کس کی آواز میں سن رہا ہوں؟ خاتون نے کہا کہ جو ہمارے اصحاب ہیں، جو ہمارے جانثار ہیں وہ اپنے خیموں میں قرآن پڑھ رہے ہیں۔ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کی آواز آ رہی ہے۔ یہ آپؑ

نے فرمایا: اچھا! اور میرے بابا کہاں ہیں؟ کہ وہ وہاں مصلے پر بیٹھے ہیں کہ تم جاؤ اور میرے باباؑ کو یہ کہو کہ بیٹے کو غشی سے آفاقہ ہے اور آپؑ کو سلام کہتا ہے۔ اس خاتون نے آ کے امامؑ کو سلام پہنچایا۔ امامؑ مصلے سے اُٹھے اور سیدھے بیمار کے خیمے میں گئے۔ امام زین العابدینؑ تعظیم کو اُٹھے۔ امامؑ نے بٹھا دیا۔ نبض دیکھی، پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بیٹا بخار کا کیا حال ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟ بیٹا جلدی جلدی اچھے ہو جاؤ بڑا کام کرنا ہے۔

میں مؤمنین کو یہ بات کہتا ہوں جس کسی کو پریشانی ہو یہ دعا پڑھ لیا کرے۔ چھوٹی سی دعا ہے۔ کتابوں میں لکھی ہے وہ دعا تعلیم کی۔ جب یہ باتیں ہو چکیں تو امامؑ نے پوچھا: بیٹا تم نے مجھے کیوں یاد کیا تھا اس وقت؟ کہ بابا ایک بات عرض کرنی ہے۔ ہاں کہو بیٹا! یہ جو ہمارے اصحاب ہیں، یہ جو ہماری فوج ہے، یہ جو ہمارے سپاہی ہیں، جو ہمارے مددگار ہیں یہ ہمارے محسن ہیں۔ میں قیامت تک ان کا احسان مند رہوں گا۔ ان کے ہم شکر گزار ہیں اور باباؑ ان کی آخری خدمت جو ہے دفن تو میں کروں گا۔ اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کی قبر پر کھڑا ہو کے کہوں گا۔ میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں، تم ہمارے محسن ہو۔

قبلہ! ان تمام باتوں کے باوجود میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ بات ہے یہ سب کچھ صحیح مگر ہیں تو نامحرم۔ ان کی آوازیں ہمارے زنانے خیموں میں آتی ہیں۔ ممکن ہے ہماری عورتوں کی آواز وہاں جا رہی ہوں۔ ان کے خیمے ذرا فاصلے پر نہیں ہو سکتے؟ یہ کہنا تھا کہ امامؑ بیٹھے تھے۔ اُٹھے۔ سید الشہداءؑ پھر بیٹھے، پھر اُٹھے۔ پانچ چھ مرتبہ کبھی اُٹھے، کبھی بیٹھے۔ گھبرا کے کہتے ہیں بیٹے سے، بیٹا زین العابدینؑ! آج کی رات تو یونہی رہنے دو۔ کل جو رات آئے گی، تم جانو اور خیمے۔ ایک دفعہ غش آ گیا امام زین العابدینؑ کو۔ اس غش سے کب افاقہ ہوا؟ یہ پھر بتاؤں گا۔ اب آرام آرام سے سنتے چلیں کہانی کس طرح۔

اور میرے معزز سامعین!

ہر سال میں حاضر ہوتا ہوں۔ پتہ نہیں اگلے سال آنا ہو یا نہ ہو۔ ممکن ہے یہ آپ کی

آخری زیارت ہو۔ میں آپ سے بڑے خلوص سے یہ معافی مانگتا ہوں۔ یہ میں آپ کو اپنے گھر کی کہانی سنا رہا ہوں۔ میں شرمندہ ہوتا ہوں، مجبوری بن گئی ہے کہانی ایسی ہے میں کیا کروں؟ دل نہیں چاہتا سنانے کو مگر کہانی ایسی ہے بات کو میری سنو گے؟ امامؑ کی فوج میں جو مؤذن تھے ان کا نام تھا حجاج۔ جب صبح ہوئی تو وہ آذان کے لیے اُٹھے۔ امامؑ نے فرمایا: حجاج بھائی آج تم اذان نہ کہو۔ انہوں نے کہا بہت اچھا اور آپؑ نے فرمایا: علی اکبرؑ بیٹا آج تم اذان کہو۔ شہزدہ علی اکبرؑ نے اذان کہی۔ ادھر کہا اللہ اکبر، اُدھر لوگوں کے کانوں میں رسولؐ کی آواز گونجی اور تمام خواتین خیموں سے باہر نکل آئیں۔ اذان ہوئی، نماز ہوئی اور اسکے بعد امامؑ نے تیاری کی۔ رخصت ہوئے۔ میدان میں آ گئے۔

میں مختصر کرتا جا رہا ہوں اب بات کو۔

چند لمحوں میں تیاری ہونے لگی میدان کی اور سید الشہداءؑ کے کان میں آواز آتی رہی۔ مولا! میں گر گیا۔

میرے آقا! میں گر گیا اور ہر آواز پہ امامؑ جاتے رہے۔ جب تقریباً قریب قریب پچاس لاشیں حسینؑ اُٹھا چکے تو اس وقت ایک بج گیا۔ پچاس لاشیں اُٹھانے کے بعد حسینؑ کے صحابیوں میں ایک صحابی تھے مسیّب کے رہنے والے۔ سعید ان کا نام تھا۔ بڈھے آدمی تھے۔ وہ آئے مولا کے سامنے اور کہنے لگے قبلہ ظہر کا وقت ہے۔ آپؑ نے فرمایا: ہاں۔ تجھے خدا نمازیوں میں محشور کرے۔ ظہر کا وقت ہے۔ کیا چاہتا ہے تو سعید؟ کہ قبلہ یہ میری آخری نماز ہے۔ میں آپؑ کے ساتھ جماعت سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ چند ساتھی جو باقی رہ گئے تھے بیٹھ گئے۔ سب نے تیمم کیا اور آپؑ نے فرمایا: اس فوج سے کہہ دو کہ چند منٹ کے لیے تیر روک دے۔ ہم یہ جماعت کی آخری نماز پڑھ لیں۔ فوج نے تیر نہ روکے، صف بن گئی اور یہ سعید صف میں سے نکلے، جنہوں نے نماز کا کہا تھا۔ کہا: مولاؑ! آپؑ نماز پڑھائیں میں سامنے کھڑا ہوں کہ کیوں؟ کہ میں آپؑ تک کوئی تیر نہیں آنے دوں گا۔ ادھر سے تیر آتے رہے۔ ادھر سے یہ سعید پسلیوں پہ تیر روکتا رہا۔ تمام تیر گھس گئے بدن میں۔

ادھر سے امامؑ نے سلام پھیرا۔ ادھر یہ گرا گود میں معہ ان تیروں کے اور گر کر پوچھتا ہے: رسولؐ اللہ کے بیٹے آپؑ مجھ سے راضی ہیں؟ میری نماز ہوگئی قبلہ؟ اور امامؑ جواب میں فرماتے ہیں:

اَنْتَ اَمَامِیْ فِی الْجَنَّةِ

سعید میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں جب میں جنت میں جاؤں گا تو میرے آگے آگے چلے گا۔ سعید نے فرمائش کی قبلہ! اگر میں وہاں آگے چلوں گا تو میری ایک فرمائش ہے۔ کیا؟ کہ یہ تیر میری بدن سے نہ نکالنا۔ میں ان تیروں سمیت تیرے نانا کے سلام کو جاؤں گا۔ اسی طرح جنت میں جاؤں گا ان تیروں سمیت اور اس کے بعد سعید گود میں لیٹے ہیں۔ ایک دم کہنے لگے قبلہ کس نے میرا سر اپنی گود میں لے لیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: سعید میرا سلام کہو، یہ میرے نانا آ گئے۔

قبلہ! یہ کوئی میرے سینے پہ ہاتھ پھیر رہا ہے کہ میرے بابا حیدر کرارؑ ہیں۔ یہ کوئی میرے ہاتھ دبا رہا ہے۔ کہا: یہ میرے بھائی حسنؑ آ گئے اور ایک دفعہ گھبرا کے سعید نے کہا: یہ میرے پیروں کے پاس کوئی آ گیا؟ امامؑ نے فرمایا: سعید ذرا پاؤں ہٹا دو میری اماں آ گئیں۔ میری اماں ہیں۔

او میرے معزز سامعین!

سعید کی شہادت ہوگئی۔ اس واقعہ کو مولانا روم نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے۔ انہوں نے نماز کی بجائے یہ کام کیا تھا۔ اس بات کو مولانا روم مثنوی میں لکھتے ہیں ؎

نمازِ ظاہری ذکر و سجود است
نماز عاشقاں ترک وجود است

''یہ ذکر اور سجدے، یہ ظاہری نماز ہے، وہ عاشقوں کی نماز تھی جو تیر کھا کے گرے۔''

میں نے جب کربلائے معلیٰ میں محرم کیا تھا نا بھائی! تو دسویں محرم کو ہزاروں قافلے

ماتمی آئے تھے۔ ایک دروازے سے آتے تھے تو دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے۔ ایک بجے ظہر کے وقت ایک قافلہ آیا۔ پچیس تیس جوانوں کا۔ حسینؑ حسینؑ ماتم کرتے ہوئے حرم میں داخل ہوئے۔ اور تمام لوگوں نے انہیں راستہ دے دیا۔ وہ آ کے ضریح کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک ہاتھ سے ضریح پکڑ لی اور ایک ہاتھ سے ماتم شروع کر دیا۔ تمام حرم میں کہرام مچا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ تو مجھے بتایا کہ یہ سعید، جنہوں نے نماز پڑھائی تھی۔ یہ اس کی اولاد ہیں۔ یہ ہر سال ظہر کے وقت آتے ہیں یہاں۔ اب ان کا نوحہ سنو یہ کیا نوحہ پڑھ رہے ہیں اور وہ نوحہ میں کہہ رہے تھے۔ حسینؑ ظہر کا وقت ہے اُٹھو۔ سعید کی اولاد حاضر ہے اور اِسی نماز کے وقت حضرت حبیبؓ بھی شہید ہو گئے۔ اصحاب سب شہید ہو گئے۔ اب باری اولاد کی آ گئی اور مولا، آقا کی آواز آنی بند ہو گئی۔ اب صرف اولاد باقی رہ گئی بنی ہاشمؑ کی۔ یہ باقی رہ گئے صرف امامؑ جوان کے سامنے کھڑے ہوئے تھے مسلمؑ کے بچے، عقیلؑ کے بچے۔ حضرت مسلمؑ کے بھائی جناب عباسؓ چاروں بھائی سمیت، جناب امیرؑ کے دوسرے صاحبزادے، امام حسنؑ کے بیٹے، یعنی اولاد بنی ہاشمؑ۔ یہ سامنے کھڑے ہوئے امامؑ نے ایک نظر سب پر ڈال کر اور خود فرمایا: سبتی یا بنیہ ان سب سے پہلے بیٹا علی اکبرؑ تم جاؤ میدان میں۔ میں یہ نہیں گوارا کرتا کہ دوسرے بچے شہید ہو جائیں اور میرا بیٹا بچ جائے۔ سب سے پہلے تم جاؤ بیٹا۔ بس اس حکم کا ہونا تھا علی اکبرؑ روانہ ہوئے۔ ابھی دس بیس قدم گئے ہوں گے کہ امامؑ نے آواز دی واپس آؤ۔ علی اکبرؑ واپس آئے۔ حکم؟ کہ جانے سے پہلے خیمہ میں جاؤ۔ ماں کو سلام کرو، پھوپھی سے ملو۔ بہنوں سے رخصت ہو کے پھر جانا، علی اکبرؑ نے گھوڑا وہیں چھوڑا۔ اُتر کے گھوڑے سے خیمے میں گئے، اور امامؑ کے ساتھ گئے۔

سنو جہاں جہاں بیٹھے ہو۔

سب سے پہلے ماں کے پاس گئے لیلیٰؑ کے اور جا کے سلام کیا، اماں سلام۔ جو جو مستورات میری بات سن رہی ہوں عورتیں، وہ بھی سن لیں اور مرد بھی سن لیں کہ لیلیٰؑ جواب

کیا دیتی ہے؟ لیلیٰؑ کہتی کیا ہے؟ سلام کے جواب میں۔ اکبرؑ بیٹا ابھی زندہ ہو؟ میں تو منت مانے بیٹھی ہوں میرا لال کہ تیری میت آئے تو شکریے کی نماز پڑھوں۔ سنو علی اکبرؑ بیٹا میرا معاملہ بڑا نازک ہے بیٹا۔ میرا اس کم بخت سے رشتہ ہے یزید (لعنت اللہ علیہ) سے۔ تجھے پتہ ہے یا نہیں؟ اگر تو کسی سے پیچھے رہ گیا چاہے کسی اور وجہ سے رہ جائے کہیں دنیا یہ نہ کہہ دے کہ ماں نے روک لیا ہوگا۔ بیٹا تیری ماں کی عزت کا سوال ہے، جلدی جا اور بیٹے نے کہا: اماں میں جا رہا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔ یہ کہہ کے آئے پھوپھی کے پاس۔ باپ نے فرمایا: زینبؑ سے۔ بہن زینبؑ، اکبرؑ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کچھ بات کرنے آئے ہیں۔ آج میں سننا چاہتا ہوں کہ پھوپھی بھتیجے میں کیا بات ہوتی ہے؟ زینبؑ ذرا سنبھل کر بات کرنا آج۔ علی اکبرؑ گئے اماں سلام۔ زینبؑ نے دعائیں دیں لیٹ گئے۔ گود میں سر رکھ دیا۔ پھوپھی نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ امامؑ دیکھ رہے ہیں کہ کیا بات ہوگی؟ بات کیا کی بیٹے نے؟ اماں بیٹا میں نے ساری عمر کبھی کوئی بات پوچھی تو آپؑ سے، کوئی مسئلہ پوچھا تو آپؑ سے، سیکھا تو آپؑ سے۔ کوئی سوال کیا تو آپؑ سے، آج میں آپؑ سے ایک سوال کرتا ہوں اور زینبؑ کہتی ہے ہاں بیٹا پوچھو کیا پوچھنا ہے؟ کرو سوال کہ اماں یہ بتاؤ کہ خدا کی نظروں میں آپؑ کا مرتبہ زیادہ ہے یا دادی فاطمہؑ کا؟ اور جواب میں زینبؑ کہتی ہے بیٹا اتنے سمجھ دار ہو کر یہ کیا پوچھ رہے ہو۔ میں تو فاطمہؑ کی ادنیٰ کنیز ہوں۔ میں کجا، فاطمہ کجا؟ جب زینبؑ نے یہ کہا تو اُٹھ کے بیٹھ گئے اور بیٹھ کے کہتے ہیں اماں۔ اگر یہ بات ہے کہ دادی کا مرتبہ زیادہ ہے آپؑ سے تو آج ایک کام کر دو۔ کیا بیٹا؟ کہ آج فاطمہؑ کے بیٹے پر اپنے بیٹے کو قربان کر دو۔

امامؑ نے فرمایا: زینبؑ میں نہ کہتا تھا ذرا سنبھل کے بات کرنا۔ اب بتاؤ کیا جواب دو گی؟ زینبؑ نے سر جھکا لیا اور دونوں بہن بھائیوں نے کھڑے ہو کر لباس پہنایا اور اکبرؑ کو رخصت کیا خیمے سے۔ خود فوج یزید اس بات کی روای ہے ہم غور سے دیکھ رہے تھے۔ حسینؑ کے خیمے کا پردہ کبھی اُٹھتا تھا اور کبھی گرتا تھا۔ بڑی دیر لگ گئی۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا

کہ علی اکبرؑ رخصت ہو کر گھر سے جب نکلنے لگتے ہیں کوئی بہن آگے دامن پکڑ لیتی ہے۔ کبھی کوئی پھوپھی روک لیتی ہے۔ کبھی چچی روک لیتی ہے۔ جب بڑی دیر ہو گئی تو امامؑ نے فرمایا: بی بیو! مسافر کا راستہ نہ روکو۔ اکبرؑ کو جانے دو۔ بی بیاں دم بخود ہو گئیں۔

علی اکبرؑ آخری بار روانہ ہوئے تو جہاں جہاں بیٹھے ہو صاحبو اب کے جو چلے ہیں آخری مرتبہ تو ایسا منظر بن گیا کہ حسینؑ جیسا صابر بھی آنکھوں پر رومال رکھ کے باہر آ گیا۔ دیکھ نہ سکا اس منظر کو۔ وہ یہ تھا کہ اکبرؑ روانہ ہوئے۔ کانوں میں ایک آواز آئی۔ اکبرؑ ہم سے نہیں ملنا۔ اب جو مڑ کے دیکھا تو بیمار بھائی چلا آ رہا ہے اور دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ اب یہ منظر حسینؑ بھی نہ دیکھ سکے۔ باہر آئے اور بس بھائیو مختصر کر دوں۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔ بھائی سے رخصت ہو کے علی اکبرؑ باہر آئے۔ کس کس بات کو کہوں اور کیا کیا کہوں؟

جوانو! نوجوانو! تم نے ماتم کرنا ہے۔

اور میرا ذاتی ایمان ہے کہ بیس صفر کی چہلم کی مجلس چاہے کہیں بھی ہوں دو معصوم ضرور آتے ہیں۔ ایک جناب امام زین العابدینؑ اور دوسری جناب زینبؑ اور بی بی زینبؑ سے آپ کی سفارش ہے کہ بی بی آج یہ شاہ چن چراغ میں مجلس ہو رہی ہے میں ان سادات کی اجازت سے جنہوں نے یہ مجلس کی ہے یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم تیرے علی اکبرؑ کا چہلم کر رہے ہیں تا کہ ہماری یہ مجلس اکبرؑ کی مجلس ہو جائے۔

باہر نکلے اور امامؑ نے خود گھوڑے کی رکاب پکڑ کر سوار کرایا۔ سوار ہوئے، چلے، پیچھے پیچھے حسینؑ اور آگے آگے اکبرؑ۔ جب دس بیس قدم چلے۔ گھوڑا رکا۔ بابا میں نہ جاؤں؟ آپ کیوں آ رہے ہیں؟ حسینؑ نے بس ایک جواب دیا: علی اکبرؑ بیٹا تمہیں میرے دل کا اندازہ نہیں۔ تمہارا کوئی جوان بیٹا جو نہیں۔ حسینؑ بیٹھ گئے، اکبرؑ چلے گئے۔ اب میں اپنی وہ مختصر گفتگو کرتا ہوں۔ اکبرؑ میدان میں، حسینؑ ریت کے ٹیلے پر۔ زینبؑ دروازے میں۔ لیلیٰ مصلے پر۔ لیلیٰ کی نظر زینبؑ پر۔ زینبؑ کی نظر حسینؑ پر۔ حسینؑ کی نظر اکبرؑ پر۔ اکبرؑ

کی نظر فوجوں پر۔

سن رہے ہو نا میری بات کو؟ اور مختصر کر دوں۔

دس منٹ گزر رہے ہوں گے اکبرؑ گھوڑے سے گرے۔ حسینؑ ٹیلے سے گرے۔ زینبؑ دروازے پر گریں۔ لیلیٰؑ سجدے میں گریں۔ تھوڑی دیر کے بعد حسینؑ اُٹھے۔ میدان میں آئے۔ جب علی اکبرؑ کی میت نو دس قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو کھڑے ہو کر آواز دی: اکبرؑ بیٹا، ہمیں پکارو، ہمیں آواز دو۔ ہم تم تک تمہاری آواز کے سہارے پہنچیں گے۔ ہمیں بیٹا رستہ نظر نہیں آ رہا۔ ہماری آنکھیں کام نہیں کر رہی بیٹا اور اکبرؑ نے آواز دی۔ بابا میں یہاں ہوں۔ بابا پہنچے۔ لاش کو دیکھا۔ اکبرؑ تڑپ رہے تھے۔ جوان کا تڑپنا جو باپ نے دیکھا۔ گھبرا گئے۔ میں نے کہا ہے۔ یہ لفظ تو اب تمہیں میں خدائے سخن ابوالکلام انیسؔ کا ایک شعر سناتا ہوں۔ جب بیٹے کو حسینؑ نے تڑپتے دیکھا تو کیا کیا؟ اس کو انیسؔ نے نظم کیا تڑپتے دیکھ کر بیٹے کو۔ حسینؑ کیا فرماتے ہیں بیٹا۔

بے چین ہو تم دل میرا گھبراتا ہے بیٹا
مر جاؤ کہ اب صبر میں فرق آتا ہے بیٹا

بیٹھ گئے۔ لاشے کو گود میں لے لیا۔ اکبرؑ ہم آ گئے۔ بابا آپؑ نے بڑی تکلیف فرمائی۔

سنو گے جوانو!

حسینؑ نے ہزاروں دفعہ کہا ہے زندگی میں ہم سے اکبرؑ کچھ مانگو، میرا دل چاہتا ہے کہ تم کچھ مانگو۔ آج پہلا موقع ہے کہ اکبرؑ کہتے ہیں بابا میں ایک چیز مانگتا ہوں۔ حسینؑ کی تمنا ہے ساری عمر کی۔ حسینؑ نے کہا کہ مانگو بیٹا کیا مانگتا ہے؟ پہلی بار مانگا ہے بیٹے نے، کیا؟ بابا ایک شے چاہیے۔ کیا میرے لال؟ ایک گھونٹ پانی کا۔ مانگا بھی تو کیا مانگا۔ حسینؑ نے آسمان کو دیکھا اور کہا کہ بیٹا یہ ممکن نہیں اور کوئی شے مانگو میرے لال! ابا اور شے میں یہ مانگتا ہوں کہ مجھے خیمے میں لے چلو کہ میں اپنی اماں سے جا کے بات کر سکوں۔ ہاں! یہ بات ہم کریں گے۔ لو اب میں ختم کر رہا ہوں گفتگو کو۔

توجہ سے سننا جوانو!

تو نے آج جوانوں کا ماتم کرنا ہے یہاں۔

امامؑ نے لاش اُٹھائی، ہاتھ کانپے، لاش گرنے لگی، لٹائی، دوبارہ اُٹھائی، سہ بارہ اُٹھائی۔ جب جوان کی میت بوڑھے بابا سے نہ اُٹھ سکی، تو آپؑ نے فرمایا: اکبرؑ نے ایک ہاتھ باپ کے گلے میں ڈال دیا۔ باپ نے فرمایا: بیٹا دونوں ہاتھ کہ ابا میں بایاں ہاتھ اپنے سینے سے ہٹانا نہیں چاہتا۔ مولاؑ نے کہا: کیا بات ہے؟ میں اپنا سینہ آپؑ کو دکھانا نہیں چاہتا بابا۔ نہیں میرے لال دکھاؤ کیا بات ہے؟ امامؑ نے حکم دیا۔ اکبرؑ نے ہاتھ ہٹایا۔ حسینؑ نے دیکھا۔ کیا دیکھا؟ کہ برچھی ٹوٹ کے وہیں لگی ہوئی ہے۔ ایک انچ باہر نکلی ہوئی ہے۔ حسینؑ نے کہا: یہ بات ٹھیک تھی بیٹا۔ گھبراؤ نہیں۔ لٹایا بیٹے کو۔ ایک ہاتھ رکھا سینے پر۔ ایک ہاتھ سے پکڑی برچھی اور بلند آواز سے کہا: نانا رسول اللہؐ، دادا ابراہیمؑ کو ساتھ لے کر کربلا میں آؤ اور آ کے دیکھو میری آنکھوں پر پٹی نہیں ہے۔ میرا ہاتھ نہیں کانپ رہا۔ آ کے دیکھو تو سہی۔ یہ کہہ کے جو برچھی ہلائی۔ برچھی ہلی تو اس میں چھدا ہوا اکبرؑ کا دل ہلا۔ دل ہلا تو سارا بدن کانپا۔ بدن کانپا تو کربلا کی زمین کانپی۔ کربلا کی زمین کانپی تو حسینؑ کے خیمے لرزے۔ خیموں کا لرزنا تھا کہ دروازے سے آواز آئی: بہن کو آنے دو۔ دونوں مل کر یہ کام کریں گے۔ اکیلا نہ کر۔ زینبؑ کی آواز حسینؑ نے سنی کہ باہر آنا چاہتی ہے۔ ادھر امامؑ نے مڑ کے حکم دیا کہ بحیثیت امامؑ کے حکم دیتا ہوں علی اکبرؑ کے گھوڑے دروازے پہ جا کے زینبؑ کو روک دے۔ امام نے کہا: سنتے ہی گھوڑا دروازے پر پہنچا تا کہ زینبؑ دروازے پہ رک جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زینبؑ دروازے سے باہر آ جائے اور حسینؑ نے لاش اُٹھالی اور لے کے روانہ ہوئے۔

بس بھائیو! یہ میری گفتگو کا اختتام تھا۔ یہاں بات میں نے ختم کر دی۔ نوجوانو! تم نے ماتم کرنا ہے آج، کرنا ہے نا! بولو بھئی! ایک دفعہ میرے سامنے تو سینے پہ ہاتھ مار کے کہو یا حسینؑ، یا حسینؑ۔

شامِ غریباں

فضائل ..... درسِ معصوم

مصائب ..... شامِ غریباں

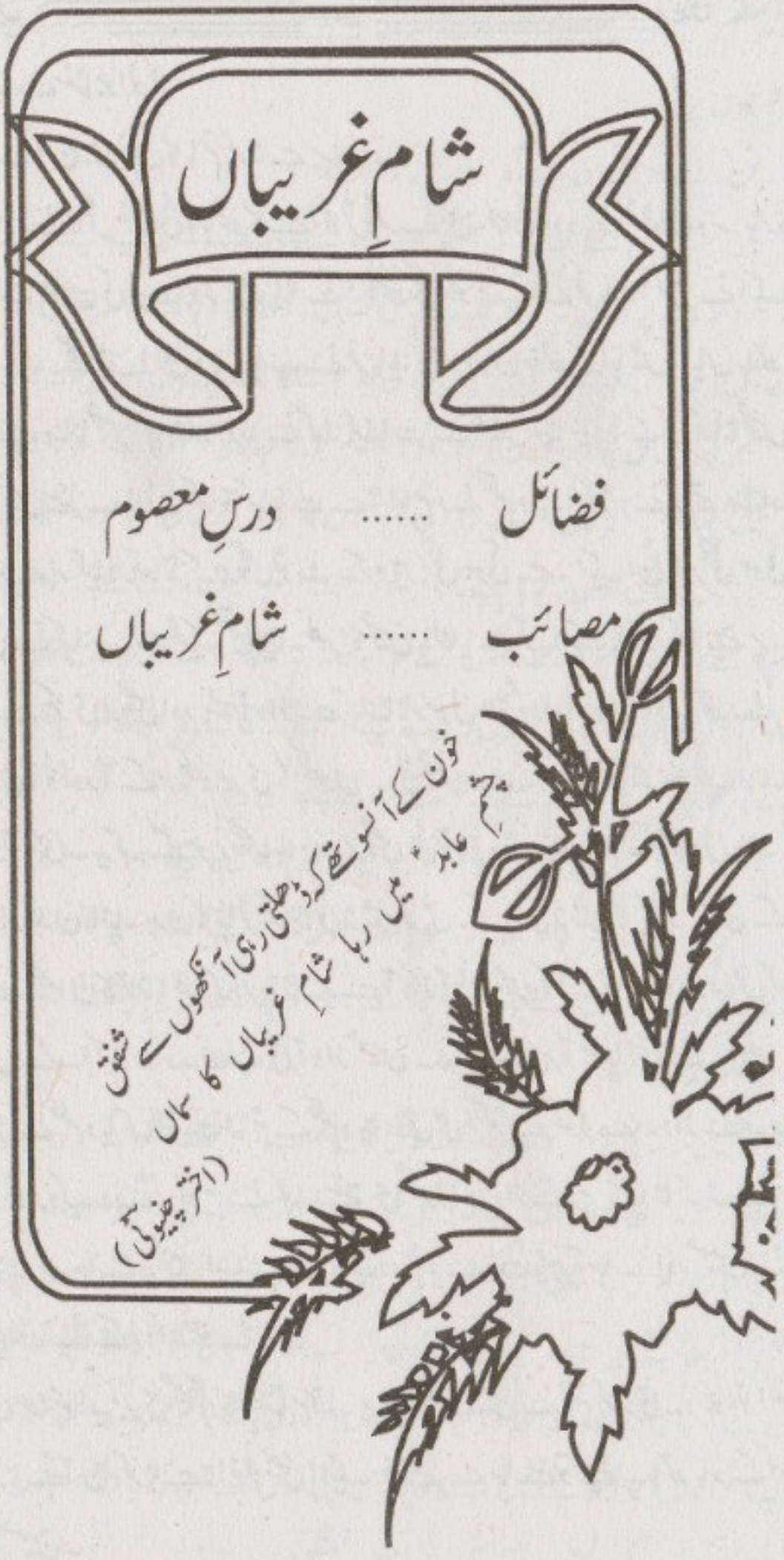

درسِ معصوم

صاحبان! مختصر سی گفتگو پورے غور اور توجہ سے سنیں تا کہ آپ کو وہ بات یاد رہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں آج کی یہ گفتگو اس بات سے شروع کرتا ہوں کہ جتنے بھی انبیاء دنیا میں تشریف لائے۔ جن کی تعداد کا صحیح اندازہ ابھی تک نہیں ہے۔ شہرت عام یہ ہے کہ ایک لاکھ اور چوبیس ہزار۔ یہ شہرت عام ہے۔ یہ نہیں کہ یہ تعداد طے شدہ ہے۔ یہ ایک شہرت عام ہے۔ پھر ان تمام انبیاء میں سے بعض کا ذکر قرآن میں ہے۔ اور اکثر و بیشتر کا تذکرہ نہیں مگر ایک بات ان سارے انبیاء کے متعلق مشترک طور پر قرآن میں موجود ہے۔ کہ ان انبیاء نے اپنے تشریف لانے اور ہدایت فرمانے کا مقصد یہ بیان کیا ہے۔ بزبانِ قرآن، بزبان خدا وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

ہم اس لیے دنیا میں آئے ہیں کہ اے دنیا والو! تمہارے سامنے حق کی، اور حکم خدا کی تبلیغ کریں۔ یہ بیان کرتے کرتے، کرتے کرتے جب نبوت چلتے چلتے خاتم النبیین پر پہنچی۔ ان سے بھی لوگوں نے پوچھا کیا آپ بھی اسی طرح نبی ہیں جس طرح وہ تھے؟ آپ بھی تبلیغ ہی کے لیے آئے ہیں؟ جس طرح وہ آئے تھے؟ آپ بھی تبلیغ ہی کے لئے آئے تھے، جس طرح وہ آئے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا: نہ، میں تبلیغ کے لیے نہیں آیا۔ میرا مقصد بلاغ نہیں ہے، بلاغ کے معنی یہ ہیں کہ بالکل سلجھے ہوئے انداز میں کسی بات کو کسی سے کہہ دیا جائے۔ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس کا ذمہ دار وہ کہنے والا نہیں ہے۔ اسے تبلیغ کہتے ہیں۔

سمجھ میں آیا نہ آپ کے؟

آپ کا کیا مقصد ہے؟ تبلیغ، کہ نہ میں تبلیغ کے لیے نہیں آیا۔ نہ آپ کے، آپ کا کیا مقصد ہے؟ تبلیغ، کہ نہ میں تبلیغ، کہ نہ میں تبلیغ کے لیے نہیں آیا۔ میرے اللہ نے، میرے آنے کا مقصد تبلیغ کے علاوہ مقرر کیا ہے۔ کیا؟ کہ الکِتَاب وَ الْحِکْمَۃ میرا مقصد تبلیغ نہیں تعلیم ہے۔ یاد رکھنا کہ جب بچہ مدرسے میں داخل ہو تو اسے پہلی کتاب جو دی جاتی ہے، وہ قاعدہ ہے۔ تعلیم کا قاعدہ یہ ہے جو لفظ بچے کو بتایا جائے، اس کے سامنے اس کی تصویر بھی بنا دی جائے۔ یہ طریقہ تعلیم ہے۔ الف سے آم، تو آم کی ایک تصویر بھی ہو۔ اور س سے سانپ۔ سانپ کی ایک تصویر بھی ہو۔ ش سے شیر، شیر کی ایک تصویر بھی ہوتا کہ ادھر بچے کے ذہن میں ہو شیر، ادھر بچے کے دماغ میں ہو شیر کی تصویر۔ دونوں چیزیں جب ذہن میں ہوں تب مقصدِ تعلیم پورا ہوتا ہے۔

اگر یہ تصویر کا قاعدہ کسی بچے نے پڑھا ہے اسے یہ تو یاد ہے۔ ش سے شیر، شیر کی تصویر نہیں دیکھی اس نے۔ وہ باپ کے ساتھ گیا لاہور۔ ابا مجھے چڑیا گھر دکھانے چل۔ ابا اسے چڑیا گھر لے گیا۔ بچے نے پوچھا: ابا یہ کیا ہے؟ کہ بیٹے یہ شہر کا پنجرہ ہے۔ اب یہ تو یاد تھا اسے ش سے شیر، تصویر نہیں دیکھی تھی اس نے شیر کی۔ وہ شیر کا پنجرہ دیکھ کر۔ اس میں ایک گدھا باندھ کر رکھا تھا۔ اس بچے نے شیر کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ وہ شیر کی جگہ بیٹھا دیکھ کے گدھے کو، شیر سمجھ بیٹھا۔ اگر کہیں وہ ش سے شیر کی تصویر بھی دیکھ چکا ہوتا تو لاکھ اس کا باپ بھی کہتا کہ بیٹا یہ شیر ہے۔ وہ کہتا: ''ابا کیوں جھک مارتا ہے میں تو شروع میں ہی دیکھ چکا ہوں شیر کی تصویر، یہ تو کوئی اور ہے، جو شیر کی جگہ آ گیا ہے۔ سمجھ میں آیا تو قاعدہ یہ ہے تعلیم کا۔ جو بات کہی جائے اس کی تصویر بھی ساتھ ہو۔ دیکھ جو میں کہہ رہا ہوں یہ اس کی تصویر ہے۔ دیکھو یہ کہہ رہا ہوں، یہ اس کی تصویر ہے۔

سمجھے نا حضور!

تصویر سے قطع نظر کرنے والے طالب علموں نے دھوکا کھا لینا ہے اور نظر میں اگر کتاب اور تصویر دونوں رہیں تو طالب علم کبھی دھوکا کھا سکتا ہی نہیں۔ اسے کبھی مغالطہ لگ

سکتا ہی نہیں۔

میری بات اچھی طرح ذہن میں آ گئی نا آپ کے؟

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میرا مطلب یہ کہ کہ رسولؐ کا نام ہے ہمارے رسولؐ کا کام ہے کہ وہ مبلغ نہیں بلکہ معلم ہے۔ معلم تعلیم دیتا ہے تو تعلیم کے لیے سارے لوازمات تعلیم رسولؐ کے پاس موجود ہیں۔ رسولؐ خود معلم ہے۔ اس کا ماحول جو ہے وہ درسگاہ ہے۔ اس میں آنے والے جو ہیں، وہ طلبہ ہیں۔ سمجھے؟ ان کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ ان کو پاس فیل کی ڈگری بھی ملتی ہے۔ کوئی اس میں مڈل پاس کرتا ہے، کوئی میٹرک تک چلتا ہے، کوئی بی، اے تک جاتا ہے۔ کوئی ایم، اے تک پڑھتا ہے۔ کوئی پی ایچ ڈی ہو جاتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ کالج میں جتنے داخل ہوں سب یکساں ہوتے ہیں۔ دماغ کے اختلاف کے مطابق کوئی ڈاکٹر ہو گیا۔ کوئی وکیل ہو گیا۔ کوئی انجینئر ہو گیا۔ کوئی جرنیل کرنیل ہو گیا۔ اب ہر ایک سے توقع رکھیں کہ وہ اچھا جرنیل ہے، یہ غلط ہے۔ ہر ایک سے یہ توقع رکھیں کہ وہ اچھا ڈاکٹر بنے، یہ غلط ہے۔ جیسا جیسا جس کا دماغ، جیسی جیسی جس کی طبیعت، ویسا وہ بن جاتا ہے۔ کوئی اچھا تاجر بن گیا۔ کوئی اچھا سمگلر بن گیا۔ تو غرض جیسا جیسا دماغ ویسے ویسے وہ بن جاتا ہے۔ طلبہ سارے، انجام کار یکساں بنیں بنتے تو رسولؐ ہیں معلم ان کا جو مال ہے وہ ہے درسگاہ۔ اس میں داخل ہونے والے ہیں طلبہ اور لطف یہ کہ فیس کوئی نہیں۔ آؤ بھی بسم اللہ داخل ہو جاؤ۔ پھر طلبہ کے لیے عمر کی قید بھی نہیں۔ جس عمر کا طالب علم آنا چاہے آؤ بسم اللہ تشریف لاؤ، بیٹھ جاؤ۔ پھر کسی وطن، کسی علاقے کی قید بھی نہیں۔ کوئی کوٹہ مقرر نہیں ہے کہ ایران سے اتنے اور عرب کے اتنے اور روم کے اتنے۔ جہاں کا ہو آ جائے، ڈھائی سو برس والا، بسم اللہ، یہ، یہ،، سو برس کا ہے۔ بسم اللہ تم بھی آ جاؤ۔'' یہ صاحب ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں۔ بسم اللہ تم بھی آ جاؤ۔ عمر کی کوئی قید نہیں۔ جیسا جیسا طالب علم ہی آتا رہے، اس کے مطابق اسی پڑھایا جائے گا۔ تو اس طرح یہ درسگاہ ہے۔ خوب سمجھ میں آ رہی ہے، نا بات صاحبان کے؟

یہ کالج ہے، یہ درسگاہ ہے جس میں مختلف جماعتوں میں مختلف ملکوں اور طبیعتوں کے طلبہ داخل ہیں۔ اور اپنی اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق وہ علم حاصل کر رہے ہیں۔ معلم ذرہ برابر بھی کوتاہی کسی پڑھانے میں نہیں کرتا۔ سب پہ یکساں توجہ کرتا ہے۔ یکساں سب سے سلوک کرتا ہے۔ سب سے مہربانی سے پیش آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گھر جا کے اپنے بچوں کو ٹیوشن کے طور پر پڑھا دیتا ہے۔ باقی مدرسے میں سب کے ساتھ یکساں سلوک ہے۔ مدرسے میں سب کو یکساں طور پر پڑھاتا ہے۔ یہ ہمارا رسول معظم ہے۔ درسگاہ ہے۔ کالج ہے تو اس میں درجات بھی ہیں۔ یہ میٹرک ہے، یہ ایف اے ہے تو اس کے درجات جو ہیں۔ وہ جو سلیبس کی کتاب ہے۔ اس درسگاہ کی جہاں نصابِ تعلیم اس کا مقرر کیا ہے۔ وہاں اس کے درجات بھی مقرر کیے ہیں۔ پہلی کلاس یہ ہے، دوسری کلاس یہ ہے، تیسری یہ ہے چوتھی یہ ہے۔

سمجھے!

وہ کلاسیں جہاں مقرر ہوئی ہیں وہ آیت میں آپ کو سنا کر پھر مجلس شروع کرتا ہوں۔ اب آپ حضرات نے میری بات پر غور کرلیا ہے اچھی طرح سے؟ آ گئے نا مدرسے میں۔ آ گئے تم؟ امتحان دینا پڑے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ چھ مہینے میرا سر کھپاؤ اور امتحان کے وقت بھاگ جاؤ۔ یہ نہیں ہوسکتا، یہ غلط ہے، امتحان بھی دینا پڑھے گا۔ اگر آ گئے تو سال بھر بیٹھے رہے کہ یہ پڑھاؤ اور جب میں امتحان کے لیے لے جاؤں تو بھاگ جاؤ یہ نہیں ہو سکتا۔ امتحان بھی دینا پڑے گا۔

سمجھے حضور؟

اور یہ امتحان بڑی نامراد شے ہے۔ یہ بچے جو امتحان دیتے ہیں ان سے پوچھو! بڑی ہی نامراد شے ہے یہ امتحان، امتحان کے سنٹر سے بڑھ کر کوئی جیل نہیں ہے۔ کوئی خطرناک جگہ نہیں جتنا امتحان کا سنٹر خطرناک ہوتا ہے۔ جتنی وہ جیل بری ہوتی ہے۔ امتحان بڑی سخت چیز ہے۔

یاد رکھو دوستو! میری بات کو بھولنا نہیں۔ ان باتوں کو یاد رکھنا۔

امتحان انسان کا بھی ہوتا ہے۔ امتحان حیوانوں کا بھی ہوتا ہے۔ درختوں کا بھی ہوتا ہے۔ پتھروں کا بھی ہوتا ہے۔ آپ زمیندار ہیں، آپ تو گندم کا امتحان لیتے ہیں۔ یہ کس قسم کی ہے؟ اور یہ کس قسم کی تب اسے کاشت کرتے ہیں۔ کپاس کا امتحان لے کر، کون سی؟ کس قسم کی ہے؟ تب اسے کاشت کرتے ہیں یا نہیں۔ پتھروں کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ حیوانوں کا بھی۔ ضلع سرگودھا میں وہ کیا نام ہے؟ ڈپو، کیا نام ہے اس کا؟؟ موناڈپو۔ اس میں گھوڑے پلتے ہیں، فوج کے لیے تو ہر سال جو گھوڑے تیار ہوتے ہیں نا وہ جاتے ہیں فوج میں۔ یہ نہیں کہ جتنے گھوڑے موناڈپو میں تیار ہوئے وہ فوج میں چلے گئے سارے۔ ایک ماہر آ کے ان کا امتحان لیتا ہے۔ گھوڑوں کا۔ بڑے بڑے تیار، تندرست، اعلیٰ درجے کے گھوڑے، بچھڑے سامنے کھڑے ہیں۔ اس نے ان میں سے دس چھانٹ لیے باقی ان فٹ کر دیئے۔ وہ تو بڑے خوبصورت، شاندار تھے۔ یہ کیوں ان فٹ کیے تم نے؟ کہ ہمارا معیار ہے امتحان کا؟ ہم نے انہیں فوج میں لے جانا ہے۔ ہم نے ان سے توپیں کھنچوانی ہیں۔ تو ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ فوج میں جو گھوڑا لے جائیں جو توپ کھینچ کے میدان میں لے جائے۔ چاہے گولے برسیں، چاہے ہوائی جہاز اوپر سے بم باری کریں، چاہے کچھ ہو وہ کہیں توپ لے کے بھاگ نہ جائے۔ سینہ سپر ہونا چاہیے اس کو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری توپ ہی کو لے کر بھاگ جائے نامراد۔

دوسرے یہ کہ جنگ کے میدان میں ہمیں ہفتوں، مہینوں، خندق میں رہنا پڑتا ہے۔ دشمن کو پتہ چلے کہ ہم کہاں ہیں؟ وہیں ان گھوڑوں کو ہمارے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ یہ صفت ہو اس میں کہ اگر کہیں دشمن کے خطرے سے چھپنا پڑے تو کہیں ہنہنانے نہ لگ جائے۔ ایسے گھوڑے دراصل ہوتے ہیں نامراد۔ اسی بات کا ان کا امتحان ہوتا ہے۔ تو ہر چیز کا امتحان ہے۔

رسولؐ کا ایک مکتب ہے۔ کالج ہے۔ مدرسہ ہے۔ حضورؐ معلم ہیں۔ دنیا ان کی

طالب علم ہے۔اس کی کلاسیں ہیں۔ یہ پہلی ہے، دوسری ہے، یہ تیسری ہے۔اب یہ ان کی توفیق ہے کہ جس کلاس کا کوئی پاس کر لے۔ان کلاسوں کو ترتیب سلیبس میں ہے۔وہ یوں ہیں: بھائی!

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط والعصر ان الانسان لفی خسر پہلی کلاس ان الذین آمنوا، دوسری کلاس وعملوا الصالحات تیسری کلاس و تواصوا بالحق، چوتھی کلاس وتواصوا بالصبر پانچویں کلاس۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کون انسان کس کلاس میں کامیاب ہوتا ہے۔کون داخل ہونے ولا کس کلاس؟ان الانسان لفی خسر ہنسنا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ طالب علم تو بڑا پرانا ہو اور خسر سے ہی راضی ہو جائے۔ یہ پہلی کلاس ہے۔ان الانسان لفی خسر بالکل پہلی کلاس ہے۔اس میں تم داخل ہوئے آ کے۔اس میں تم سب نقصان میں ہو۔سب گھاٹے میں ہو۔ یہ گھاٹا کیا ہے انسان کو؟ نقصان کیا ہے انسان کو؟ اس میں بڑی تفصیلیں ہیں قبلہ! یہ ساری تفصیلات آپ کے سامنے بیان کرنے کے لیے بڑا وقت چاہیے کہ انسان کہاں کہاں، کس کس طرح نقصان میں ہے۔گھاٹے میں رہتا ہے۔

یہ وہ کلاس ہے جس میں سب شامل ہیں۔لفی خسر والی اب اس کلاس کو پاس کیا کس نے؟ آگے کلاس آئی ان الذین آمنوا یہ ہے گٹویا کچی کلاس۔اب تم آمنوا بن گئے۔آمنوا کے معنی کیا ہیں؟ تمہارے مزاج میں، تمہاری طبیعتوں میں، تمہارے اخلاق میں، تمہاری عادات میں امن پسندی پیدا ہو۔ یہ ہے امن آمنوا کوئی ایسی شے نہیں جو آسمان سے برستی ہو۔کوئی لباس نہیں جو آدمی کو پہنا دیا جاتا ہو۔کوئی اور رنگ نہیں جو آدمی پر چڑھا دیا جاتا ہو۔آمنوا کا لفظ ''ایمان'' سے اور ایمان کا لفظ ''امن'' سے بنا ہے۔یعنی اب تم میں جھگڑا فساد نہیں رہا۔لڑائی فساد نہیں رہا۔خواہ مخواہ کو الجھنا نہیں رہا۔اب تم امن پسند بن گئے ہو یا نہیں۔

سمجھے نا حضور!

اب امن والی کلاس کا جو معلم ہوگا وہ خود ایسا نہ ہو کہ اس امن میں اس درجے پر پہنچ چکا ہو کہ امن قائم رکھنے کے لیے باوجود طاقت کے دنیا بھڑکاتی رہے۔ کچھ بھی کہتی رہے، مگر وہ امن کی خاطر اپنے حقوق کو چھوڑ کر خاموش بیٹھ جائے۔ ایسا امن پسند، کُلِ ایمان کہلا کر آمنوا کا مصداق بن جاتا ہے۔ ایسا ہی معلم دوسروں کو امن سکھا سکتا ہے۔ تم آمنوا کلاس پاس کر چکے، اس لیے تمہارا نام آج سے ہوگا امیر المومنینؑ۔ یہ مومنین کی کلاس تمہیں مبارک ہو۔

امیر تو چھوٹی سی چیز ہے، یہ اور بلند ہوگا۔ یہ نہیں کہ امیر المومنین پہ جا کے بات ختم ہوگئی۔

سمجھے حضور!

اب تم آمنوا کلاس کو پڑھانا۔ تم ہوا میر المؤمنین۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے بعد ہے عملوا الصالحات محض پُر امن بن کے بیٹھ جانا ہی کافی نہیں۔ آرام سے بیٹھے ہیں۔ کہہ دیا کہ امن ہے۔ گھر بیٹھے ہیں بڑے حوصلے سے۔ کیا ہے؟ کہ امن ہے۔ یہ امن نہیں سمجھ میں آیا نہ آپ کے۔ کسی کے گھر میں آگ لگ رہی ہے۔ اندر بیٹھے ہیں۔ ہم تو نہیں جاتے کہ کیا ہے؟ جی امن ہے۔ گھر دوسرے کا جلے، تم آرام سے بیٹھو، اس کا نام امن رکھو۔ یہ ہے دنیا کی سب سے بڑی حماقت اور سب سے بڑی ذلالت۔ اپنا گھر جل رہا ہو اور ہائے نہ کرے آدمی۔ یہ اور بات ہے۔ گھر کسی کا جلے، صبر ہم کریں، کیا ہے جی؟ امن ہے۔ یہ بات دنیا کی سب سے بڑی ذلالت ہے۔

سمجھے نا حضور!

تو امن یہی نہیں ہے کہ جی آرام سے بیٹھے۔ کیا ہے جی؟ امن ہے۔ غلط ہے۔ اسے امن نہیں کہتے۔

توجہ ہے نا حضور والا!

اسے امن نہیں کہتے۔ امن کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ عملوا

الصالحات بھی ہوں۔تم ہاتھ پاؤں توڑ کے نہ بیٹھ جانا بلکہ جو نیک کام ہیں وہ بھی کرتے رہو۔اب یہ جو نیک کا لفظ ہے نا۔ یہ بڑا مشکل لفظ ہے۔حضور! ہر آدمی کے مزاج کے مطابق نیک کام کا معیار الگ الگ ہوتا ہے۔ نیک کام ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔ایک کام ایک کے لیے نیک اور عبادت ہے۔ وہی کام دوسرے کے لیے بد اور بدعت ہے۔ نیک کا معیار الگ الگ ہے، سمجھے؟ کوئی کسی بات کو نیک سمجھتا ہے، کوئی کسی بات کو، کلاس کے لڑکے بیٹھے ہیں۔ایک نے کہا چل یار دوڑیں سیر تفریح کر لیں۔اس کے نزدیک بہت کمال ہے یہ کہ کلاس سے بھاگ کے کھیلا جائے۔ کھیل رہے ہیں کسی کے نزدیک یہ نیکی ہے۔ وہ بیٹھ کے پڑھ رہے ہیں۔اپنی اپنی بات ہے۔اصل میں نیکی کا معیار اگر ہم اپنی عقل سے فیصلہ کرنا شروع کر دیں تو پھر نیکی ایسا عجوبہ بن جائے کہ دنیا میں کہیں اس کا وجود نہ پایا جائے۔ ہر ایک الگ الگ شے کو نیکی سمجھے گا۔کوئی کسی بات کو، کوئی کسی بات کو۔ایک مصیبت بن جائے گی یا نہیں لہٰذا ضروری ہے کہ نیکی کے کام کو طے کرنے کے لیے کہ عَمِلُوا الصَّالِحَات کیا شے ہے؟ یہ طے کرنے کے لیے معلم ہی کی طرف رجوع کیا جائے۔

جناب آپ فیصلہ کریں کہ یہ اس کا معیار کیا ہے؟ ہمارے کرنے سے نہیں۔ ہم تو اپنے اپنے مزاج کے مطابق صالحات بنائیں گے۔ آپ بتائیں کہ عمل صالح کیا ہے؟ تاکہ ہم ایمان کے بعد وہ عمل صالح کریں۔ اور چونکہ آپ معلم ہیں، لہٰذا جو عمل صالح آپ ہمیں بتائیں وہ محض محض بتائیں ہی نہیں اس لیے کہ آپ مبلغ نہیں ہیں۔ وہ کر کے دکھائیں۔آپ مبلغ نہیں ہیں جو صرف بتائیں۔آپ معلم ہیں۔عملِ صالح ہمیں کر کے دکھائیں۔اس نے کہا: اچھا! ٹھہرو، آؤ۔تمہیں کر کے دکھاتا ہوں۔تم دیکھتے رہنا، چونکہ یہ عمل کا معاملہ ہے، یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔قول کا معاملہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو میں تمہیں عمل صالح دکھاتا ہوں۔ دیکھو! اے، اے، یہ ہے عملِ صالح۔ دیکھو اسے۔نماز سن کے نہ پڑھنا۔ میں نے کہہ دیا۔نماز پڑھو تم نے پڑھ لی نا؟ صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي

دُصَلِّی دیکھو مجھے میں کس طرح نماز پڑھتا ہوں۔ دیکھو!، آؤ دیکھو! نماز عمل صالح جب بنے گی، جب مجھے دیکھ دیکھ کر میرے طریقے سے نماز پڑھو گے۔ دیکھتے رہو اچھی طرح۔ دیکھ رہے ہو۔ ہیں؟ دیکھ رہے ہو نا؟؟ دیکھو کہاں نماز ٹوٹتی ہے۔ کہاں نماز مکمل ہوتی ہے۔ دیکھتے رہو۔ اگر نماز پڑھتے ہوئے ایک آدمی نے گھڑی کو چابی دینا شروع کر دی۔ ٹوٹ گئی۔ یہ زائد عمل ہے۔ اس سے غلط ہو جائے گا۔ نماز پڑھتے پڑھتے کسی روتے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ نماز ٹوٹ گئی نا؟ یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا، پھر اگر ان افعال سے نماز ٹوٹتی ہے، کسی معلم نے بتایا ہے تو یہ دیکھتے رہو کہ کہاں نہیں ٹوٹی۔ اگر بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دو ٹوٹ گئی اور بچے کو گھنٹہ بھر کمر پر بٹھائے رکھو تو نہیں ٹوٹتی۔ یہ معلم بتاتا ہے ہمارے کالج کا۔

سمجھے! تمہارے فیصلے سے نہیں ہوگا۔ یہ معلم بتائے گا کہ عَمِلُوا الصَّالِحَات ہیں کیا شے؟ کہاں نماز میں نقص آتا ہے؟ کہاں نماز پوری ہوتی ہے؟ یہ معلم سمجھاتا ہے، سمجھے! کسی سے عداوت نہ کرو۔ کسی سے جھگڑا نہ کرو۔ تمہیں کوئی حق نہیں کسی کو برا یا بھلا کہنے کا۔ معلم کو دیکھو جا کے وہ کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے نماز پڑھو اور نمازی کی مقبولیت کے لیے درود شریف پڑھو۔ پڑھو درود شریف۔ اللھم صل علی محمد و آل محمد و اصحاب محمد یہی درود شریف ہے۔ کیا نماز میں یہی درود شریف پڑھو گے؟ نہ۔ وہاں نہیں پڑھنا، کیوں؟ کہ نماز نہیں ہوگی کہ وہاں کتنی پڑھی ہے کہ بس آلِ محمدؐ تک اور نماز کے بعد، پھر اصحابِ محمدؐ اور نماز میں اگر اصحابِ محمد کہہ دو تو نماز نہیں ہوگی اور اگر آلِ محمدؐ نہ کہو تو نماز نہیں ہونے کی۔

یہ عملِ صالح بتایا کہ دیکھو ہم کسی کو برا نہیں کہتے مگر آل اور اصحاب میں یہ فرق ہے کہ آل کا نام نہ لینے سے نماز غلط اور اصحاب کا نام لینے سے نماز غلط۔ اگر وہاں اصحاب کہہ دو تو نماز غلط۔ آل نہ کہو تو نماز ہوگی؟ نہیں۔ یہ عمل صالح ہے جو ہمیں بتایا۔ دیکھو ادھر آؤ۔ جس طرح میں عمل کروں اسی طرح عملِ صالح بنتے ہیں۔ تمہارے لیے یہ قانون ہے اللہ کا، کیا؟

''یاد رکھو مسلمانوں، اتنے ادب سے رہنا رسولؐ کے سامنے کہ تمہاری آواز رسولؐ کی آواز سے کم آواز میں بولنا۔ خبردار اس کی آواز سے تمہاری آواز بلند نہ ہونے پائے۔'' رسولؐ کے ساتھ تمہارا برتاؤ قد جھر بعضکم بعضا نہ ہو۔ جس طرح تم آپس میں ملتے ہو اس طرح نہ ملنا کہ گلے مل رہے ہیں۔ ہاتھ ملا رہے ہیں۔ نہ اس کا فرق رکھنا۔ رسولؐ کا یہ ہے تمہارے لیے، مسلمانوں کے لیے۔ یہ حکم ہے۔ نماز پڑھ رہے ہو اور رسولؐ نے آواز دی۔ اِدھر آؤ، فوراً اگر تم نے نماز کی وجہ سے اس کی تعمیل نہ کی تو مر گئے، کفر ہے۔ فوراً رسولؐ کے جواب میں یہ ہمیں حکم ہے۔

سمجھے حضور!

یہ عملِ صالح ہے ہمارے لیے۔ یہ ہمارا عملِ صالح ہے۔ مگر ہم رسولؐ کا عمل صالح کیا دیکھ رہے ہیں؟ کہ ہم تو آواز اونچی نہیں کر سکتے۔ اس کے بلائے پہ نہ بولیں تو کفر ہو جائے، اس کے آگے چل پڑیں تو کفر ہو جائے۔ اس کے سامنے بے ادبی سے بیٹھیں کفر ہو جائے۔ اس کے گھر میں جھانکنا مت۔ خبردار! کفر ہو جائے گا۔ اگر وہ تمہیں کھانے پہ بلائے اس کے برتنوں کو نہ دیکھنا کہ یہ کس چیز کا ہے؟ یہ کس چیز کا ہے نہ دیکھنا۔ کفر ہو جائے گا، جس فرش پہ وہ بیٹھا ہے اس پہ بچ کے ادب سے بیٹھو ورنہ کفر ہو جائے گا۔ یہی ہوا تھا نا کہ ام المؤمنین حضرت حبیبہؓ! ام المؤمنین رسولؐ کی زوجہ محترمہ حضرت ابوسفیان کی بیٹی، معاویہ کی حقیقی بہن، یزید کی سگی پھوپھی، جناب ام حبیبہؓ کے گھر ابوسفیان آئے۔ بیٹی نے سلام کیا۔ کھڑے ہو کے تعظیم کی۔ بیٹی! باپ تھے جب بیٹھنے لگے تو کہا: ابا ذرا ٹھہرنا۔ اب جو دری بچھی تھی، لپیٹ لی۔ بسم اللہ ابا تشریف رکھو، زمین پر۔ تو ابوسفیان نے بڑے رُعب سے کہا: ام حبیبہ! جانتی ہو میں کون ہوں؟ میں عرب کا بے تاج بادشاہ ہوں۔ میں فوجیں اکٹھی کر سکتا ہوں محمدؐ کے مقابلہ میں۔ عرب میں میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ تو مجھے اس پھٹی ہوئی دری پہ نہیں بیٹھنے دیتی۔ ام حبیبہؓ نے کہا: یہ رسولؐ کے بیٹھنے کی ہے۔ تم چاہے کچھ بھی سہی نہیں بیٹھ سکتے۔ آج مسلمانوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور وجد آتے ہیں لوگوں کو

کہ ام حبیبہؓ کیا کہنے تیرے۔ ام المؤمنین ہو تو ایسی ہو جو رسولؐ کی جگہ باپ کو نہ بیٹھنے دے۔ ام المؤمنین کی یہ شان ہے۔ یہ اس کا احترام ہے۔ یہ عمل صالح ہے۔ ہمارے واسطے میں زیادہ تشریح میں نہیں جاتا مگر ادھر تو رسولؐ کا یہ احترام کہ اس کی جگہ کوئی نہ بیٹھے۔ کہیں اس کی دری پہ کوئی نہ بیٹھ جائے۔ اس کے سامنے کوئی اونچا بولے نہیں۔ اسے آواز نہ دو۔ اس کے سلام کا طریقہ بھی اور ہونا چاہیے۔ دیکھو اس کا پکارنا جب وہ گھر میں ہو یہ کرنا اور ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی رسولؐ ایک بیٹی کو دیکھ کر فوراً سر جھکائے تعظیم کو کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ عملِ صالح کی تعظیم ہے جو ہمیں سکھائی۔ یہ عمل صالح ہے جو ہمیں سکھایا جا رہا ہے کہ دیکھو! اسے عملِ صالح کہتے ہیں۔

نری نمازوں پہ نہ اکڑنا۔ نرے روزوں پہ ناز نہ کرنا۔ نرے قرآن پڑھنے پہ نہ اکڑنا۔ داڑھیوں کو بڑھانے پہ ناز نہ کرنا۔ دیکھو یہ عملِ صالح بھی سیکھو۔ یہ دو سال کی بچی ہے۔ ڈھائی سال کی بچی ہے یہ آ رہی ہے اور دیکھو! اے، اے یہ دیکھو! میں رسولؐ کی تعظیم کو کھڑا ہوں۔ یہ دیکھتے رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہوا۔ گھر میں، صحن میں، کمرے میں، باورچی خانے میں کہیں ایسا نہیں ہوا کہ رسولؐ بیٹھے ہوں، بیٹی آئی ہو اور فوراً تعظیم کو نہ اُٹھے ہوں۔ اسی وقت تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے اور جب رسول اُٹھتے تھے تعظیم کو جو پاس بیٹھی ہیں امہات المؤمنین یا اصحاب ان کی کیا مجال ہے جو وہ نہ اُٹھتے ہوں وہ یقیناً اُٹھتے ہوں گے یہ عملِ صالح ہے۔

یہ تیسری کلاس ہے رسول کے مکتب کی کہ عمل صالح بھی ہونا چاہیے جو رسولؐ نے بتایا ہے کہ دیکھو! اے، اے۔ یہ عملِ صالح ہے اور جب عملِ صالح کا امتحان بھی پاس کر لو گے۔ جب اس امتحان میں تم پورے اُتر جاؤ گے تو پھر تمہاری اگلی کلاس آئے گی، تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کہ حق کا دامن بھی پکڑو۔ اب یہ کلاس آئے گی۔

سمجھے نا حضور!

اور جب حق کی کلاس میں پاس ہو جاؤ گے تو پھر وتواصوا بالصبر والی بات

آئے گی۔یعنی صبر کی۔بس یہ آخری کلاس ہوگی۔وَتَوَاصَوا بِالصبر جو ہے یہ بالکل آخری کلاس ہے؟

سمجھ میں آ گئی ناصاحبان کے۔

بس بھئی جو بات تھی نا ان کی وہ یہیں ختم ہوگئی۔یہ مدرسے کا تعارف تھا آپ سے۔ یہ جو مجالس ہیں یہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ یہ امام زین العابدین علیہ السلام کے ذکر میں ہیں۔یہ مجلس کربلا کی عزاداری کے سلسلہ میں یہ مجلسیں ہیں اور بعض لفظوں میں اور ناموں میں اللہ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ ان ناموں سے ایک اثر پیدا ہوتا ہے۔مثلاً اگر رستم کا نام لو تو خود بخود تصور آتا ہے طاقت کا اور زین العابدینؑ کچھ نہ کہو بالکل، خود بخود تصور آتا ہے انتہائی مظلومیت کا۔

دنیا کے سب سے بڑے مظلوم اعظم کی یادگار میں مجلسیں ہیں اور میں بلاخوفِ تردید پوری زمہ داری سے کہتا ہوں کہ واتواصوا بالصبر کے امتحان میں جتنا یہ انسان کامل کامیاب ہوا۔جسے زین العابدینؑ کہتے ہیں نہ اس سے پہلے کوئی ہو سکا نہ بعد میں۔ وتواصوا بالصبر کے امتحان میں یادرکھو کہ زین العابدین کا ذکر نامکمل ہے۔جس طرح خدا کا کلمہ لا الہ الا اللہ نامکمل ہے، بغیر محمد رسول اللہؐ کے اسی طرح ذکرِ زین العابدین نامکمل ہے جب تک اس کی شریکِ صبر زینب سلام اللہ علیہا کا ذکر نہ ہو۔

سمجھے زینبؑ شریک حسینؑ بھی ہے۔شریک زین العابدینؑ بھی ہے۔کربلا کے معرکے کی ہرو ہے۔مرکزی کردار ہیں۔یہ دونوں پھوپھی، بھتیجا اور جب تک حسینؑ کا سر نیزے پہ نہیں آیا، زینب سلام اللہ علیہا کا قدم خیمے سے باہر نہیں نکلا۔بالکل آیا ہی نہیں۔ حسینؑ کہہ گئے تھے بہن میری ایک بات یادرکھنا۔بس گھر سے باہر نہ آنا کہ حسینؑ نہ آوں گی نہ آوں گی کہہ جو دیا تجھ سے کہ نہیں آؤں گی۔اگر اس حکم کے بعد زینب سلام اللہ علیہا گھر سے باہر ایک قدم بھی باہر رکھ دیتی تو آج یہ مشہور ہوتی کہ جناب عورتوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ باوجود سمجھانے کے گھر سے نکل آتی ہیں، اسی لیے زینب سلام اللہ علیہا نکل

آئی۔ نہ بالکل نہیں۔ اکبرؑ، شہید ہو یا عونؑ محمدؑ چاہے حسینؑ خود کیوں نہ شہید ہوں۔ کہہ جو گئے ہیں، گھر سے باہر نہیں آنا۔ بس نہیں آنا زینب شریکِ عمل ہے امامؑ زین العابدینؑ کی۔

سمجھے حضور!

جس وقت حسینؑ اپنا کام ختم کر چکے تو اس نے آ کر جگایا ہے امام زین العابدینؑ کو۔ بیٹا اُٹھو! تم غور نہیں کرتے۔ قُم یَابُنَیَّ ''بیٹا اُٹھو۔'' پتہ نہیں کتنی دفعہ پکارا ہے بیٹا بیٹا کہہ کے۔ بیٹا اُٹھو۔ امامؑ نے آنکھ نہیں کھولی۔ بیٹا کہہ کے پکارتی رہیں۔ سمجھ گئیں۔ ایک دم جوش میں آ کے کہتی ہیں:

قُم یَا اِمَامَ زَمَاننَا

''میرے زمانے کے علیؑ اُٹھ میری مدد کر۔''

اے امام زمانہؑ اُٹھ۔ اب بیٹا نہیں کہا۔ اب امامؑ کہا: امام کہہ کے جو پکارا۔ رفوراً اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ اب یہ ذمہ داری ہے کہ ''اماں کیا کہہ رہی ہو؟ کہ بیٹا تو اس وقت زمانے کا امام ہے۔ اس فقرے سے ہی سمجھ گئے کہ کیا ہوگا۔ بیٹھ گئے اُٹھ کے۔ ذرا خیال نہیں کہ بیماری ہے یا تکلیف ہے۔ اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ اچھا ماں! میں امام ہوں؟ کہ ہاں بیٹا تو امامؑ ہے۔ امام زمانؑ ہے اور میں تیری پھوپھی زینب سلام اللہ علیہا ہوں۔ اماں نے پہچان لیا کہ بیٹا تو مجھے پہچانتا ہی ہے۔ ضرورت مجھے ہے تجھے پہچاننے کی۔ ورنہ میں جاہلیت کی موت مر جاؤں گی۔ بیٹا اگر تجھے نہ پہچانا تجھے ضرور پہچاننا ہے تو زمانے کا امامؑ ہے۔ اماں تجھ سے بہتر معرفت امامؑ کسی کو نہیں۔ بیٹا یہ تو بات ہو چکی۔ اب میں تجھ سے بحیثیت امامؑ کے یہ حکم لینا چاہتی ہوں کہ جن خیموں سے حسینؑ کہہ گئے تھے باہر نہ آنا وہ سب جل گئے۔ جن خیموں سے باہر نہ آنے کو حسینؑ نے منع کیا تھا وہ خیمے کچھ جل گئے کچھ جل رہے ہیں۔ اب میرے یتیم بچے ہیں۔ بیوہ عورتیں ہیں اور بیٹا یہ بھی سن لے کہ میں بڑا شرمندہ ہو رہی ہوں ان عورتوں سے۔ کسی کا شوہر مر گیا ہے، کسی کا بھائی مر گیا ہے۔ یہ غیر

خاندانوں کی ہیں۔ میں ان سے شرمندہ ہوں۔ ہماری حمایت میں یہ سب تباہ ہوگئیں۔ میں ان سے ایک ایک کو سمجھا رہی ہوں۔

بیبیو! تمہارا بڑا احسان ہے اور بیٹا! سب سے زیادہ شرم مجھے اپنی بھرجائیوں سے آتی ہے۔ بڑے بڑے گھرانے کی خواتین ہیں۔ ہمارے گھر میں ان کی شادیاں ہوئی تھیں۔ میں ان کے سامنے بڑا شرمندہ ہو رہی ہوں۔ وہ کیا سوچتی ہوں گی کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی بہو بن کے یہی حال ہونا تھا۔

بیٹا! میں بڑی مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ تو زمانے کا امامؑ ہے۔ مشکل کشا ہے۔ میں تجھ سے حکم لینا چاہتی ہوں۔ دل میرا بڑا گھبرا گیا ہے۔ آخر خاتون ہوں۔ میرا دل بڑا گھبرا گیا ہے۔ تو امامِ زمانہؑ ہے۔ حکم دے کہ ان سب عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر تیرے حکم کی دیر ہے ان ہی خیموں میں جل کر مر جاؤں۔ میں ذرا دریغ نہیں کروں گی اس بات سے۔ حکم دے۔ جل کے مر جاؤں؟ کیا کروں بتا؟ میں آپ کو کیا بتاؤں؟ اس وقت امام زین العابدینؑ پہ کیا گذر گئی۔ اس کا اندازہ دنیا کا کوئی انسان نہیں کر سکتا ہی نہیں، جب آپؑ نے پھوپھی کو حکم دیا ہے عَلَیْکُنَّ بِالصَّحرا اماں بحیثیت امامؑ میں یہ حکم دیتا ہوں کہ ان سب کو لے کے خیموں سے باہر آ جاؤ۔ کوئی بچہ جل نہ جائے۔ باہر نکل جاؤ۔ اس حکم کے دیتے وقت جو گذری ہے۔ حضرت امام زین العابدینؑ پر اس کا اندازہ کوئی کر سکتا ہی نہیں کہ کیا گذری اس وقت اور نکل گئے۔

میرے محترم سامعین!

یہ سب ہماری باتیں ہیں، ہم جو آپ سے کہہ دیتے ہیں کہ انہیں جلا ہوا خیمہ کسی نے دے دیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔ ان کے خیمے کا ایک ذرہ جل گیا تھا۔ جب نکل گئیں نا باہر۔ جب باہر آ گئیں۔ آ کے ریت کے ٹیلوں پہ بیٹھ گئیں۔ اب ان کے سامنے کیا تھا۔ ان مستورات کے ایک طرف جلے ہوئے خیموں کی راکھ اور ایک طرف بے سر کے لاشے۔ کبھی اِدھر، دیکھ رہی تھیں، کبھی اُدھر دیکھ رہی تھیں اور اٹھارہ بھائیوں کی بہن بیٹھی یہ سوچ

رہی تھی کہ کیا ہوگیا۔ کیا ہوگیا؟ یہ سوچ رہی تھی اٹھارہ بھائیوں کی بہن اور رات ہوگئی اور آپ یقین فرمائیں کہ وہ بچے جو شب عاشور ساری رات روتے رہے۔ آج نہیں روتے، ایک بچہ نہیں روتا۔ سب ماؤں کی گود میں چپ یا دن کے حادثہ سے سہم گئے۔ اتنے ڈر گئے بچے کہ سہمے ہوئے تھے۔ یا اس لیے نہیں روتے تھے کہ ہم رو کے کیا کر سکتے ہیں۔ کون مدد کو آئے گا؟ کسے پکاریں ہم۔ سب بچے سہمے ہوئے تھے۔ بالکل سہمے ہوئے ہیں۔ اب ٹیلوں کی آڑ میں جو مستورات بیٹھی ہیں۔ چار کسی ٹیلے کی آڑ میں، دس کسی ٹیلے کی آڑ میں۔ جہاں جہاں کسی کو جگہ ملتی گئی وہ بیٹھتی گئی۔

سن رہے ہو نا بھئی!

اور اب رات ہوگئی تو امام زمانہؑ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ حضرت امام زین العابدینؑ ایک ایک ٹیلے کے قریب گئے جہاں وہ خواتین بیٹھی تھیں۔ پوچھا جا کے کہ کون ہے؟ کہا فلاں صحابی کی بیوہ ہے۔ فلاں شہید ہونے والی کی بہن ہے۔ فلاں شہید ہونے والے کی ماں ہے۔ اس کے قریب کھڑے ہو کر کہتے ہیں بہن تیرے مرنے والے کا بڑا افسوس ہے۔ میں تیرا احسان مند ہوں۔ میں تیرا شکر گذار ہوں اور جب ایک بی بی کو امامؑ نے پرسہ دے دیا تو یہ سب اکٹھی ہوگئیں امام کے دربار میں اور سب نے بیک وقت، بیک زبان ہو کر کہا: اس کو ''بین'' کہتے ہیں۔ جو مل کر گریہ کیا جائے۔ تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ یا زین العابدینؑ تیرے بھرے گھر کے اُجڑ جانے کا بڑا افسوس ہے۔ تو آپؑ نے دعا مانگی۔ ان سب کا شکریہ ادا کیا اور سجدے میں سر رکھ دیا اور سبحان ربی الاعلیٰ کی آواز کربلا کی فضا میں گونجی اور صبح تک گونجتی رہی۔ جب صبح صادق طلوع ہوئی تو فوجِ یزید خود اس بات کی گواہ ہے کہ ہم سب نے اپنے کان سے سنا کہ کوئی غیبی آواز آ رہی تھی:

اِرفَع رَأسَکَ اَنتَ سَیِّدُ السَّاجِدِیْنَ

''اس عالم میں سجدہ کرنے والے تو سارے سجدہ کرنے والوں کا بادشاہ ہے۔''

بس اب تو سر اُٹھالے۔ سمجھے! اور یہ بات اور آپ کو بتاتا چلوں کہ رات کے دس بجے جب پرسہ داری ہو چکی۔ بچے سہمے ہوئے بیٹھے تھے، امام نے فرمایا: اماں! اب ان بچوں کے لیے خوراک کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔ کوئی کھانے پینے کی چیز۔

سمجھے۔ حضور!

حضورؑ نے کہا: بی بی نے دیکھا۔ اپنے ہی جلے ہوئے خیموں میں مشک بچ گئی۔ بی بی خود وہ مشک لے کر فرات پر گئیں اور وہیں سے وہ مشک بھر کے لائیں اور جب مشک لا رہی تھیں بھر کے تو کہہ رہی تھیں۔ عباس یہ نہ کہنا کہ تم سب نے جو مل کر کام کیے ہیں وہ سب میں کر رہی ہوں۔ میں اب پانی لے جا رہی ہوں۔ ان ننھے بچوں کے لیے لے کے آئیں۔ ان بچوں نے پانی پیا۔ اُس وقت سے امام زین العابدینؑ کی زندگی اور زینبؑ کی زندگی شروع ہو گئی۔ ان دونوں کا تذکرہ جب تک ساتھ ساتھ نہ ہو۔ تب تک ذکر مکمل ہوتا ہی نہیں۔

ان شاء اللہ العزیز، بشرط حریت بشرط زندگی اگر میں زندہ رہا تو آپ کو ان دونوں کا مفصل ذکر سناؤں گا اور اس تذکرے کا انعام میں نے انہی سے لینا ہے اور آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ میری ان سے سفارش کر دیں۔ آپ سادات ہیں۔ مؤمنین ہیں۔ مولانا زین العابدینؑ چالیس سال ہو گئے تیرے دروازے پہ صدا لگاتے ہوئے کوئی اور دروازہ نہیں دیکھا۔ تیرے دروازہ کے بغیر۔ دنیا تو گذر گئی ہے اور گذر جائے گی عاقبت میں تو ہی سہارا ہے اور انجام تمہارے ہاتھ ہے۔ یہ تم دونوں پھوپھی بھتیجے کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے پنجاب، بلکہ مغربی پاکستان کے گاؤں گاؤں میں زینب سلام اللہ علیہا کا ذکر پہنچا دیا ہے۔ لوگ زینب سلام اللہ علیہا سے آشنا نہیں تھے۔ لوگوں کو زینب سلام اللہ علیہا کا پتہ نہیں تھا۔ آج لوگوں کو پتہ چل گیا کہ زینب سلام اللہ علیہا کے ذکر کے بغیر یہ ذکر نامکمل ہے۔ باقی ان شاء اللہ کل۔ بشرطِ زندگی۔ آج اتنی ہی بات۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے! تمہیں اس ذکر کی برکات سے نوازے۔

بحق محمدؐ و آل محمدؐ۔ آمین

خطیب آل محمدؐ کی ایک یادگار تحریر ''محسن نقوی نے کہا'' کے لیے

محسن بیٹے! تم زندہ رہو

خطیبِ آل محمد الحاج سید اظہر حسن زیدی صاحب قبلہ!

انسان کے اخلاق نے اپنی بے پناہ قوت و طاقت انتہائی حسین انداز میں مجتمع کر کے کائنات میں اظہار فرمایا ہے۔ اُس مظہر طاقت الٰہی کا نام انسان ہے۔ انسان خدائی طاقتوں کا حسین پیکر، بے مثل مظہر، لازوال نمونہ، اور خدا کی خلقت و خالقیت کی سب سے عظیم دلیل ہے۔ انسان کے اندر انسان کے خالق نے ایسی طاقتیں ودیعت فرما دی ہیں، جن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نہ فرشتوں کی مجال ہے، نہ کسی اور مخلوق کی طاقت ہے۔ انسان کے چشم و ابرو کے اشارے سے تمام کائنات تابع فرمان ہو کر لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔ انسان میں اس طاقت کو اللہ نے پوری حکمت کے ساتھ ودیعت فرمایا ہے۔ اسے انسانی ''ذہن'' کہتے ہیں۔ اسی کا دوسرا نام ''عقل'' بھی ہے۔

مگر اس کا حسین نام انسانی ذہن ہے۔ انسانی ذہن وہ اللہ کا عطیہ اور نعمت ہے کہ اس سے بڑھ کر اور اس سے اعلیٰ عطیہ خزانۂ قدرت میں بھی موجود نہیں ہے۔ اللہ کے بے پناہ خزانے میں بھی سب سے قیمتی ہیرا اگر کوئی ہے تو وہ انسانی ''ذہن'' ہے۔ اللہ نے اپنی پوری فیاضی سے انسان کو اعلیٰ ذہنیت کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ اسی اعلیٰ ذہنیت کے مراکز انبیاء و اولیاء کہلائے۔ اسی اعلیٰ ذہنیت کے مراکز مومنین و متقین و صالحین کہلائے۔

انسانی زبان انسان کے ذہنی خیالات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر یہ زبان عقل کی قیادت میں انسانی ذہن کے خیالات کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر پیش کرتی رہے

تو یہی زبان حکمت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ یہی زبان سرمایۂ عقل وخرد بن جاتی ہے۔ انسانی ذہن میں جو خیالات اور انسانی ذہن میں جو ارتقائی منازل پیدا ہوتی ہیں، ان کے اظہار کا بہترین ذریعہ خواہ وہ زبان سے ہو یا اشارات سے ہو، اگر انتہائی الفاظ میں اس کو ادا کیا گیا، سامعین کے دل ودماغ میں بات اُتر گئی، سننے والوں کو لطف آ گیا، کائنات کے اندر ابرِ رحمت بن کر چھا گیا۔ ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکا بیٹھی، اس طریقۂ اظہار کو فن خطابت میں، فن تقریر میں، فن نطق میں ''شاعری'' کہتے ہیں۔

شاعری ''تک بندی'' کا نام نہیں۔ شاعری ''قافیہ بندی'' کا نام نہیں۔ شاعری کے اصلی معنیٰ ہیں، انسانی جذبات کی گہرائیوں کو اس خوبصورتی کے ساتھ ادا کر دینا کہ سننے والوں کے دل میں اُتر جائے، اور اس انداز سے پیش کرنا کہ ہر شخص یہ سمجھے کہ یہ میرے دل کی بات ہو رہی ہے، اس چیز کا نام شاعری ہے۔ الفاظ اتنے حسین ہوں کہ اُس سے زیادہ حسن تلاش کرنے سے بھی نہ مل سکے۔ معنی میں اتنی گہرائی اور لطافت ہو کہ کوثر سے زیادہ پاک، سمندروں سے زیادہ گہرے اور عرش سے زیادہ عظیم معنیٰ اُن الفاظ کے اندر چھپے ہوئے ہوں۔

یہ شاعری یعنی انسانی ذہن کے خیالات اعلیٰ کا اظہار نہ سیکھنے سے آتا ہے نہ پڑھنے سے آتا ہے، یہ خدا کی طرف سے عطیہ ہے، جسے بخش دے تو جس دل کو اللہ دیکھتا ہے کہ اس میں صفائی ونورانیت اتنی ہے کہ وہ شاعری کے پیکر لطیف کو اپنے چوکھٹے میں سجا سکتا ہے، یقیناً اللہ اُسے شاعری کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ شاعری کی نعمت سے بہرہ ور کرتا ہے۔ شاعری اسے عطا کرتا ہے۔ ایک ایک شعر اگر شاعرانہ زبان میں ہو، تو اتنے معانی و مطالب ادا کر دیتا ہے کہ سینکڑوں کتابیں بھی ان مضامین کو ادا نہیں کر سکتیں، جو ایک شعر ادا کر دیتا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں ایسے بہت سے اشعار ہیں۔ ایک ایک شعر نے انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اور بات کہیں سے کہیں پہنچا دی۔ اگر میں ان سب کو جمع کر دوں تو بذاتِ خود ایک ضخیم کتاب ہو جائے۔ مختصر یہ کہ کسی بات کو نہایت ہی لطیف قرینے سے ادا

کرنا اس کے لیے خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی میرے پاس نہیں کہ اس قر
تعریف کرسکوں جسے شاعری کہتے ہیں۔ یہ چیز جسے مل جائے یہ اللہ کا عطیہ ہے، ا
انعام ہے۔

میں نے اپنی زندگی اکثر اربابِ علم وہنر اور اربابِ فکر وشعر کے جھرمٹ
گزاری ہے۔ بہت سے شاعروں سے واسطہ پڑا اور پڑ رہا ہے۔ بہت سے شعرائے
کے کلام کو سنا، پڑھا اور دیکھا ہے۔ جس طرح شعر کہنا کمالِ فکر کا دوسرا نام ہے، اسی
شعر کا سمجھنا بھی کمالِ ذہن کے زمرے میں آتا ہے۔ انسان کے ذہن کا امتحان دو
سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کیا کہا، اور کس طرح کہا؟ اور دوسرے یہ کہ اس نے کیا سمجھ
کس طرح سمجھا؟ شعر کہنا بھی کمال ہے اور اسے سمجھنا بھی کمال ہے۔ مجھے ان د
چیزوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ میں نے اعلیٰ سے اعلیٰ اشعار سنے بھی ہیں اور انہیں
بھی کوشش کی ہے۔ میں نے اساتذہ فن کا کلام اکثر پڑھا اور دیکھا ہے۔ میں کسی کے
بے سوچے سمجھے کبھی رائے قائم نہیں کرتا، بلکہ خوب جانچ پرکھ کر، دیکھ کر اور آزما کر ف
الفاظ میں رائے قائم کرتا ہوں کہ اس کے کلام میں کتنی لطافت، کتنی پاکیزگی، کتنی
کتنی رفعت ہے اور ابھی اسے کتنا میدان چاہیے، تاکہ اس کی طبیعت اپنی پوری جولا
ساتھ اپنے اندر چھپے ہوئے کمال کو ظاہر کرسکے۔

اسی نقطۂ نظر سے آج اس میں اس عالم میں جبکہ میں وہ زیدی نہیں ہوں ج
کبھی دنیا کے سامنے تھا۔ اب میں اپنے شکستہ دل ودماغ اور اُکھڑے ہوئے سا
ساتھ یہ کہنے کی جرأت کررہا ہوں کہ اس زمانے میں جو چند عظیم شاعر ہیں میں ان
نہیں کرتا۔ وہ اپنی عظمت وعزت کی اس منزل پر قائم ہیں کہ وہاں تک پہنچنا ہر ایک
نہیں۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ ان

عظیم شاعروں کے درمیان میں ایک نوجوان شاعر اس طرح شامل ہو
طرح آ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کمالات کی انگوٹھی میں ایک خوبصورت نگینہ جڑا

معلوم ہوتا ہے کہ آویزۂ گوشِ کمال میں ایک بہترین گشوارہ شامل ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گلِ سرسبز بن کے ایک نوجوان پھول اس گلزار میں داخل ہو گیا اور اس نوجوان کا نام ''محسن نقوی سلمہٗ'' ہے۔ میں ذاتی طور پر محسن نقوی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب اس نے دنیا میں پہلا قدم رکھا اور وہ پیدا ہوا۔ اس کے والد محترم کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات اور مراسم تھے۔ اس کا والد ڈیرہ غازی خان کی محفل کا ''چراغ'' تھا۔ ڈیرہ غازی خان کی عزت تھا اور ڈیرہ غازی خان کی آبرو تھا۔ اس شگفتہ مزاج اور شگفتہ خاندان میں جہاں ہمیشہ شگفتہ مزاج لوگ پیدا ہوئے۔ اس آب و ہوا میں اچھے اور فاضل دماغوں نے پرورش پائی وہاں ''چراغ'' کے گھر ایک ''شمع'' روشن ہوئی، قدرت نے حسنِ بیان، حسنِ لطافت، حسنِ صورت، حسنِ سیرت سب کو ایک جگہ سمو کر الہامی طور پر ''محسن'' نام رکھ دیا اور خانوادہ علم و فضل جس گھر سے علم کی تربیت ہوتی ہے، جس گھر سے علم پیدا ہوا، جس گھر سے علم تقسیم ہوتا ہے اس کی نسبت نے ''محسن'' کو ''محسن نقوی'' بنا دیا۔ میں بچپن سے اسے جانتا تھا۔ بچپن میں اس کی ادائیں بتاتی تھیں کہ یہ بچہ کچھ بنے گا۔ اس کی بچپن کی گفتگو میں نہایت حسین معصومانہ لطافت تھی۔ بچپن میں اس کے تیور بتاتے تھے کہ یہ بچہ کسی دن قیامت ہوگا۔

رفتہ رفتہ میں نے دیکھا کہ اس بچے نے اپنے انتہائی ترقی یافتہ ذہن کے افکار کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ شروع شروع میں میں نے اس کے چند شعر سنے میں سمجھا یونہی مشغلہ ہے مگر جس میں ذرا اور قریب بیٹھا کر اس کی باتیں سنیں اور اس کے دل و دماغ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان بہترین گلدستوں کو دیکھا، جو اس نے تیار کیے تھے تو سچ تو یہ ہے کہ باوجود تجربہ کارانہ زندگی کے ایک دفعہ تو میں بھی حیرت میں آ گیا۔ میرا دماغ

بھی چکرا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس نوجوان کے دل و دماغ میں اتنی بلندی، اتنی رفعت، اتنا ارتقاء کس نے پیدا کیا۔ آج سے پندرہ سال پہلے کا اس کا سنا ہوا

شعر میرے دل و دماغ میں گونج رہا ہے اور اُس کے معنی لکھنے کے لیے سینکڑوں صفحے اور کتابیں درکار ہیں۔ اور وہ شعر اس طرح ہے: ؎

ہزار تہمتیں دنیا نے بخش دیں مجھ کو
میں آدمی تھا مگر چپ رہا خدا کی طرح

سبحان اللہ! فلسفۂ قضا و قدر، فلسفۂ خیر و شر ان تمام چیزوں کو اس شعر میں اس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کہ اس سے بہتر میرے دل و دماغ میں دوسری بات نہیں۔ یہ ''محسن نقوی'' کی شاعری اس کی گفتگو کا کمال ہے۔ اب تو میں شوق سے اور بڑے ذوق کے ساتھ اس کے فرمودات کو دیکھنے لگا، کہ اب کیا کہتا ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ اس نے فن شاعری میں اور خصوصیت کے ساتھ مدح اہل بیتؑ کی شاعری میں وہ پھول کھلائے ہیں، کہ آج آسمان و زمین سے سوائے ''زندہ باد'' کے کوئی آواز نہیں آتی۔ وہ مداحی اہل بیتؑ میں طائر سدرہ کا انیسؒ ہے۔ اس کا کلام موجۂ الہام کی طرح مدح اہل بیتؑ میں نفیس ہے: وہ مداحی محمدؐ و آل محمدؐ لکھنے میں دبیر فلک کا ہم عصر ہے۔ اس کے کلام میں وہ اوج ہے، وہ عروج ہے کہ شاید کسی کو حاصل نہ ہو سکے۔ اس کے کلام میں سخنوری کے اعلیٰ معیارات موجود ہیں۔ اس میں ''ملیح'' اور ''نمکین'' جوش'' بھی ہے۔ اس میں نہایت خوبصورت ہوش بھی ہے، اس میں الفاظ کی نزاکت بھی ہے، اس میں معنی کی ترادیت بھی ہے، اس میں مضامین کی لطافت بھی ہے۔ غرض کوئی شے ایسی نہیں جو اس کے کلام میں موجود نہ ہو۔

شاعری جس چیز کا نام ہے اور جن اصناف سے شاعری مرتب ہوتی ہے، ان سب کو اگر ایک جگہ اکٹھا کر لیا جائے، تو اس کے معنی کلام ''محسن'' بنتے ہیں۔ شاعری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ نظم ہی ہو، نثر میں بھی شاعری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خدا نے ''محسن نقوی'' کو ایسا عالی دماغ دیا ہے کہ وہ نثر کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں بھی اعلیٰ شاعری کو سمو دیتا ہے۔ ایک ایک فقرے میں ایسی ایسی باتیں کہہ دیتا ہے کہ بڑے بڑے لیکچر اور بڑی بڑی تقریریں اسے ادا نہیں کر سکتیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے جملے، اس کے مختصر مختصر الفاظ،

اس کے چھوٹے چھوٹے اشعار، اس کی رباعیات، اس کے قصیدے، اس کی نظمیں، اس کی نثریں، اس کی گفتگو غرض ہر شے انسانی ناطقے کا کمال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نوجوان ترقی کی ان منازل کو طے کر رہا ہے کہ اگر یہی عالم رہا تو چند دن کے بعد دنیا دیکھے گی کہ بے مثل و بے نظیر شخصیت شاعری ہی میں نہیں، حکمت و بلاغت میں، فلسفۂ انسانیت میں بھی، انسانی درس و تدریس کے بہترین مشغلے میں بھی، آفتاب عالمتاب بن کر چمکے گا۔ اور دنیا اس سے فیض حاصل کرے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں، وہ ہوا بن کے ہوا میں اُڑ جاتے ہیں۔ کسی کو یاد ہی نہیں رہتا کہ کسی نے کیا کہا تھا۔ میں ہی ایک آپ کے سامنے مثال بیٹھا ہوں۔ میں نے پچاس سال تک اللہ جانے کیا کہا اور وہ سب ہوا میں ختم ہو گیا۔ کسی کو یاد بھی نہیں کہ میں نے کیا کہا۔ بڑے ہی خوش ذوق، خش مزاج وہ خوش فہم ہیں وہ لوگ جو کسی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو خواہ وہ نظم ہوں یا نثر ایک جگہ اکٹھا کریں۔ ایک جگہ جمع کریں تا کہ تمام دنیائے انسانیت اس کو پڑھ کر لطف اندوز ہو۔ آئندہ نسلیں اس سے محفوظ ہوں۔ صاحبِ کلام کا کمال دنیا پہ ظاہر ہو اور دنیا اُس کے کلام کو دیکھ لے، سمجھ لے کہ واقعی اس کلام میں کسی کو کلام نہیں۔ سب چیزیں حُسنِ خوبی کے ساتھ ترتیب دے کر دنیا کے سامنے پیش کرنا یہ بھی ایک خوبی و کمال ہے۔ ان شاء اللہ العزیز جب ''محسن نقوی'' کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ دنیا کے سامنے آئیں گے اور میری صحت اجازت دے گی تو میں اس پر ایک مفصل تقریر و تبصرہ لکھوں گا۔ یہ تو ایک گفتگو ہے جو میں نے شقشقیہ کے طور پر کر دی ہے جو میرے دل و دماغ کے اطراف میں ہے وہ میں نے کہہ دی۔

اللہ کرے زورِ سخن اور زیادہ

آخر میں ادارہ ''القائم'' رجسٹرڈ کو اس کی اس عظیم پیشکش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

خاکپائے مومنین

سید اظہر حسن زیدی

۱۳ مئی ۱۹۸۱ء۔ ۱۰ فلیمنگ روڈ لاہور